www.ahlehaq.org
دعوت وعزیمت
حصہ پنجم
تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
احیاء دین، اشاعتِ کتاب وسنت، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح و
تنقیح، تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص
کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد جن کا آغاز حکیم الاسلام
حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفاء کے ذریعہ ہوا۔
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

تاریخ دعوت وعزیمت

حصّہ پنجم

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ

احیاء دین، اشاعتِ کتاب وسنت، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح و تنقیح، تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملّت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی اُن عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفاء کے ذریعہ ہوا،

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام
۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸

مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس علمیہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ———— تاریخ دعوت وعزیمت (حصۂ پنجم)
تصنیف ———— مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ———— احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ———— ۴۸۴ صفحات
ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

اردو ——————— لکھنؤ و کراچی

عربی بنام " رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام " الجزء الرابع

انگریزی بنام "SAVIOURS OF ISLAMIC SPIRIT VOL. IV"

فہرست عناوین

"تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم"

باب ششم — حدیث وسنت کی اشاعت وترویج اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت دہی ۱۶۹ — ۲۱۴

باب ہفتم — شریعتِ اسلامی کی مربوط ومدلل ترجمانی اور اسرار ومقاصدِ حدیث کی نقاب کشائی "حجۃ اللہ البالغہ" کے آئینہ میں ۲۱۵ — ۲۴۸

بابِ ہشتم ۸

نظامِ خلافت کی ضرورت و افادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت اور ان کے احسانات کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے آئینہ میں ۲۴۹ — ۲۷۴

بابِ نہم ۹

سیاسی انتشار اور حکومتِ مغلیہ کے دورِ احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار ۲۷۵ — ۳۲۲

بابِ دہم ۱۰

امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب

۳۲۳ — ۳۴۲

باب یازدہم ۱۱

فرزندان گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، نامور معاصر ۳۴۳ - ۳۹۷

باب دوازدہم ۱۲

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات

۳۹۸ - ۴۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین
وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان
ودعا بدعوتھم الی یوم الدین

مصنف کتاب کا قلب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے پانچویں حصہ کی تسوید سے فارغ ہو کر پیش لفظ کی ان سطور کے لکھتے وقت جذبۂ حمد وشکر سے معمور اور اس کا قلم اپنے اور کاتب کے خالق کے حضور میں سربسجود ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو اس حصہ تک جو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفاء کی دینی وعلمی خدمات اور ان کے مجددانہ ومجاہدانہ کارناموں کی تاریخ وروئیداد سے مخصوص ہے، پہونچانے کی توفیق عطا فرمائی۔

محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں چند تقریروں کی ایک مختصر یادداشت کو سامنے رکھ کر جب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلہ کا آغاز کیا گیا تھا، اور اس کو سیدنا امام حسن بصریؒ اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے شروع کیا گیا تھا، تو اس وقت اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ سلسلہ پہلی دوسری صدی کے مصلحین ومجددین سے لے کر تمام درمیانی مراحل اور عالم اسلام کی زمانی ومکانی وسعت ورقبہ کو طے کرتا ہوا گیارہویں وبارہویں صدی

کی دو عظیم تجدیدی شخصیتوں حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہونچ سکے گا، عمر کی بے ثباتی، صحت کے نشیب و فراز، حوادث کی کثرت، مشاغل کے ہجوم، عزم و ہمت کی کوتاہی، اسفار کے تسلسل، نئی نئی ضرورتوں اور محرکات کے پیش آنے پھر نگاہ کی اس کمزوری اور معذوری کے باوجود (کہ مصنّف مسلسل چودہ ۱۴ سال تک براہ راست مطالعہ اور خود لکھنے سے معذور رہا) یہ سلسلہ اس منزل تک پہونچے گا، یہ محض قدرت و توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے، جس پر مصنف خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے، مصنف اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعہ یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کرے:۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ	اے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ
الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ	جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ	پر کئے ہیں ان کا شکر کروں، اور ایسے
وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ	نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش
الصّٰلِحِیْنَ ۝	ہو جائے، اور مجھے اپنی رحمت سے
(النمل - ۱۹)	اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

نیز حدیث کے یہ الفاظ دہرائے:۔

الحمد لله الذی بعزّته وجلاله	اس خدا کا شکر ہے جس کی عزت و جلال
تتمّ الصّالحات.	سے نیک کاموں کی توفیق و تکمیل ہوتی ہے۔

اس جلد پر حقیقتاً صالحین کے تذکرہ کے اس سلسلہ کا اور اس حیثیت سے اس عمل صالح کا اتمام ہوتا ہے کہ یہ حصہ بارہویں صدی ہجری کی ان اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور کارناموں پر مشتمل ہے، جن کے مبارک اثرات ابھی تک باقی ہیں، اور کم سے کم برّصغیر ہند کے

دینی ادارے، علوم دینیہ کے مراکز، اسلام کی سربلندی کی کوششیں اور تحریکات، اور دینی، علمی و تصنیفی سرگرمیاں، ان مساعی کے نتائج سے ابھی تک متمتع ہو رہی ہیں، اوران کے سایہ میں اپنا سفر طے کر رہی ہیں، اوراس لئے بھی یہ بات خلافِ واقعہ نہیں ہے کہ مصنفِ "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) کی تالیف کے ذریعہ جو ۱۹۳۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس سلسلہ کو تیرہویں صدی کے آخر تک (اورجہاں تک اس تحتی برّاعظم کا تعلق ہے) چودھویں صدی کی کئی دینی شخصیتوں اورداعیوں (جن میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں) کی سوانح مرتب کرکے اس سلسلہ کو اپنے زمانہ تک پہونچا چکا ہے، اس طرح درحقیقت "تاریخ دعوت وعزیمت" کا چھٹا حصہ بھی اورساتویں حصہ کا بڑا حصہ بھی مرتب ہو چکا ہے، اب یہ اس کے بعد کے مصنفین اور تحقیقی کام کرنے والوں کا کام ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے عالم اسلام کے علمبرداران اصلاح ودعوت اوردینی قائدین کی خدمات اورکارناموں پر روشنی ڈالیں، جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئے، اورانھوں نے دعوت واصلاح اورجہاد فی سبیل اللہ کا کام انجام دیا، پھر چودھویں صدی ہجری کی (عالم اسلام کے پیمانہ اورسطح پر) اصلاحی علمی وفکری اوردعوتی کوششوں کا جائزہ لیں، اوراس کی روئیداد مرتب کریں کہ "تاریخ دعوت وعزیمت" کا موضوع کسی خاص عہد اورملک سے مخصوص نہیں، اس کا سلسلہ دعوتی واصلاحی کوششوں، فکر اسلامی کی تجدید، علوم دینیہ کے احیاء واشاعت، اپنے اپنے زمانہ کے مغالطوں اورتحریفات کا پردہ چاک کرنے اوردین کی حقیقت، روح اورجوہر کو بے نقاب کرنے، اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں اورضلالتوں کے مقابلہ اوران کے ازالہ کی کوششوں کے ساتھ اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک یہ دین

باقی ہے، اور یہ دنیا قائم ہے، اس لئے کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے اس موضوع کا حق ادا کردیا، اور اس سلسلہ کو اختتام تک پہونچا دیا کہ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

يحمل هذا العلم من كل خلف	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل
عدولہ ينفون عنه تحريف	ومتّقی حامل ووارث ہوں گے، جو
الغالين، وانتحال المبطلين،	اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف
وتأويل الجاهلين[1]۔	اہل باطل کے غلط انتساب و دعوے،
	اور جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو
	دور کرتے رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اصلاح وتجدید کا دائرہ چونکہ اپنے اندر بڑی وسعت اور تنوّع رکھتا تھا، اور اس میں علمی وفکری رنگ غالب تھا، اس کے حدود میں تدریس وتصنیف، اشاعتِ کتاب وسنت، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاهب الفقهية، اسرار ومقاصدِ شریعت کی توضیح، آنے والے عقلی دور کی رعایت، تربیت وارشاد، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت، سیاسی تبدیلیوں اور ابھرتی ہوئی طاقتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور ان میں ملت کے تحفّظ اور تشخّص کے بقا کی ممکنہ تدبیریں، علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ فکر ونظر اور اس کی طبقۂ علماء کی طرف منتقلی کی کوششیں، سب شامل تھیں، اس لئے مصنف کو اس میں اس مطالعہ وفکر ونظر کی ضرورت پیش آئی جو کم حصوں میں پیش آئی تھی، اسی کے ساتھ دوسری مصروفیتیں اور

---

[1] مشکوٰۃ شریف۔

ذمہ داریاں بھی عناں گیر رہیں، پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اس حصہ کی تکمیل میں وہ طویل وقفہ نہیں ہوا، جو اس سے پہلے دو حصوں کے درمیان عموماً پیش آتا تھا۔

مصنف اپنے اُن عزیز رفقائے کار و معاونین کا شکر گذار ہے، جنھوں نے مآخذ کی فراہمی، بعض طویل فارسی و عربی عبارتوں کے ترجمہ اور کتاب کی تسوید و تبییض اور نظر ثانی میں مدد کی، نیز مطبوعہ اور قلمی کتابوں اور ان کے اڈیشنوں کی تحقیق میں ان کی محنت اور کوشش شامل ہے، ان میں مولوی شمس تبریز خاں رفیق "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی عتیق احمد صاحب مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء، اور مولوی محمد ہارون صاحب سلمہٗ انچارج شعبۂ مخطوطات کتب خانہ ندوۃ العلماء، اور عزیزی مولوی نثار الحق ندوی خاص طور پر قابل ذکر و شکر ہیں، عزیز گرامی مولوی نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات و اخلاف کے سلسلہ میں بعض قیمتی معلومات فراہم کیں، اور بعض مآخذ کی نشاندہی کی، عزیزان مولوی غفران ندوی و مولوی غیاث الدین ندوی نے حسب سابق کتابت و طباعت کی تکمیل اور انڈکس کی تیاری میں پوری ذمہ داری اور انہماک کے ساتھ حصہ لیا، فجزاھم اللہ خیرًا۔

آخر میں مصنف کی یہ دعا اور تمنا ہے کہ یہ حصہ کسی درجہ میں بھی (یہ تو کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی کہ اس بلند و بالا شخصیت کے شایان شان ہو جس سے اس کا تعلق ہے) موضوع و مقصد کے لحاظ سے مفید، ہمت آفریں، فکر انگیز، مزید مطالعہ اور تحقیق کے لئے محرک اور سعی و جہد کے لئے شوق انگیز ہو کہ اس دورِ انقلاب اور اس عہد پُرفتن میں

اس سے خاص طور پر رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز

ابوالحسن علی ندوی

۹۔ بے نظیر بلڈنگ، بائی کلہ، بمبئی

۱۲ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۴ھ
۱۶ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء
دو شنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بابِ اوّل

عالمِ اسلام بارہویں صدی ہجری میں

بارہویں صدی کے اسلامی ممالک کے حالات اور انقلابات کے مطالعہ کی اہمیت

"تاریخ دعوت و عزیمت" کی جلد چہارم کے آغاز میں (جو مجددِ الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ھ – ۱۰۳۴ھ) کی سوانح حیات ان کے عہد اور ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامہ کی شرح و تفصیل کے ساتھ مخصوص ہے) دسویں صدی ہجری کے (جس میں حضرت کی ولادت ہوئی اور آپ کا ذہنی و علمی نشوونما ہوا) تاریخی مطالعہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا:۔

"ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اور اس عہد کی دنیا، اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے، اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات، انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں، اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات، و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام اور خاص طور پر

گردوپیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے، لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں، ان کے جھونکے بُعدِ مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھنے اور اس اصول پر عمل کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ ان کی ذہنی و علمی تربیت میں حجاز مقدس کا بنیادی حصہ تھا، جہاں انھوں نے (۱۱۴۳ھ ۔ ۱۱۴۴ھ) ایک سال سے زیادہ[2] قیام فرمایا، اور اس وقت کے فن حدیث میں مرجع خلائق اور امام فن شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کُردی مدنی سے فن حدیث کی تکمیل کی، جن کے حلقۂ درس میں بلاد و امصار کے طالبین حدیث مجتمع تھے، اور علمائے حرمین سے (جو مختلف ممالکِ اسلامیہ اور عربیہ سے تعلق رکھتے تھے) ان کی طویل صحبتیں رہیں، اس وقت حجاز سلطنت عثمانیہ کی تولیت اور انتظام میں تھا، اور شرفائے مکہ سلاطین آل عثمان کے نائب کی حیثیت سے امارت کے منصب پر سرفراز تھے، حج کے علاوہ بھی (جو ہر سال عالم اسلام کے بہترین دل و دماغ اور شمع حرم کے پروانوں کو ایک جگہ جمع کر لیتا ہے) اس دور میں حرمین شریفین اور خاص طور پر مدینہ طیبہ علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا، جہاں اس علم کے شائقین دنیا کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا ہوتے تھے، وہاں بیٹھ کر پورے عالم اسلام کی روحانی، علمی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا جائزہ بآسانی لیا جا سکتا تھا، ان تمام حیثیتوں سے مختلف ممالکِ اسلامیہ و عربیہ کی ترقی و انحطاط اور عروج و زوال کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا، اور وہاں کی مختلف شخصیتوں، باکمال افراد، اصلاحی تحریکوں و دعوتوں اور

---

[1] "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۲۴ [2] شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حجاز پہونچے تھے، اور ۱۱۴۵ھ کے آغاز میں مراجعت فرمائی، شاہ صاحب نے دو حج کیے۔

انتشار انگیز کوششوں اور سازشوں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، بلکہ عالم اسلام کی نبضِ حیات کی رفتار اور قلبِ اسلام کی دھڑکنوں کو سُنا جا سکتا تھا، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سے بیدار مغز اور دردمند دل رکھنے والے انسان نے جس کو تدبیر الٰہی تجدید و احیائے دین کے کارِ عظیم کے لئے تیار کر رہی تھی، اس سے ضرور فائدہ اٹھایا اور اثر لیا ہوگا، اور انھوں نے اس سے اپنے فکر و نظر کی توسیع اور اپنی دعوت اور فلسفہ کی آفاقیت میں پورا کام لیا ہوگا۔

مزید برآں ہند ان صدیوں سے وسط ایشیا کی تورانی و افغانی نسل کے ترک تازوں کی جولان گاہ اور سیاسی و انتظامی حیثیت سے ان کے زیر اثر رہ چکا تھا اور وقتاً فوقتاً اسکے نظم و نسق کے ڈھانچہ اور اس کی حکومتوں کے اثر پذیر جسم میں وہیں سے تازہ اور گرم خون آتا اور اس کے رُو بزوال انتظامیہ اور فوجی طاقت میں نئی توانائی اور رعنائی پیدا کرتا تھا، اور جب ہندوستان میں مدت دراز سے حکومت کرنے والا خاندان "پیری و صد عیب" کی منزل پر پہونچ جاتا، تو درۂ خیبر یا درۂ بولان کے راستہ سے ایک تازہ دم عسکری طاقت ہندوستان میں قدم رکھتی، اور اس سلسلۂ حکومت میں، جس کا ایک ہی دین (اسلام) ایک ہی مذہب (اہلِ سنّت والجماعۃ) ایک ہی آئین (شرعِ محمدیؐ) ایک ہی زبان (ترکی و فارسی) اور ایک ہی تہذیب (عربی، ایرانی، ترکی، ہندوستانی اثرات کا آمیزہ) تھی، طاقت کا ایک انجکشن دیتی اور اس کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر دیتی۔

پھر اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بابر کے تسخیر ملک، اور سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد سے افغانستان اور اس کے اہم ترین صوبے کابل و قندھار عظیم ہندوستانی سلطان سلطنت کا ایک حصہ اور اس کا بیرونی قلعہ اور "بالا حصار" رہے ہیں، شاہ صاحب ہی کے عہد میں نادر شاہ ایران کی ہندوستان میں آمد اور دہلی پر حملہ ہوا، اور آپ ہی کے عہد میں والئ قندھار احمد شاہ ابدالی نے کئی بار ہندوستان کا رخ کیا، اور بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں پانی پت کے

میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر واقعات کا دھارا اور تاریخ کا رُخ بدل دیا، اور سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے، اور ہندوستان کے مسلم معاشرہ اور طبقۂ امراء کو نیا کردار ادا کرنے کا موقعہ دیا جس کو وہ اپنی نااہلی سے ادا نہیں کر سکے، یہ سب واقعات نہ صرف شاہ صاحب کے عہد کے ہیں، بلکہ آخر الذکر واقعہ میں ان کی رہنمائی شامل ہے[1] یہ دونوں حملہ آور ایران و افغانستان سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے شاہ صاحب کے عہد اور بارہویں صدی کے جائزہ میں ان دونوں کے حالات اور انقلابات سلطنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان پر ایران کے ثقافتی و تہذیبی اثرات

پھر جس طرح ہندوستان پانچویں صدی ہجری سے سیاسی اور فوجی حیثیت سے ترکستان و افغانستان کے زیر اثر رہا ہے، اسی طرح وہ علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری حیثیت سے کم و بیش ایران کے زیر اثر رہا ہے، وہاں کا ادب و شاعری، تصوف کے سلاسل و طرق، اور آخر میں وہاں کا نصاب درس اور طریقۂ تعلیم، اور وہاں کے علماء اور اساتذۂ فن کی تصنیفات ہندوستان کے ذہن و دماغ پر سایہ فگن رہی ہیں، بالخصوص ہمایوں کے ایران جانے اور وہاں کی مدد سے سلطنتِ ہندوستان کے دوبارہ حصول کے بعد سے، پھر دور اکبری میں امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی کی آمد کے بعد سے ہندوستان اپنے نصاب، طریقۂ تعلیم، معیارِ فضیلت کے تعیّن اور "معقولات و علوم حکمت" کے میدان میں ایران کا کُلّیۃً خوشہ چیں بلکہ باج گذار اور غاشیہ بردار بن گیا، اور اس سلسلہ میں حقیقتاً ایران کا ہندوستان پر "اقتدار اعلیٰ" قائم ہو گیا، اس حقیقت کے پیش نظر ہم اس تاریخی جائزہ میں ایران اور اس میں پیش آنے والے واقعات سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔

---

[1] اس کی تفصیل بعد کے ابواب میں آئیگی۔

سلطنت عثمانیہ کی عظمت واہمیت

افغانستان وایران کے پڑوسی ملکوں کے ماسوا اہم اس سلطنت عثمانیہ سے بھی (جس نے دسویں صدی کے اوائل سے خلافت کا منصب سنبھال رکھا تھا) آنکھیں نہیں بند کرسکتے، جس کا مستقر اگرچہ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے بہت دور یورپ اور ایشیائے کوچک میں واقع تھا، لیکن تقریباً تمام عرب ممالک (مصر، شام، عراق، یمن، نجد وحجاز اور شمالی افریقہ کا ایک بڑا حصہ) اس کے ماتحت تھے، حرم ومقامات مقدسہ کے پاسبان ومتولی ہونے، خلافت اسلامی کے حامل وامین، ایک بڑی طاقت اور شہنشاہی کی حیثیت سے بھی اور مغرب اور مخالف اسلام طاقتوں کی نگاہ میں اسلامی طاقت کا نشان اور بہت سے اسلامی مفادات کا محافظ وپاسبان ہونے کی بناء پر بھی تمام دنیا کے مسلمان اس کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ اثر لیتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا عالمی ذہن رکھنے والا انسان جس کی تاریخ اسلام پر گہری نظر تھی، سلطنتِ عثمانیہ سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا تھا، وہ خلافت کی شرعی حیثیت اور سیاسی واجتماعی اہمیت کے رمز آشنا تھے، اور دین واخلاق اور صالح معاشرہ اور صحت مند تمدّن ومعیشت کے لئے آزاد حکومت وغیر فاسد سیاسی طاقت کو ضروری سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ بساط عالم پر ایک مؤثر اور صاحب امرونہی طاقت کے طور پر دیکھنے کے آرزومند تھے، وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت کے عروج وزوال اور اس کے داخلی سکون وانتشار کی طرف سے کیسے آنکھیں بند کرسکتے تھے، خصوصاً جبکہ وہ ایک سال سے زائد اس کے محبوب ترین اور معزز ترین دائرہ حکومت حجاز میں کھلی ہوئی آنکھوں، بیدار دماغ اور حسّاس دل کے ساتھ قیام کرچکے تھے، اور اس کے مقبوضات اور زیرانتظام ملکوں مصر وشام وعراق سے آنے والوں کی زبانی ان اثرات کا جائزہ لے چکے تھے، جو سلاطین آل عثمان، ان کے وزراء

شیوخ اسلام اور علمائے ترکی کے رجحانات و نفسیات کے نتیجہ میں ان ملکوں کے علمی و دینی حلقوں پر پڑ رہے تھے، اس لئے ہمیں بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں سلطنت عثمانیہ، اس کے اپنے پڑوس کے عیسائی مغربی ممالک سے تعلقات، شکست و ریخت، عزل و نصب، اور سیاسی طاقت کے مد و جزر پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

عالم اسلام کی سیاسی حالت

ہم پہلے اس وقت کے عالم اسلام کی سیاسی حالت، حکومتوں کے انقلابات اور اہم حوادث پر نظر ڈالیں گے، پھر عالم اسلام کا علمی، دینی، اخلاقی روحانی جائزہ لیں گے۔

سلطنت عثمانیہ بارہویں صدی میں

شاہ صاحبؒ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں انھوں نے وفات پائی، اس عرصہ (۶۲ سال) میں سلطنت عثمانیہ کے تخت پر پانچ سلاطین، مصطفےٰ ثانی (م ۱۱۱۵ھ) احمد ثالث (م ۱۱۴۳ھ) محمود اول (م ۱۱۶۷ھ) عثمان ثالث (م ۱۱۷۱ھ) اور مصطفےٰ ثالث (۱۱۷۱ھ ۱۷۵۷ء - ۱۱۸۷ھ ۱۷۷۴ء) آئے اور گئے۔

شاہ صاحبؒ کے زمانۂ شعور اور فکر و عمل میں احمد ثالث، محمود اول، عثمان ثالث اور مصطفےٰ ثالث نے عنان سلطنت و خلافت سنبھالی، لیکن اہم مدت (شاہ صاحبؒ کے آخری پانچ سال کا زمانہ) مصطفےٰ ثالث کے عہد میں گذری۔

مصطفےٰ ثالث نے سولہ برس آٹھ مہینے حکومت کی، ان کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑی، سلطنت عثمانیہ کو اس جنگ (۱۷۶۹ء) میں شکست ہوئی جس پر روس کا کوئی

کارنامہ نہ تھا، بعض حوادث اور انتظامات کی کمی کو دخل تھا۔[1] الفنسٹن روسی جنرل نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ کا ارادہ کیا، لیکن اس کو باز رکھا گیا، مصطفےٰ خاں نے فوج کی تقویت اور عسکری اصلاحات کی طرف بھی قدم اٹھایا اور کچھ فوجی کامیابیاں بھی حاصل کیں، روس نے صلح کے لئے کچھ شرطیں پیش کیں، جو توہین آمیز تھیں، بخارسٹ میں ۱۳ر شعبان ۱۱۸۶ھ (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے دس سال بعد) ۹ر نومبر ۱۷۷۲ء میں کانفرنس ہوئی جس میں کچھ شرطیں پیش کی گئیں، سلطنت عثمانیہ نے ان کو ٹھکرا دیا، اور ترکی افواج کو جنگ شروع کرنے کا حکم دیا، جنگ کے نتیجہ میں روس کو شکست فاش ہوئی، روسیوں کی مرعوبیت کا یہ حال تھا کہ عثمانی افواج جب بازارجق (اب جو TOBULKHIN کہلاتا ہے) سے گذریں تو شہر کی پوری آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی، مؤرخ ہمر (HEMER) لکھتا ہے کہ "عثمانیوں نے آگ پر چڑھی ہوئی ہانڈیاں پائیں جن میں گوشت تھا" ۸ر ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ (۲۱ر جنوری ۱۷۷۴ء) کو سلطان مصطفےٰ ثالث نے وفات پائی، مؤرخین اس کے عدل اور امور خیر کی خواہش و کوشش کی تعریف کرتے ہیں، اس نے اپنے زمانہ میں بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں۔[2]

شاہ صاحبؒ کا عہد شباب تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا، اور پہلا مطبعہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا، اسی عہد میں نجد و حجاز میں شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی تحریک نے فروغ پایا۔[3] عثمان ثالث کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الدولۃ العلیّۃ العثمانیۃ" از محمد فرید بک المحامی۔ طبع بیروت

[2] "تاریخ الدولۃ العلیّۃ العثمانیۃ" ص ۳۳۹-۳۴۰

[3] بعد میں سعود بن عبدالعزیز (۱۱۶۳ھ - ۱۲۲۹ھ) امیر نجد نے اسی دعوت، مجاہدانہ جوش اور فوجی تنظیم کی طاقت سے ۱۲۱۸ھ میں حجاز اور جزیرۃ العرب کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ۱۲۳۴ھ میں خدیو محمد علی والی مصر کی کوشش سے اس حصہ پر دوبارہ ترکی سلطنت کا مکمل قبضہ ہوا، نجدی امیر عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے، جہاں وہ قتل کر دیئے گئے۔

زمانہ میں علی بے (الملقّب بہ شیخ البلد) مصر کی حکومت وانتظامات پر پورے طور پر حاوی ہو گئے، انھوں نے روسی جنرل کے ساتھ جو بحرِ روم پر متعین تھا، سازش کر لی اور شرط کی کہ وہ ذخائر اور اسلحہ سے ان کی مدد کرے گا، تاکہ مصر خود مختار ہو جائے، اس کی مدد سے علی بے غزّہ، نابلس، قدس، یافہ اور دمشق پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا، وہ اناطولیہ کے حدود کی طرف رخ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ مملوک سرداروں میں سے ایک سردار محمد بے مشہور بأبی الذہب نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، جس کی وجہ سے علی بے کو مصر واپس آنا پڑا، اور اس نے شکست کھائی، اس اندرونی جنگ اور انتشار کے نتیجہ میں بیروت پر روسی جہازوں نے آتش باری کی جس سے تین سو کے قریب مکانات برباد ہو گئے، مصر میں محرم ۱۱۸۶ھ میں علی بے اور محمد بے کی فوجوں کا مقابلہ ہوا، ابوالذہب کامیاب ہوا، اور علی بے گرفتار ہوا، اور زخمی حالت میں اس نے انتقال کیا، اس کا سر کاٹ کر چار روسی افسروں کے ساتھ عثمانی گورنر خلیل پاشا کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے ان کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا، اور مصر دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے کلّی قبضہ میں آگیا۔

حجاز کی صورت حال

شاہ صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا، اور حرمین شریفین میں طویل قیام فرمایا، تو اس وقت سلطان محمود اول (۱۱۴۳ھ ۔ ۱۱۶۷ھ) کی سلطنت وخلافت کا زمانہ تھا، اس وقت حجاز میں سلطنت عثمانیہ کے نائب ونمائندہ امیرِ حجاز (جو شریف مکہ کہلاتے تھے) محمد بن عبداللہ[1] بن سعید بن زید بن محسن الحسنی (م ۱۱۶۹ھ) والیٔ حجاز تھے، جو اپنے والد کی وفات پر ۱۱۴۳ھ میں امارتِ حجاز

---

[1] بعض کتابوں میں ان کا نام محمد بن عبداللہ بھی آیا ہے، شاید لفظی مماثلت سے بچنے کے لئے ادبًا ایسا کیا گیا۔

پر متعین ہوئے[1]، ان کا زمانہ خانہ جنگیوں اور امارت کے لئے خاندانی کشمکش کا زمانہ تھا، ۱۱۴۵ھ ہی میں ان کے چچا مسعود بن سعید نے ان کو ہٹا کر امارت حجاز پر قبضہ کر لیا، لیکن ۱۱۴۶ھ میں انھوں نے دوبارہ یہ منصب حاصل کیا، لیکن پھر چچا نے ان کو معزول کر دیا، اور ۱۱۶۵ھ تک حینِ حیات وہی اس پر قابض و متصرّف رہے، ان کے زمانہ میں حجاز میں سکون اور امن و امان قائم رہا، مورخین ان کو بیدار مغز اور سیاسی سوجھ بوجھ کا آدمی بتاتے ہیں[2]۔

بارہویں صدی کے اس عہدِ وسطیٰ میں راستوں کی بدامنی، بدوؤں کی غارت گری، اور بدانتظامی کی شکایت تاریخ کی کتابوں اور حج کے سفرناموں میں عام طور پر ملتی ہے، جو سلطنت کے مرکز (قسطنطنیہ) کی دوری، ترکوں کی حجاز کے اندرونی معاملات میں امکانی حد تک دخل دینے سے احتراز کی پالیسی اور شرفائے مکہ کے (جو مُسَلَّم النسب حَسَنی سادات میں سے تھے) معاملہ میں ضرورت سے زیادہ لحاظ و مروّت، عربوں کے معاملہ میں غلو کی حد تک احترام و عقیدت، اور ان کی زیادتیوں سے

---

[1] امرائے مکہ کا (جو حسنی سادات میں سے منتخب ہوتے تھے، اور اس کی وجہ سے ان کو "اشراف" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا) سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے ثلث اول سے شروع ہو گیا تھا، پہلے شریف مکہ کا تقرر عباسی خلیفہ المطیع للہ (۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ) کے عہد میں ہوا، سلطان سلیم کے شام و مصر پر قبضہ اور حرمین شریفین کو اپنی تولیت و انتظام میں لینے کے وقت تک شرفائے مکہ کا تقرر مصر کے ملوک خاندان کے فرمانرواؤں کی طرف سے ہوتا تھا، سلطان سلیم نے اس وقت کے شریف مکہ السید برکات، اور ان کے فرزند سید ابونمی کو اپنے منصب پر برقرار رکھا، اور وہ بدستور امیر مکہ رہے، اس کے بعد سے یہ سلسلہ شریف حسین کی امارت تک جاری رہا جنھوں نے (جون ۱۹۱۶ء) شعبان ۱۳۳۴ھ میں عثمانیوں کے خلاف بغاوت کی اور جنوری ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے قبضہ کے بعد حجاز سے بے دخل ہوئے۔ [2] الاعلام ج ۸ ص ۱۱۱-۱۱۲ (بحوالہ خلاصۃ الکلام و عنوان المجد) و تذییل شفاء الغرام لأخبار البلد الحرام ج ۲ ص ۳۰۹-۳۱۰ "باب ولاۃ مکۃ"

چشم پوشی کی سیاست، پھر مزید برآں امارت حجاز کے موروثی اور ایک ہی خاندان میں محدود ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے ان غیر اطمینان بخش حالات، منصبِ امارت کے لئے رقیبانہ و حریفانہ کشمکش اور نظم و نسق کی کمزوری کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھا بھی ہوگا، اور دینی حمیت سے معمور قلب سے محسوس بھی کیا ہوگا، چچا بھتیجہ کی منصب امارت کے لئے معرکہ آرائی جو ۱۱۴۵ھ میں پیش آئی عجب نہیں کہ ان کے زمانۂ قیام میں ہوئی ہو، اور انھوں نے اس سے دور رس نتائج اور اخلاقی زوال کے شواہد اخذ کئے ہوں۔

یمن

یمن میں بھی تقریباً اسی طرح کا نظام نافذ تھا کہ سیاسی و خارجہ پالیسی کے اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت، اور والیِ ترکی (گورنر) کے جو سلطنت کی طرف سے متعین کیا جاتا تھا، موجود ہونے کے ساتھ وہاں امامت کا نظام نافذ تھا، جو یمن میں تیسری صدی ہجری کے وسط سے چلا آرہا تھا، اور جس پر نسباً سادات اور مذہباً زیدی[1] حضرات فائز ہوتے تھے، اہل یمن ان کے

---

[1] علامہ محمد ابوزہرہ نے اپنی کتاب "تاریخ المذاهب الإسلامیة" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زیدی شیعہ فرقوں میں اہل سنت والجماعت سے قریب تر اور معتدل ہیں، انھوں نے ائمہ کو مرتبۂ نبوت تک نہیں پہونچایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صرف ان کی افضلیت کے قائل ہیں، وہ صحابہؓ کی تکفیر نہیں کرتے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جس امام کی آپؐ نے وصیت فرمائی تھی، اس کی تعیین نام و شخصیت سے نہیں کی تھی، بلکہ اوصاف بیان کئے تھے، جو حضرت علیؓ پر منطبق ہوتے ہیں، علامہ ابوزہرہ کی تحقیق ہے کہ اس فرقہ کے بانی امام زید ابن امام زین العابدین، شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی امامت کے قائل تھے، اور ان کی خلافت کو صحیح مانتے تھے (ص ۴۷-۴۹)

ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے تھے، اور وہ امام کہلاتے تھے، جو اس منصب پر فائز ہو اس کا درجۂ اجتہاد تک پہونچا ہوا ہونا، اور اپنے مذہب کا مسلّم و متبحر عالم ہونا مفروغ عنہ سمجھا جاتا تھا، یمن سلطان سلیمان قانونی ابن یاوُز سلیم کے زمانہ حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا، اس وقت ائمۂ یمن کے فرزند و جانشین السید المطہر (ابن الامام شرف الدین (م ۹۸۰ھ) حاکم و امام یمن تھے، ترکی حاکم اور قائد سنان پاشا اور ان کے درمیان جنگ ہوئی، اور یمن سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین ہو گیا[1]، لیکن ترکوں نے حجاز کی طرح یہاں بھی امارت کا نظام قائم رکھا، اور ایک طرح کی داخلی خود مختاری دے دی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب حجاز میں تھے، تو اس وقت یمن میں الامام المنصور باللہ الحسین بن المتوکل علی اللہ قاسم بن حسین امام یمن تھے، جن کا عہد امامت و حکومت ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۶۱ھ تک قائم رہا، مذہب زیدی کی حکومت اور فروغ کے باوجود رعایا زیادہ تر سُنّی اور مذہباً شافعی تھی، یمن بارہویں اور تیرہویں صدی میں علم حدیث کا اہم مرکز رہا ہے، جہاں بارہویں صدی میں محمد بن اسماعیل الامیر (م ۱۱۴۲ھ) صاحبِ "سُبل السلام"، اور تیرہویں صدی میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) صاحبِ "نیل الاوطار" پیدا ہوئے، حجاز کے قیام میں شاہ صاحبؒ قربِ مکانی اور روابط علمی کی بناء پر علمائے یمن کی تصنیفات اور ان کی محدّثانہ خدمات سے ضرور واقف ہوں گے۔

ایران

ایران میں خاندان صفوی کی سلطنت پر دو صدیاں گذر چکی تھیں، اور قانونِ قدرت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البرق الیمانی فی الفتح العثمانی" از علامہ قطب الدین نہر والی (مکّی) حنفی

کے مطابق اس پر پیری واضمحلال کا وہ دور آگیا تھا جو فلسفی مؤرخ ابن خلدون کے بقول "آنے کے بعد جانے کا نام نہیں لیتا" "إن الهرم اذا نزل بدولة لا يرتفع"[1] اس حالت کو دیکھ کر ہمسایہ ملک افغانستان نے فائدہ اٹھایا، اور اپنے حوصلہ مند حکمراں محمود خاں غلزئی کی قیادت میں ۱۱۳۴ھ میں ایران پر حملہ کیا اور اصفہان کو فتح کر لیا، حسین شاہ گرفتار ہوا، افغانوں نے باقی ملک کو بھی فتح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی تعداد اس قدر نہ تھی کہ پورے ملک کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے، محمود خاں تین سال سلطنت کرنے کے بعد ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوا، اس کے جانشین اشرف خاں کے زمانہ میں ملک میں بدنظمی پھیل گئی، اس وقت روس کے فرمانروا پیٹر اعظم نے ایران کے شمالی اضلاع پر حملہ کیا، صلح کے نتیجہ میں ایران کو اپنے بہت سے زرخیز اور اہم اضلاع سے دستبردار ہونا پڑا، شاہ ایران قید میں تھا، خوش قسمتی سے اس کے شاہزادہ طہماسپ کو ایک لائق صاحبِ عزم و نظم قائد مل گیا، جو خاندانی طور پر معمولی حیثیت کا مالک ہونے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کی بناء پر اس گروہ میں شامل تھا، جو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، یہ نادر شاہ افشار تھا۔

نادر شاہ افشار

نادر نے طہماسپ کو اس کے آبائی تخت پر بٹھا دیا، دولت صفویہ زوال سے دوچار تھی، اور اس کے دوبارہ عروج کے آثار نہ تھے، سارے ملک میں انتشار اور بے اعتمادی پھیلی ہوئی تھی، نادر نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی عسکری طاقت کی تنظیم کی، اس کی حوصلہ مندی اور مردانگی نے ایرانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ آندھی پانی کی طرح اٹھا اور سارے ملک پر چھا گیا، اس نے ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں افغانوں کو ایران سے بالکل بے دخل کر دیا، ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء میں اس نے

---

[1] جب کسی سلطنت پر بوڑھاپے کا دور آتا ہے تو پھر اس کی جوانی واپس نہیں آتی۔ (مقدمہ ابن خلدون)

روسیوں کو بحیرۂ خزر (CASPIAN SEA) پر روک کر باعزت اور خودداراںہ صلح کی، اہل عرب کو ملک کے مغربی حدود پر روک دیا، سلطان روم کو شمال سے پسپا ہونے پر مجبور کیا، اور قدیم سلطنت ایران کے صوبے غیر ملکیوں سے واپس لئے، سنہ ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۵ء میں ایران کی سلطنت کو ایسی وسعت حاصل ہو گئی کہ اس کی سرحدیں اپنے قدیمی صورت پر واپس آگئیں، اور سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۶ء میں خاندان صفویہ کا خاتمہ ہو گیا، نادرشاہ افشار اس وقت ایران کا واحد تاجدار تھا۔[1]

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کے مصنّف کے بیان کے مطابق نادر نے تخت سلطنت اس شرط پر قبول کیا تھا کہ ایرانی شیعیت سے دستبردار ہو جائیں، وہ خود نسلاً ترک اور مذہباً سنّی تھا، لیکن ایرانیوں سے سنّیت قبول کرانے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا، اس کے جرنیلوں نے ۱۷۳۷ء میں بلوچستان اور بلخ لئے، ۱۷۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کیا، وہاں سے تسخیر ہند کے لئے روانہ ہو کر کابل پشاور اور لاہور کو تسخیر کیا، ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قریب کرنال میں مغل شاہنشاہ کی بہت بڑی فوج کو شکست دی، دہلی پر قبضہ کیا اور وہاں خوفناک قتل عام کرایا،[2] نادر نے مغل بادشاہ سے تخت نہیں لیا، مگر پچاس کروڑ ڈالر کا تاوان وصول کیا، نیز دریائے سندھ کے شمال و مغرب میں جتنے علاقے تھے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے، بخارا و خوارزم (خیوہ) کی (۱۷۴۰ء میں) تسخیر عمل میں آئی، یہ اس کے مقبوضات میں وسعت کی آخری حد تھی، اور یہیں سے اس کی زندگی میں انقلاب شروع ہوا، وہ بلاشبہ بہت بڑا سالار تھا، لیکن نہ حقیقی تدبر جانتا تھا، اور نہ اس میں کوئی انتظامی قابلیت تھی، شیعیت کو ختم کرنے کے لئے اس کی کوششوں[3] کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چینی بڑھنے لگی، اور اسے دبانے کے لئے وہ ظلم و جور سے

---

[1] ملخص از کتب تاریخ ایران و ہندوستان۔ [2] ان واقعات کی تفصیل بعد کے صفحات میں دیکھی جائے۔

[3] مغربی مورخین اور بعض مسلمان مصنفین کے اس بیان میں کہ نادرشاہ نے ایران سے شیعیت کے خاتمہ کی سنجیدہ اور باعزم کوشش کی اور یہ کہ وہ اصلاً سنی تھا، اس شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ عقیدہ کی تبدیلی کا معاملہ تھا یا سیاسی تدبیر دہلی پر حملہ اور وہاں کے قیام کے دوران نادرشاہ کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ مذہباً سنی ہے اور ایران کو سنیت کے جھنڈے کے تلے لانا چاہتا ہے۔

کام لینے کا عادی بنتا گیا، انجام کار اس نے اپنے گرانقدر محصولوں اور جابرانہ تحصیلات سے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اپنے ہی قبیلہ کے ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔[1]

ایران نادر شاہ کی وفات کے بعد

نادر شاہ کی موت کے بعد ایران میں ابتری پھیل گئی، اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا، اس کی فوج کے سالار اپنی اپنی سلطنت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے، اس کی وفات کے بعد اس کا بھتیجہ علی قلی عادل شاہ (۱۷۴۷ء تا ۱۷۴۸ء) تخت نشین ہوا، اس نے اپنے خاندان کو قتل کروادیا، صرف شہزادہ شاہ رُخ مرزا بچا جس کی عمر اس وقت چودہ[14] برس تھی، عادل شاہ ایک سال کے اندر اندر اپنے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں معزول ہوا، اور اندھا کر دیا گیا، لیکن ابراہیم کی فوج میں بغاوت ہو گئی، فوجی افسروں نے اس کو شکست دے کر قید پھر قتل کر دیا، اس کے بعد عادل شاہ کو بھی قتل کر دیا گیا، اس کے بعد ژند خاندان ایران پر غالب آیا، اور کریم خاں ژند (۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء تا ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) نے انیس[19] برس تک ایران پر حکومت کی، اس نے شیراز کو اپنا پایہ تخت بنایا، وہ انصاف اور رحم دلی کی صفات سے متصف تھا، اس نے ایران کو خونریز جنگوں کے بعد سکون و آرام کا موقعہ دیا، اس لئے اس کی موت پر بڑا سوگ منایا گیا، متعدد کمزور جانشینوں کے بعد لطف علی کے عہد میں خاندان ژند کا زوال مکمل ہو گیا، لطف علی ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء میں قتل ہوا، اور ایران کا تخت خاندان قاچار کے لئے خالی ہوا، چونکہ یہ عہد شاہ صاحب کے بعد کا ہے اس لئے ہم اس سے تعرض نہیں کرتے۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم جلد اول تالیف ولیم ایل لینگر، ترجمہ وتہذیب مولانا غلام رسول مہر۔

افغانستان اور احمد شاہ ابدالی

اٹھارویں صدی سے پیشتر افغانستان کا ایک حصہ ایران کے ماتحت تھا، دوسرا ہندوستان کے ماتحت، اور تیسرے حصہ پر بخارا کے خوانین حکمراں تھے، ۱۷۰۶ء میں قندھار آزاد ہو کر خود مختار ہو گیا، ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے افغانوں کو قندھار کی حکومت سے بے دخل کیا، اور افغانستان نیز مغربی ہند پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت ایک شخص احمد خاں نامی جنگی قیدی کی حیثیت سے اس کے پاس لایا گیا، نادر شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس کو اپنے ذاتی خدمت گاروں میں شامل کر لیا، احمد خاں برابر ترقی کرتا گیا، اور بادشاہ کا اعتماد اس نے بیش از بیش حاصل کیا، نادر کے قتل پر اس نے افغانی صوبوں کی عنان حکومت سنبھال لی، وہ ابدالی قبیلہ کے دُرّانی (سدوزئی) شاخ سے تعلق رکھتا تھا، اس نے دُرِّ دوراں کا لقب اختیار کیا، اور اسی نسبت سے اس کا خاندان دُرّانی کہلایا۔

احمد شاہ نے دُرّانی خاندان کی حکومت اور دُرّانی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کی وفات پر افغان سلطنت مشرقی ایران (مشہد) پورے افغانستان مکمل بلوچستان اور مشرقی سمت میں کشمیر اور پنجاب پر مشتمل تھی، وہ حقیقتاً اٹھارویں صدی کے وسط کے عظیم بانیانِ سلطنت، آزمودہ کار اور عالی ہمت سپہ سالاروں، اور خدا ترس و کریم النفس حکمرانوں میں شامل کئے جانے کے قابل اور بحیثیت مجموعی (ماحول، ابتدائی زندگی اور بے سروسامانی کو سامنے رکھتے ہوئے) عبقری (GENIUS) شخصیتوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے، ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اس نے محمود غزنوی کی طرح ہندوستان کو اپنی ترک تازیوں کا میدان بنایا، اس کے تدبر،

عسکری صلاحیت، مذہبیت، علم دوستی، اور شرافتِ نفس کا اعتراف اس کے متعدد نامور معاصرین نے کیا ہے، اس نے عرصۂ دراز کے بعد افغان علاقہ کو جو اس وقت چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل تھا، ایک مضبوط طاقت میں منسلک کر کے ایک بڑی اور مضبوط اکائی میں تبدیل کر دیا۔[1]

افغانستان، احمد شاہ ابدالی کے بعد

احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۸۶ھ (۲۳ر اکتوبر ۱۷۷۲ء) کو قندھار میں وفات پائی، افسوس ہے کہ عالمگیر اعظم کی طرح اس کے جانشین بھی کمزور نااہل تھے (اور یہ المیہ اکثر عظیم بانیانِ سلطنت اور کامیاب فاتحین و حکمرانوں کے ساتھ پیش آیا ہے) تیمور شاہ کو جو اس کا جانشین اور اس نوخیز اور عظیم سلطنت کا وارث ہوا، اپنے نامور اور صاحب عزم باپ سے کوئی نسبت نہ تھی، بیس سال کمزوری کے ساتھ سلطنت کرنے کے بعد جس میں اس بیس سال سلطنت کے اندر زوال کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، ۱۷۹۳ء میں اس نے انتقال کیا، اس کے فرزند محمود کی بادشاہی کے زمانہ ہی میں سلطنت بارک زئی خاندان میں منتقل ہو گئی،[2] جو انقلاب افغانستان ۱۹۷۵ء تک افغانستان میں حکمراں رہا۔[3]

عالم اسلام کی علمی و دینی حالت

عالم اسلام کا سیاسی و انتظامی جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس کا علمی و دینی جائزہ

لہ مزید تفصیل باب نہم میں احمد شاہ ابدالی کے تذکرہ میں آئیگی۔ ۲ہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول "درانی خاندان کا زوال اور اس کے اسباب" صفحہ ۴۲۰-۴۲۳ ۳ہ اسی خاندان کے حکمرانوں سے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کو سابقہ پڑا، اور اسی کی آخری شاخ ظاہر شاہ پر ۱۹۷۵ء میں ختم ہوئی۔

لیتے ہیں کہ اس کا شاہ صاحب کی زندگی، ان کے موضوع و ذوق اور ان کے کارِ تجدید و اصلاح سے قریبی تعلق ہے۔

بارہویں صدی کے اہلِ کمال

مسلمانوں کی علمی و فکری تاریخ، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں کی طویل روداد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و فکری زندگی و نشاط، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیاں، سیاسی عروج اور سلطنتوں کی ترقی و فتوحات سے مربوط و وابستہ نہیں رہی ہیں، جیسا کہ اکثر غیر مسلم اقوام و ملل کی تاریخ میں نظر آتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال، انقلابِ سلطنت، اور بدنظمی و انتشار کے ساتھ ان کو علمی زوال اور قحط الرجال سے بھی واسطہ پڑتا ہے، سلطنتوں کی ہمت افزائی و سرپرستی، اور قوموں میں خود اعتمادی واحساس برتری کے فقدان کے ساتھ ان کے ذہن و فکر کے سوتے خشک، مسابقت کا جذبہ سرد، اور محرکاتِ عمل کمزور پڑ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، بارہا ان کے سیاسی زوال اور اندرونی انتشار کے زمانہ میں ایسے ممتاز اہلِ کمال پیدا ہوئے، جو دورِ زوال و انحطاط کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے، ساتویں صدی کے آخر میں سقوطِ بغداد اور تاتاریوں کے ان حملوں کے بعد جنھوں نے مشرقی دنیائے اسلام کو زیروزبر کر دیا تھا، اور ان ممالک میں خاک اڑ گئی تھی جو صدیوں سے علم کا مرکز چلے آ رہے تھے، آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) جیسے محدث علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) جیسے اصولی و متکلّم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) جیسے امام و مجتہد، علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) جیسے محدّث و مورّخ، اور علّامہ ابوحیّان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے ماہرِ فن علماء نظر آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم دینیہ میں کمال پیدا کرنے اور ان کی خدمت و اشاعت کے محرّکات اس امت کے اندرون اور باطن میں پائے جاتے ہیں، نہ کہ بیرون (حکومتوں کی سرپرستی و قدردانی) میں، اور وہ محرکات ہیں رضائے الٰہی کا حصول، نیابتِ انبیاء کے فرض کی ادائیگی، اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس، اس لئے یہ عہد اگرچہ مجموعی طور پر سیاسی انتشار کا عہد ہے، اور بڑی بڑی مسلم حکومتوں حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آثار شروع ہو گئے تھے، ملکوں یہاں تک کہ مرکز اسلام حجاز تک میں حکومت و امارت کے حصول کے لئے باہمی کشمکش اور نبرد آزمائی تھی، لیکن مصر، شام، عراق، حجاز و یمن، ایران و ہندوستان میں ہر جگہ علماء درس و تدریس میں مشغول، علمی ذوق رکھنے والے تصنیف و تالیف میں سرگرم، اور مشائخ طریقت تزکیۂ نفس و اصلاح باطن میں منہمک، اور کمالات روحانی، اور ترقیات باطنی سے آراستہ و متصف تھے، اور ان میں سے بعض بعض نے ایسا امتیاز پیدا کیا تھا، کہ اس کی نظیر ماضی قریب میں بھی دور تک نہیں ملتی۔

فن حدیث کو لیجئے تو اس میں علامہ ابو الحسن السندی الکبیر (م ۱۱۳۸ھ) جیسے محدث نظر آتے ہیں جنھوں نے مدت تک حرم شریف میں حدیث کا درس دیا، صحاح ستہ پر ان کے حواشی الھوامش الستّہ کے نام سے مشہور ہیں، مولانا محمد حیات سندی (م ۱۱۶۳ھ) بھی اسی عہد کی زیب و زینت ہیں، شام میں شیخ اسماعیل العجلونی المشہور بالجراحی (م ۱۱۶۲ھ) پایہ کے محدث تھے، ان کی کتاب "کشف الخفا ومزیل الالباس، عمّا اشتہر من الأحادیث علی ألسنة الناس" (ج ۱-۲) بڑی مفید اور جامع کتاب ہے، جو ضعیف و موضوع احادیث کا غالباً سب سے بڑا مجموعہ[1] ہے، کتاب سے ان کی وسعت نظر اور انصاف کا اندازہ ہوتا ہے، ضعیف و موضوع احادیث کے علاوہ وہ حدیثیں بھی ہیں جو زبان زد خلائق ہیں، اور ان کی تخریج عام طور پر معلوم نہیں۔

---

[1] یہ کتاب مکتبۃ التراث الاسلامی حلب نے شائع کی ہے۔

تدریس حدیث کا بڑا مرکز حرمین شریفین تھے، جہاں شیخ ابو الطاہر الکورانی الکردی، و شیخ حسن العجیمی درس دیتے تھے، یمن میں سلیمان بن یحییٰ الاہدل (م ۱۱۹۷ھ) دیارِ یمن کے محدث جلیل اور اپنے عہد کے بڑے خادم و ناشر حدیث تھے، محمد بن احمد السفارینی (م ۱۱۸۸ھ) حدیث اور اصول کے بڑے عالم اور "الدُّرر المصنوعات فی الاحادیث الموضوعات" کے مصنف تھے، یمن میں الامیر محمد بن اسماعیل الحسنی الصنعانی (م ۱۱۸۲ھ) جلیل القدر محدث و محقق تھے، جن کی یادگار "بلوغ المرام" کی مشہور شرح " . . السلام"، اور "تنقیح الانظار" کی شرح "توضیح الافکار" ہے، اسی صدی میں علامہ محمد سعید السنبل (م ۱۱۷۵ھ) کا نام نظر آتا ہے، جن کے اوائل کتب حدیث پر[1] شیوخ حدیث کی اجازت حدیث کا اکثر و بیشتر اعتماد و انحصار ہے، مورخین نے علامہ محمد بن عبد الباقی الزُّرقانی (م ۱۱۲۲ھ) کو "خاتمۃ المحدثین بالدیار المصریۃ" لکھا ہے۔[2]

علمی تبحر، کثرت تدریس و افادہ و کثرت تصنیف و تالیف کے لحاظ سے شیخ عبد الغنی النابلسی (م ۱۱۴۳ھ) اس عہد میں نمایاں ہیں، جن کے تلامذہ اور مسترشدین کثرت سے نظر آتے ہیں، اور ان کو الاستاذ الاعظم کا خطاب دیتے ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد دو سو تئیس ۲۲۳ بتائی جاتی ہے، اسی عہد میں علامہ اسماعیل حقّی (م ۱۱۲۷ھ) بھی تھے، جو "روح البیان فی تفسیر القرآن" کے مصنف ہیں، جو تفسیر حقّی کے نام سے مشہور ہے، بغداد کے علماء میں عبد اللہ بن حسین السُّویدی (م ۱۱۷۴ھ) صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔[3]

جامع ازہر مصر، جامع الزیتونۃ تونس، اور جامعۃ القرویین فاس کے قدیم مدارس کے

---

[1] الاوائل السنبلیۃ فی اوائل کتب الحدیث [2] ان معلومات کا ماخذ "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع" (تصنیف علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب نیل الاوطار) اور "سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر" للمرادی ہے۔ [3] سلک الدرر، البدر الطالع۔

علاوہ مدارس میں دمشق کے مدرسۂ حافظیہ، المدرسۃ الشبلیۃ اور المدرسۃ العذراویۃ کے نام ملتے ہیں۔[1] طرق میں سے نقشبندی، خلوتی، شاذلی، قادری، رفاعی کا بار بار تذکرہ آتا ہے، اور ان کے مشائخ ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عالم اسلام کے علمی ادبی و روحانی ذوق پر ایک نظر

اس زمانہ کے اہل علم پر غالب ذوق ادب، شاعری، علم مجلسی، اور الغاز[2] و لطائف کا ہے، اس میں بھی کوئی بڑا تفوق اور ندرت نہیں معلوم ہوتی، سجع اور قوافی کی کثرت اور تکلفات عام ہیں، ترکی حکومت کے اثرات[3] علمی و ادبی حلقہ پر بھی نمایاں ہیں، کوئی بڑا محقق اور صاحب نظر ڈھونڈھنے سے نظر آتا ہے، مرادی کی "سلک الدرر" کی چاروں جلدیں قصائد، غزلیات، اور ابیات و مقطوعات سے بھری ہوئی ہیں، مکاشفات، خوش عقیدگی اور کرامات کا بہت تذکرہ ملتا ہے، سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ممالک کے علماء اور اہل کمال دار الخلافۃ (قسطنطنیہ) جاتے ہیں، اور حکومت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں، معقولات، حساب و ہندسہ، علوم بلاغت، فقہ و حدیث نصاب کے اہم اجزاء ہیں، تعویذ و نقوش کا رواج عام ہے، بعض علماء نے فقہی متون قدوری وغیرہ کو نظم کیا ہے، متعدد عرب اہل علم فارسی اور ترکی سے بھی واقف تھے، سلطنت کی زبان ہونے کی وجہ سے ترکی سے (بالخصوص شام میں) لوگوں کو مناسبت تھی، ترک علماء کی ایک بڑی تعداد تھی، جو شام میں مقیم تھی، وہ فصیح عربی بولتے تھے، جامع اموی دمشق میں مسند درس پر بیٹھنا بڑے فخر

---

[1] سلک الدرر [2] معمّے اور پہیلیاں [3] ترک مزاجاً و فطرتاً سیاسی، منتظم اور فوجی قوم (MARTIAL RACE) ہیں، ان کے طویل دور اقتدار میں علامہ ابو السعود، طاش کبری زادہ، خلیفہ چلپی جیسے چند ممتاز عالم و محقق و مصنف نظر آتے ہیں۔

کی بات سمجھی جاتی تھی، بعض مشائخ وعلماء "فتوحات مکیہ" کا، اور بعض اساتذہ "فصوص الحکم" کا درس دیتے تھے، شرح جامی، اور مختصر المعانی شام میں بھی پڑھی جاتی تھی، تصوف کا مذاق عام تھا، حتیٰ کہ علماء و محدثین میں بھی، شیخ عبدالغنی النابلسی اور متعدد علماء ومشائخ وحدۃ الوجود کا ذوق رکھتے تھے[1]۔

ایران میں علوم عقلیہ کا غلبہ اور اس کا ہمسایہ ممالک پر اثر

دسویں صدی ہجری کی ابتدا ہی میں اسماعیل صفوی (۹۰۵ - ۹۳۰ھ) نے ایران میں عظیم الشان صفوی حکومت قائم کی، اور پہلی مرتبہ شیعیت کو ملکی مذہب بنایا، اور سنی مذہب کو تقریباً ایران سے مٹا کر رکھ دیا، ایران جس نے امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، جیسے مسلّم امام فن اور ایوان حدیث کے چار ستون، دوسری طرف بلند پایہ فقیہ اور متبحر عالم علامہ ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی، اور حجۃ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی جیسی سرآمد روزگار شخصیتیں پیدا کیں، تقریباً سوا دو سو برس کی باجبروت سلطنت میں اس کا رابطہ حدیث وفقہ اور علوم نافعہ سے منقطع ہو کر رہ گیا، شاہان ایران کا رجحان فلسفہ وحکمت کی طرف زیادہ تھا کہ شیعیت کو شروع ہی سے اعتزال وعقلیت اور فلسفہ سے مناسبت رہی ہے، مشہور حکیم وریاضی داں خواجہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) مصنف "شرح اشارات ابن سینا" جو خود شیعہ اور معتزلی تھے، ہلاکو خاں کے خاص معتمد ومشیر تھے[2]، اس شاہی تقرب واعتماد کی وجہ سے پوری تاتاری قلمرو میں (جس میں ترکستان، ایران وعراق

---

[1] ملاحظہ ہو "سلک الدرر" ۱-۲-۳-۴

[2] ملاحظہ ہو: تاریخ اخبار وآثار خواجہ نصیر الدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی۔

شامل تھے) فلسفہ وحکمت وریاضیات کا رجحان غالب آگیا، صفوی سلطنت کے دوسرے ہی حکمراں شاہ طہماسپ (م ۹۸۴ھ) کے زمانہ ہی میں میر غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جو ایک اشراقی حکیم اور فلسفی[1]، اور شیراز کے مدرسۂ منصوریہ کے بانی تھے، شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ میں ان کو عرصہ تک منصب صدارت تفویض رہا، ہندوستان تک ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ پھیل گئے، انھیں کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ) دسویں صدی کے آخر میں ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو صدارت کا منصب دیا، انھوں نے ہندوستان کے نصاب درس اور طریق تعلیم پر عقلیت کی ایسی گہری چھاپ لگادی جو تیرھویں صدی ہجری تک باقی رہی، مولانا آزاد بلگرامی کے بقول وہی صدرالدین شیرازی، میر غیاث الدین منصور اور فاضل مرزاجان (م ۹۹۴ھ) کی تصنیفات ہندوستان لائے، اور ان کو داخل نصاب کیا۔

گیارھویں صدی کے وسط میں میر باقر داماد (م ۱۰۴۱ھ) کی شخصیت اُبھری جس نے ایران سے لے کر ہندوستان تک کے علمی وتعلیمی حلقہ پر اپنی ذہانت، عقلیت وادبیت کا سکّہ قائم کردیا، شاہ عباس صفوی (م ۱۰۳۷ھ) کے دربار میں وہ نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان کی کتاب "الافق المبین" درسی حلقوں کی بلند پروازیوں کا منتہی سمجھا جانے لگا، ان کے بعد ہی علّامہ صدرالدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) کی شخصیت نمایاں ہوئی، جو اشراقی حکیم اور آزاد خیال فلسفی تھے، ان کی دو کتابیں "الاسفار الأربعۃ" اور "شرح ھدایۃ الحکمۃ"

---

[1] انھوں نے شہاب الدین سہروردی مقتول کی کتاب "ھیاکل النور" کی شرح اشراق ھیاکل النور کے نام سے لکھی ہے، اس میں محقق دوانی کا بہت رد کیا ہے۔

معروف بصدرا[1]، عالمگیر شہرت رکھتی ہیں، ایران کے نسلی ذوق نے جو صدیوں سے رائی کا پربت اور بات کا بتنگڑ" بنانے کا عادی تھا، اس عقلی رجحان کا پورا ساتھ دیا، اور لفظی موشگافیاں، اور دعاوی و مفروضات کی بھول بھلیاں، ایران کی مغربی سرحد سے لے کر ہندوستان کی مشرقی سرحد تک پھیلا دیں، جو "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے مرادف تھیں، دسویں صدی کے عجم سے بارہویں صدی کے عرب تک تدریسی و تصنیفی حلقہ پر "علوم حکمت" کی حکومت قائم تھی، اور ان مصنفین کی عبارتوں کے سمجھنے اور ان کے شرح و تحشیہ کے سوا اظہار کمال، بلکہ اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اور ان کی افادیت میں ادنی قیل و قال عباوت و جہالت کا ثبوت دینا تھا۔

ایران کا اثر قدرتی طور پر افغانستان پر اور افغانستان کے بھی مغربی شہر ہرات پر پڑا وہاں اس شہر کے ایک عالم قاضی محمد اسلم ہروی کابلی (م ۱۰۶۱ھ) منطق و حکمت میں اساتذۂ ایران اور ائمۂ فن کے اس ملک میں سفیر تھے، ان کے صاحبزادہ قاضی محمد زاہد شہور بمیر زاہد[2] (م ۱۱۰۱ھ) نے اس کمال میں اور چار چاند لگائے، انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا "شرح مواقف" "شرح تہذیب" اور "رسالہ قطبیہ" پر ان کے تین[3] حواشی نے جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں، ہندوستان کے درس و تدریس کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، علوم عقلیہ میں اس کمال کے باوجود وہ فقہ و حدیث اور علوم دینیہ میں پایۂ بلند نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ "شرح وقایہ" جیسی فقہ کی متوسط کتاب کے درس میں بھی ان کو اپنے اوپر پورا اعتماد نہیں تھا، شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے

---

[1] صدرا ہندوستان کے نصاب درس میں گیارہویں صدی ہجری سے داخل ہے اس کے حصول اور اس میں مہارت کے بغیر طالب علم فارغ التحصیل اور فاضل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ [2] صحیح زاہد

ملفوظات میں ہے کہ :۔

امیرے شرح وقایہ می خواند بے حضور جدّ بزرگوار سبق نمی فرمود۔[1]	ایک امیر میرزاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا (لیکن فقہ میں اپنے اوپر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے) وہ اس وقت تک سبق نہیں پڑھاتے تھے، جب تک کہ دادا صاحب (شاہ عبدالرحیم صاحب جو معقولات میں خود ان کے شاگرد تھے) نہ آجاتے۔

اس کے مقابلہ میں معقولات میں ایسا توغّل تھا کہ فرماتے تھے :۔

تقریر مرزا جان جان من است،	مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے،
و تقریر آخوند جان جان من است[2]،	اور آخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے

ایران کا یہ اثر نہ صرف افغانستان اور ہندوستان پر، بلکہ شام و عراق تک پر پڑ رہا تھا، اور وہاں بھی معقولات کے علماء کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ان علوم کا ذہن پر رعب و اثر تھا، اور اس کی کتابیں نصاب تعلیم میں شامل ہوتی جاتی تھیں۔

عام اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی حالت

علمی اشتغال، کثیر التعداد اہل کمال، سلاسل و طرق کی مقبولیت، حدیث نبوی سے اعتناء، اور سے حکام کی دینداری، اور ان مسلم حکومتوں کی موجودگی میں جن کا

---

[1] ملفوظات ۔ ۸۲ [2] ایضاً ۔ ۸۳

عقیدہ اسلام پر اور عملی زندگی کے بہت سے شعبوں اور عائلی قانون میں شریعت پر تھا، مدارس آباد اور مسجدیں معمور تھیں، جمہور اور عوام اسلام پسند، دین دوست، علماء کے قدردان، مشائخ اور بزرگوں کے معتقد، دین کے ارکان و فرائض پر عامل تھے، اور ان کے دل حمیتِ اسلامی سے بھی خالی نہ تھے، عالم اسلام میں عمومی طور پر جمود و تنزل پایا جاتا تھا، اخلاق و معاشرت میں فساد آچکا تھا، اہل عجم اور غیر مسلموں کے بہت سے شعائر اور ان کے عادات مسلمانوں نے اختیار کر لئے تھے، حکام میں خودسری، اور سلطنتوں میں مطلق العنانی پائی جاتی تھی، امراء اور اغنیاء کا طبقہ دولت اور تموّل کے بُرے اثرات سے متاثر اور بہت جگہ "مترفین" کے اخلاق و رجحانات کو اختیار کر چکا تھا، معاشرہ کے بہت سے طبقوں پر کسل مندی، تعطّل، سرکار دربار سے وابستگی اور تملّق و خوشامد کی عادت غالب آگئی تھی، بہت سے حلقوں میں توہّمات کا زور تھا، توحید خالص کے حدود سے تجاوز، اولیاء کی تقدیس اور حد سے بڑھی ہوئی تعظیم اور قبر پرستی، اور کہیں کہیں شرک جلی کے نمونے بھی نظر آتے تھے۔

امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (NEW WORLD OF ISLAM) (جدید دنیائے اسلام) میں اٹھارویں صدی کی اسلامی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں اگرچہ کہیں کہیں مبالغہ اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ اس وقت کے عالم اسلام کی یکسر غلط تصویر نہیں ہے[1]، اور اس میں اس کے وہ بہت سے گوشے آگئے ہیں، جو اندر رہنے والوں اور ہر وقت کے دیکھنے والوں کو اکثر نظر نہیں آتے،

---

[1] نامور مسلمان مبصر و مورخ امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب کے عربی ترجمہ (جو "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے شائع ہوا ہے) کے شہرۂ آفاق حواشی میں عالم اسلام کے اس عمومی جائزہ اور تصویر کشی کی تصویب و تحسین کی ہے، اور اس کو واقعہ کے مطابق بتایا ہے۔

اور نئے آنے والے اور پہلی بار دیکھنے والے کو اپنی طرف ملتفت کر لیتے ہیں، اس کی صحت کی پوری ذمہ داری لئے بغیر اس کا یہاں نقل کرنا غلط اور بے محل نہ ہوگا، وہ لکھتا ہے:۔

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہونچ چکی تھی، صحیح قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے تھے، ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے، آداب و اخلاق قابل نفرت تھے، عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ مذلّت میں زندگی بسر کرتے تھے، تعلیم مردہ ہو گئی تھی، اور چند درسگاہیں، جو ہولناک زوال میں باقی تھیں، وہ افلاس و عزبت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں، سلطنتیں مطلق العنان تھیں، اور ان میں بدنظمی اور خون ریزی کا دور دورہ تھا، جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطانِ ٹرکی یا ہند کے شاہانِ مغلیہ کچھ شاہی شان قائم کئے ہوئے تھے، اگرچہ صوبہ جات کے امرا اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں، قائم کرنے کے بہت کوشاں تھے، اسی طرح امراء متواتر سرکش، مقامی رئیسوں اور قطّاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو آزار پہونچاتے تھے، برسر پیکار رہتے، اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی، دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے، لہٰذا تجارت و زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سدِ رمق کے لئے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوّف کے طفلانہ توہّمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا، عوام و جہّال تعویذ، گنڈے اور مالائیں پھنس کر گندے فقرا اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے، اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع و ولی کے طور پر کی جاتی تھی،

کیونکہ ان جہال کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے۔ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی، افیون اور شراب خوری عام ہو رہی تھی، زناکاری کا زور تھا، اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کئے جاتے تھے۔[1]

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" جلد اول ص ۶۹-۷۰، مقتبس از "جدید دنیائے اسلام" مترجمہ جمیل الدین صاحب بدایونی علیگ۔

بابِ دوم

ہندوستان

سیاسی حالت

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) سے چار سال پہلے (۱۱۱۴ھ میں) ہوئی، عالمگیر اس تحتی برّاعظم کا اس ملک کی معلوم و محفوظ تاریخ کی روشنی میں اشوک کے بعد (اگر اس کی سلطنت کی وسعت و عظمت سے متعلق بیانات صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں) ہندوستان کا سب سے بڑا فرمانروا، اور اس کی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی، کیمبرج ہسٹری کے مصنفین لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی حکومت غزنی سے چاٹگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔"[1]

دوسرے مؤرخ لکھتے ہیں:-

"قدیم زمانہ سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل و عریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"[2]

اسی کے عہد میں اور اسی کے ایماء پر میر جملہ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ آسام کو (جو اپنی زبان،

لہ CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA, V. 4 P 316
MUSLIM RULE IN INDIA, D.P. MAHAJAN, DELHI. 1971
لہ۲ CAMBRIDGE HISTORY OF THE WORLD, P. 175, DELHI, 1970

تہذیب، مذہب اور نسل میں ہندوستان سے الگ ایک آزاد منطقہ رہا ہے) فتح کرکے ایک بار سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا[1]، تمام مغربی اور غیر مسلم ہندوستانی مؤرخین کے ان تنقیدی و اختلافی تبصروں کے باوجود جن کا محرّک دراصل اورنگ زیب کی حمیّت وحمایت اسلام ہے[2]، اس کی بے نظیر قوتِ ارادی، استقلالِ طبیعت، انتظامی صلاحیت، سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی اور شجاعت و بہادری ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے[3]۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی پوری توجہ عہدِ اکبری کے مخالفِ اسلام اثرات کو مٹانے، شیعیت کے اثر کو کم کرنے (جس کا بڑا مرکز جنوب تھا، اور اسی لئے اس نے اپنی زندگی اور توانائی کا بڑا حصہ اس کی تسخیر میں صرف کیا) ایران کے ان مجوسیت آمیز تہذیبی اثرات کو جو دورِ اکبری میں قائم ہوگئے تھے، اور جو ایرانی تقویم اور جشنِ نوروز کی شکل میں پائے جاتے تھے، ختم کرنے کے اقدامات کئے، محتسب کا شرعی عہدہ قائم کیا، تاکہ وہ خلقِ خدا کو منہیات و محرّمات سے منع کرے، حکومت کی بیش قرار نامشروع آمدنیاں موقوف کیں، سرود و رقّاصی اور جھروکہ درشن کو بند کیا، شرعی قاضی مقرر کئے اور ان کو اعلیٰ اختیارات دیئے، پوری سلطنت میں شرعی قانون و آئین جاری کرنے، اور قاضیوں کی آسانی کے لئے مسائلِ فقہیہ کی تدوین و ترتیب کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجہ میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوا جو مصر، شام و ترکی میں بھی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مآثرِ عالمگیری" از محمد ساقی مستعد خاں ص ۳۹-۴۰، کلکتہ ۱۸۷۱ء، نیز وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر DR. BERNIER ص ۲۹۴

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۳۲۳-۳۲۴

[3] ملاحظہ ہو اسٹینلی لین پول کی کتاب "اورنگ زیب" AURANGZEB، اور ظہیر الدین فاروقی کی کتاب AURANGZEB & HIS AGE، نیز جادو ناتھ سرکار کی کتاب HISTORY OF AURANGZEB، اور مولانا شبلی کے مضامین عالمگیر۔

(جہاں وہ الفتاوی الھندیۃ کے نام سے مشہور ہے) قانون اسلامی کا ایک بڑا اور مستند ماخذ سمجھا گیا، کورنش و آداب کے غیر اسلامی اور غیر موحّدانہ طریقے منسوخ کئے، اور سلام مسنون کا اجرا کیا قصہ مختصر بقول اقبال ؎

شعلۂ توحید را پروانہ بود
چوں براہیم اندریں بت خانہ بود

ن اصلاحی و انقلابی کارناموں کے ماسوا جو دینی قدر و قیمت کے حامل ہیں، اس کی سب سے نمایاں صفت، اس کی بیدار مغزی، مستعدی، فرض شناسی اور امور سلطنت میں جزو کل سے واقفیت اور نظم و نسق پر کلّی طور پر حاوی ہونے کی کوشش ہے، جو اس خداداد وسیع سلطنت کے فرماں روا کے لئے شرط اول ہے، اس نے اپنے والد شاہجہاں بادشاہ کو ایک خط میں لکھا تھا، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "کاہل وجودی کا الزام مجھ پر عائد نہیں ہو سکتا"[1] ایک امیر کو جواب دیتے ہوئے (جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شہنشاہ کاروبار سلطنت میں محنت شاقہ سے کام نہ لیں کہ اس سے اندیشہ ہے کہ ان کی صحت پر برا اثر پڑے) کہا تھا کہ "مجھ کو پروردگار نے دوسروں کے واسطہ محنت کرنے کے لئے بھیجا ہے" اور شیخ سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

الا تا بغفلت نہ خسپی کہ نوم
حرام است بر چشم سالار قوم[2]

مملکت کی اس وسعت کے باوجود اس کے نظم و نسق پر بذات خود مطلع اور حاوی ہونا اسی شخص کا کام ہے، جو آہنی عزم، فولادی جسم، حد درجہ کا احساس ذمہ داری اور خوف خدا رکھتا ہو، حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی نظر جتنی ملکی کلّیات اور مہمات سلطنت پر تھی، اتنی ہی

---

[1] ملاحظہ ہو ظفرنامہ شاہجہاں   [2] اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول ص ۷۲-۷۳

جزئیات پر، وہ دکن میں تھا، مگر شمال مغرب اور مشرق کی خبر رکھتا تھا، اپنی ذاتی اطلاعات اور پرچہ نویسوں کی مدد سے امورانتظامی کی باریک سے باریک تفصیلات جانچتا تھا جس کی وجہ سے عمّالِ سلطنت جہاں بھی رہتے چوکنا اور مستعد رہتے، وہ ادنی ادنی محرّروں کا تقرّر خود کرتا تھا[1] اس کا یہ شعر اس کے دل کی صحیح ترجمانی اور اس کے احساس ذمہ داری اور اس کے نتیجہ میں اس کی مشکلات کی صحیح تصویر ہے، وہ اکثر اپنا ہی یہ شعر پڑھتا تھا ؎

غمِ عالم فراوان است ومن یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیابان را[2]

کبھی کبھی یہ شعر بھی پڑھتا اور اس پر اس کا عمل تھا ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکرِ سود باش
اے ز فرصت بے خبر! در ہر چہ باشی زود باش

اورنگ زیب کے کمزور جانشین

لیکن اورنگ زیب کے بعد اس کے عظیم اور پُرجلال تخت پر (جو ماحی دین بننے کے بجائے حامی دین اور ہادم ملت کے بجائے خادم ملت بن گیا تھا) اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنھوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے حمایت وحفاظتِ اسلام، احیاءِ دین، اور اجراءِ سنت کی جو "غلطی" ہوئی تھی، وہ اس کی تلافی کریں گے، نیز اس نے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی، ہندوستان کے نظم ونسق کو اپنی بیدار مغزی، مستعدی، اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا تھا، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رُعب واثر قائم کیا تھا، وہ اپنی تعیّش پسندی،

---

[1] اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول ص۹۶ [2] تاریخ ہندوستان ص۴۷۵ ج ۸

کاہلی و نااہلی، اندرونی اختلاف و کشمکش، خود غرض و جاہ پسند ارکانِ سلطنت و وزراء پر کُلّی اعتماد، اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس "گناہ" کا جو عالمگیر اعظم سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفّارہ ادا کرتے رہیں گے، چنانچہ یہ مُغل سلطنت ہی نہیں، ملت اسلامیہ ہی نہیں، ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے تختِ سلطنت پر یکے بعد دیگرے کمزور و نااہل حکمراں آتے رہے، اور تاریخ کی یہ بوالعجبی اور خدا کی شان بے نیازی و کبریائی کا ظہور تھا کہ اس کا پہلا ہی جانشین (شاہ عالم بہادر شاہ اول) اپنے نامور باپ کا بالکل ضد تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عہد (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) میں اورنگ زیب کے بعد گیارہؔ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ محمد معظّم بہادر شاہ (ملقّب بشاہ عالم بہادر شاہ اول)

۲۔ مُعزّ الدین جہاندار شاہ۔

۳۔ فرخ سیر ابن عظیم الشان۔

۴۔ نیکو سیر۔

۵۔ رفیع الدرجات ابن رفیع القدر۔

۶۔ رفیع الدولہ بن رفیع القدر۔

۷۔ محمد شاہ ابن جہاں شاہ۔

۸۔ احمد شاہ ابن محمد شاہ۔

۹۔ عزیز الدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ۔

۱۰۔ محی السُّنّۃ ین کام بخش بن عالمگیر۔

۱۱۔ شاہ عالم ابن عزیز الدین۔

گویا نصف صدی کی مدت میں گیارہ[۱۱] بادشاہ تخت نشین ہوئے، ان میں سے کسی کی مدت حکومت صرف دس[۱] مہینے، کسی کی چار[۲] مہینے سے کم، کسی کی سلطنت برائے نام[۳]، کسی کی چند دن کی حکومت رہی[۴]، ہم یہاں پر اس کے جانشین اول شاہ عالم بہادر شاہ، فرخ سیر ابن عظیم الشان، محمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کے عہد اور ان اہم واقعات و حوادث پر تبصرہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر بنانے میں خاص حصہ لیا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول ۱۱۱۸ھ - ۱۱۲۴ھ

یہ عالمگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو دوسرے فرزند محمد اعظم شاہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا، عالمگیر کے مزاج و مسلک سے اس کے اختلاف کا سب سے بڑا اور پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس نے شیعی مسلک اختیار کیا، جو نہ صرف عالمگیر کے عقیدہ و مزاج و مذاق کے خلاف تھا، بلکہ پورے تیموری سلسلۂ فرمانروایان سلطنت کے عقیدہ و مذہب اور طرز و مسلک کے خلاف تھا، اور اس سلطنت کے مصالح کے بھی مخالف تھا (جس کی مسلمان آبادی کا نوّے[۹۰] پچانوے[۹۵] فی صدی حصہ ہندوستان کے مشرقی حدود بنگالہ سے لے کر سلطنت کے مغربی حدود کابل و قندھار تک سنّی فرقہ اور حنفی مذہب کا پیروکار تھا) اور جس کی ہندوستان میں کامیابی اور مقبولیت کے کوئی امکانات نہ تھے، "سیر المتاخرین" کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے بیان کے مطابق (جو خود اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی شیعیت تاریخی سیاق و سباق

---

[۱] معز الدین جہاندار شاہ [۲] رفیع الدرجات ابن رفیع القدر، مدت حکومت تین ماہ دس روز
[۳] رفیع الدولہ ابن رفیع القدر [۴] محی السنۃ ابن کام بخش ابن عالمگیر۔

کے اندر سے بھی جھلکتی نظر آتی ہے) بہادر شاہ کے شیعہ مذہب اختیار کرنے اس مسئلہ پر علماء اہل سنت سے مباحثہ ومناظرہ کرنے، خطبہ میں کلمہ "علیؓ ولی اللہ وصیّ رسول اللہ" کے داخل کرنے کا حکم دینے پر لاہور میں جہاں بادشاہ کا قیام تھا، شورش برپا ہوئی، بلوا ہوا، انھوں نے خود اس کے رواج نہ پکڑنے کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

بہادر شاہ بدستور اصرار بایں کار داشتہ	بادشاہ بدستور اس بات پر اصرار کرتا رہا
در ترویج وتقویت مذہب شیعہ می کوشید،	اور مذہب شیعہ کی ترویج وتقویت میں
ومدت ہائے دراز در مباحثہ بعلماء باز بود	ساعی وسرگرم رہا، مدتوں تک علماء
اما فائدہ برآں مترتب نمی شد۔[1]	کے ساتھ مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا،
	لیکن اس سے کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوا۔

اس تبدیلی کا نتیجہ عوام اور خود فوج میں نیم دلی بلکہ بددلی کی شکل میں نکلا، اور اس میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا، جو گزشتہ مغل بادشاہوں کے دور میں ایک بڑی قوتِ محرکہ تھی، اس حقیقت کا احساس بعض غیر مسلم مورخوں تک کو ہوا ہے، ڈاکٹر ستیش چندر لکھتے ہیں کہ "حکومت کی پالیسی پر مذہب کا اثر کمزور پڑ گیا"۔[2]

مولوی ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں :-

"عالمگیر کے مرنے کے بعد سلطنت کے کاموں میں انقلابات عظیم ہو گئے تھے، اور تمام تعلقات کی صورت بدل گئی تھی، اور مرہٹوں سے جو سلطنت تیموریہ کے تعلقات تھے وہ بالکل کایا پلٹ ہو گئے تھے، .... سلطنت مغلیہ کمزور ہو کر قریب المرگ تھی،

---

[1] "سیر المتاخرین" ج ۲ ص ۳۸۱

[2] DR. SATISH CHANDRA PARTIES AND POLITICS IN THE MUGHAL COURT, 1707–40 . ALIGARH , 1959 , P. 40

مگر مرتے دم تک اپنی نخوت و تکبر سے ہاتھ نہیں اٹھایا"۔[1]

وہ عالمگیر جو اورنگ آباد میں ہوتا تو دہلی کا کیا ذکر بہار و بنگال میں بھی کارکنانِ سلطنت پر، اس کی ہیبت طاری رہتی، وہ جزئیات سلطنت سے باخبر رہتا، اور بر وقت مناسب احکام جاری کرنے میں ذرا سی تاخیر سے کام نہ لیتا، اب اس کے جانشین کا حال یہ تھا کہ بقول مؤرخ ہندوستان:۔

"باضابطہ و بے ضابطہ اجراء کار میں فوراً تفاوت ہوتا، بادشاہ کی دستخط کا اعتبار نہیں رہا، بادشاہ اپنے متصدّیوں سے فرمایا کرتا کہ سب اہل کار آپس میں مل گئے ہیں، جو بہتر جانتے ہیں عمل میں لاتے ہیں، ہمارا فقط اعتبار رہ گیا ہے، خلق کے مطلب قبول کرنے کے سوا ہم کو کوئی اور چارہ نہیں ہے"۔[2]

نیز وہ لکھتے ہیں:۔

"ظریف شوخ طبعوں نے اس کی تاریخ جلوس "شہہ بے خبر" کہی ہے، راتوں کو جاگتا، دوپہر دن چڑھے تک سوتا جس کے سبب سے خلق اللہ کو سفر کے دن تکلیف ہوتی کہ ان کو اپنے خیموں کی شکل نہ ملتی"۔[3]

نیز:۔

"تیسرا کام اس نے اپنے آئین کے خلاف یہ کیا کہ علماء پر عتاب و خطاب کیا، اور جا بجا محبوس کیا، پھر مزاج پر خفقان کا غلبہ ایسا ہوا کہ دار السلطنت لاہور میں ۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ ہجری کو جہان فانی سے رخصت ہوا"۔[4]

طباطبائی بھی شاہ عالم بہادر شاہ کے اخیر عمر میں اختلال دماغ، کتوں کے مارنے کا حکم اور سحر کے اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں۔[5]

---

[1] "تاریخ ہندوستان" مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔ ج ۹ ص ۳۳ [2] ایضاً ص ۳۸ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] سیر المتاخرین ص ۳۸۱-۳۸۲

اس طرح عالمگیر کے پہلے ہی جانشین کے زمانہ اور صرف ۶ برس کی مدت سلطنت میں عظیم سلطنت مغلیہ کی چولیں ہل گئیں، اور اس کی وہ ساکھ اور دھاک ختم ہوگئی جو مخالف طاقتوں، فتنہ پردازوں اور عوام و خواص کے دماغ پر بابر کے زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔

فَرُّخ سِیَر

فرّخ سیر (۱۱۲۵ھ سے ۱۱۳۱ھ) کے زمانہ میں حسین علی خاں، عبداللہ خاں (جن میں سے اول الذکر امیر الامراء کے لقب سے اور ثانی الذکر قطب الملک کے لقب سے ملقّب تھے) کا اقتدار بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہوگیا، فرّخ سیر ان کے ہاتھ میں کھلونا تھا، آخر انھوں نے فرخ سیر کو قید کیا، پھر قید حیات سے بھی رہا کر دیا، مصنف "تاریخ ہندوستان" لکھتا ہے:۔

"اگرچہ محمد فرّخ سیر وسیع الاخلاق اور قدرداں تھا، ہر ایک کی خدمت اور تردد کے مقابل میں چاہتا تھا کہ بقدر امکان منصب وعمدہ خدمات عنایت کرکے ہم چشموں میں ممتاز کرے، مگر اختیار نہیں رکھتا تھا، اور نہ آزمودہ کار جوان تھا، امور سلطنت سے بے خبر، خوردسالی سے صوبہ بنگالہ میں باپ دادا سے دور نشوونما پایا، استقامت مزاج اور رائے صائب نہیں رکھتا تھا، اوروں کی رائے پر چلتا تھا، قسمت سے تاج وسلطنت مل گیا تھا، خاندان تیموریہ کا جوہر شجاعت تھا، وہ اس کے خلاف جُبن ذاتی رکھتا تھا، صاحبِ غرض کی سخن کی تہہ پر نہ پہونچتا، ابتدا سے اپنی سلطنت کا مادّۂ فساد خود ہی بنا"[1]

بادشاہ کے یہاں راجہ رتن سنگھ (دیوانِ سید عبداللہ خاں) تمام متصدیوں کے تعلّق میں دخل دیتا، کسی کا اصلاً اعتبار واستقلال اس نے نہیں رکھا تھا، خصوصاً مقدمات مالی میں......

---

[1] ایضاً ص ۱۰۹

بادشاہ کی عیاشی، خلوت نشینی علاوہ بے دماغی کے زیادہ ہوگئی تھی، خلق اللہ کا کار بند تھا۔[1]

بالآخر دونوں بھائیوں (قطب الملک و امیر الامراء) نے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھیری اور قلعہ کے اندر حبس خانہ میں جو قبر کی صورت تھا، بادشاہ کو قید کیا اور ۶ سال ۴ ماہ حکومت کر کے وہ اس دنیا سے رخصت ہوا، ان واقعات نے پورے ملک میں تخت مغلیہ کے جانشینوں کی بے احترامی اور سلطنت کی بے اعتباری پیدا کر دی۔

محمد شاہ بادشاہ (م ۱۱۶۱ھ)

محمد شاہ نے ۲۹ سال ۶ مہینے حکومت کی اس کا عہد پُر از حوادث و واقعات ہے، اسی کے زمانہ میں نادر شاہ کا دہلی پر تاریخی حملہ ہوا، لیکن اس وقت سلطنت پر حاوی اور اس کے سیاہ سپید کے مالک یہی دونوں سادات بارہہ قطب الملک عبد اللہ خاں اور امیر الامراء حسین علی خاں تھے، اس وقت اہل دربار کا تاثر یہ تھا کہ "اُن دونوں کے تسلّط سے بادشاہ کو سوائے نماز جمعہ کے کسی احکام کے جاری کرنے کا مقدور نہیں ...... دونوں بھائی تمام خاندان ایران و توران کی بے آبروئی پر کمر باندھے بیٹھے ہیں، اور ترک منصب اور گوشہ نشینی میں رستگاری نہیں، اور تمام موروثی خانہ زادوں، اور دور و نزدیک جاں نثار نوکروں کا دل نہایت افسردہ ہو رہا ہے کہ وارث تخت و تاج بے اختیار ہے، اور نماز جمعہ اور اجرائے احکام شرع پر قادر نہیں، آگرہ کے نزدیک سے کنارۂ دریائے شور تک ہنود بُت خانے بنا رہے ہیں، اور گاؤ کُشی کو منع کر رہے ہیں۔"[2]

"کل امور مالی و ملکی میں رتن چند کے اختیار سے جو سوائے قوم بارہہ اور قوم بقّال

---

[1] ایضاً ص ۱۳۰ [2] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۶۶

کے کسی پر نوازش نہیں کرتا تھا، سب چھوٹے بڑے متنفر تھے، اور ہر دیار کے شرفاء خواری و بے اعتباری سے زیست کرتے تھے۔"[1]

"سیر المتاخرین" کا مصنف طباطبائی لکھتا ہے:۔

"بادشاہ چون جوان بے عزم و کم جرأت	بادشاہ چونکہ بے عزم اور کم جرأت
بود مشغول عیش و طرب گردید، در امرے کہ	جوان تھا، عیش و عشرت میں مشغول
اشد ضرور بود توجہ می نمود......	ہو کر صرف اسی کام پر توجہ دیتا
بایں سبب اندک اندک خوف و ہراس	جو اشد ضروری ہوتا، اس سبب سے
از دل امراء و رؤساء ہر فرقہ بلکہ	تھوڑا تھوڑا کر کے خوف و ہراس
عوام الناس برخواستہ ہر کس در دماغ	ہر فرقہ کے امراء و رؤسا بلکہ عوام الناس
خود خیالے می پخت، و بجائے خود نشستہ	کے دل سے نکل گیا، ہر شخص اپنے
در باطن دم در استقلال می زد۔"[2]	دماغ میں ایک خیال پختہ کئے ہوئے
	اپنی جگہ بیٹھا ہوا، اپنی آزادی و
	خود مختاری کا دم بھرتا تھا۔

اس وقت دربار و ارکین سلطنت میں نظام الملک آصف جاہ ہی کی ایک ایسی ہستی تھی، جو صاحبِ عزم، عالی ہمت ہونے کے ساتھ صاحب تخت کی وفادار، مخلص اور خیر خواہ تھی، لیکن سادات اور ایرانی عنصر کسی طرح ان کی بات چلنے نہیں دیتا تھا، یہ دیکھ کر کہ ان کی وفاداری اور خلوص کی کوئی قدر نہیں ہے، اور یہاں رہنا وقت ضائع کرنا، اور اپنے کو ہر وقت خطرہ میں مبتلا کرنا ہے، انھوں نے عرصہ ہوا دکن کا رخ کیا تھا، اور دہلی کا میدان

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۸۲　[2] سیر المتاخرین۔ ج ۲ ص ۴۵۸

اہلِ غرض کے لئے خالی ہوگیا تھا۔

اس کے بعد محمد شاہ پر تعیّش کا وہ غلبہ ہوا کہ انھوں نے اس سے پہلے کے عیش پسندوں کو مات کردیا، اوران کے واقعات بھلا دیئے، ہندوستان کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ:۔

"محمد شاہ بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا، ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا، عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ و خرگاہ صحرا زوانہ ہوے

می دید صبح کلہ بستہ سحاب　　الصبوح الصبوح یا اصحاب

ژالہ بارید بر رُخ لالہ　　المدام المدام یا احباب

کا شور تھا"

بالآخر امیر الامراء سید حسین اور قطب الملک نواب عبداللہ خاں (حسن علی خاں) سادات بارہہ کے اقتدار کا خاتمہ اور زندگی کا جام لبریز ہوا، لیکن اس سے بھی سلطنت مغلیہ کی قسمت نہیں بدلی، اس لئے کہ بادشاہ حکمرانی کی ہر صلاحیت اور خطرات کے سمجھنے کی معمولی بصیرت سے بھی محروم تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ گر سادات کے خاتمے اور محمد شاہ کی قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی، لیکن یہ خوشی اگر جذبۂ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری، اور ملکی رفاہ و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام رنج و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا، کیونکہ اکبر و اورنگ زیب کا نیا جانشین، درحقیقت اپنے اقبال مند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا،

اسے اپنے عیش و عشرت کے مشغلوں میں معاملات ملک پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی، وہ محل سرائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پرواہ تھا حتیٰ کہ اس کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ مہر پرور) کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں، کہ وہ بھی اپنے مدہوش پوتے کو بار بار اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی، جس کا صریح نتیجہ زوال و ادبار تھا۔"[1]

اس موقعہ پر ہم کو جادو ناتھ سرکار کی اس رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جو انھوں نے محمد شاہ کی کمزوریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"محمد شاہ اگرچہ عزت کا مستحق نہیں، مگر رحم کا مستحق ضرور ہے، حالات نے اسے ایسی جگہ لا کھڑا کیا تھا، جہاں کسی عبقری (GENIUS) کی ضرورت تھی، مگر وہ ایک معمولی انسان تھا، مؤرخ اسے اس بات پر ملامت کرتے ہیں کہ اس نے کاروبار حکومت انجام دینے کے بجائے تعیُّش میں اپنا وقت صرف کیا، لیکن حالات کی ٹریجڈی یہ تھی کہ اس کے جیسا آدمی اگر کاروبار حکومت پر پوری توجہ دیتا تب بھی وہ حالات کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ جیسے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی ذلت کے احساس سے بھی عاری تھے لیکن محمد شاہ میں بدترین حالات، اور انھیں سدھارنے میں اپنی لاچاری دونوں کا احساس موجود تھا۔"[2]

---

[1] تاریخ ہند از فرید آبادی کتاب سوم ص۲۶۱

[2] FALL OF THE MUGHAL EMPIRE P. 373-74

غرض وہ سلطنت جو بابر کے عزم جہاں کشا اور اس کے استقلال اور جفاکشی سے قائم ہوئی تھی، اور جس کو اس کے جانشینوں نے اورنگ زیب تک اپنے جوہر شجاعت اور غیرت تیموری سے قائم رکھا تھا، اس عیش کوشی اور غفلت اور خود فراموشی کی منزل پر پہونچ گئی، جو موروثی اور مطلق العنان سلطنتوں کی تاریخ بلکہ تقدیر بن گئی ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

آخر اس کا نتیجہ وہی نکلا جس کو خود محمد شاہ نے ۔ ع

شامتِ اعمال ما صورت نادر گرفت

کے بلیغ مصرعہ میں ادا کیا، ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا، اس نے اس سے پہلے محمد شاہ کو کئی خط لکھے تھے، لیکن بقول مؤرخ :۔

"یہاں اِن دنوں عیش و عشرت کا زور شور تھا، محمد شاہ بہادر صاحب سریر تھا تن آسانی کے سوا کسی کام سے کام نہ تھا، ہر وقت ہاتھ میں جام اور بغل میں دل آرام تھا، کس کو دماغ تھا کہ نامہ کا جواب لکھتا"۔[1]

نادر شاہ کے حملہ کی تفصیلات ہندوستان کی تاریخوں میں پڑھی جائیں، اس کے حملہ کے بعد دہلی کی جو حالت ہوئی (ذہن میں رہے کہ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، اور وہ حجاز سے واپس تشریف لا چکے تھے) اس کا نقشہ مصنف تاریخ ہندوستان کی زبان سے سنا جائے :۔

"نادر شاہ کے جانے کے بعد شہر مُردوں سے پُر تھا، اور زندوں سے خالی تھا، مکانوں پر ویرانی برستی تھی، محلے کے محلے جلے پڑے تھے، مُردوں کی سڑانڈ سے بھیجا نکلا جاتا تھا،

---

[1] تاریخ ہندوستان ۔ ج ۹ ص ۲۵۱

نہ کوئی کسی کو کفن دینے والا تھا، اور نہ گور میں دفن کرنے والا تھا، مرکر ہندو مسلمان ایک ہوگئے، ڈھیروں میں جل کر خاکستر ہوگئے، یہ تو شہر کی کیفیت تھی، دربار کا حال یہ تھا کہ کچھ دنوں تو وہ بھاری نیند سوتا رہا، اور جب اٹھا تو اس کی آنکھوں میں اس قدر چیپڑ لگا ہوا تھا کہ دیکھنے سے گھن آتی تھی، خزانہ میں پھوٹا با دام نہ تھا، محاصل اور خراج کا کہیں پتہ نہ تھا، سپاہ تباہ اور خستہ حال تھی، اس پر مرہٹوں کا بھی خوف بالکل نہیں گیا تھا، جو صوبے ان کے قبضہ میں چلے گئے تھے، وہ ان کے ہاتھ سے تباہ ہوئے تھے، ان سب مصیبتوں اور آفتوں پر درباریوں کا جھگڑا نہ چکا، وہی ایک فریق تورانی امیروں کا تھا جن کے سرتاج آصف جاہ اور قمرالدین خاں وزیر تھے، دوسرا گروہ ان امیروں کا تھا جو ان کو خارج کرنا چاہتا تھا، اور ان میں بادشاہ بھی شمار ہوتے، اگر بیچ میں مرہٹوں کا جھگڑا نہ آن پڑتا تو ان امیروں نے سلطنت کے ٹکڑے کرکے کبھی کے آپس میں تقسیم کر لئے ہوتے، اور خاندان تیموریہ کو بے نام و نشان کر دیا ہوتا۔"[1]

جب نادر شاہ ہندوستان سے چلا گیا تو اول اس کا اثر یہ ہوا کہ سلطنت دہلی سے تین زرخیز صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ علیحدہ ہوگئے، اور ان میں جدا ہی علی وردی خاں کی ایک ریاست قائم ہوگئی۔[2]

۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (اپریل ۱۷۴۸ء) کو محمد شاہ مرض اسہال میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا، اور بقول مصنف "تاریخ ہندوستان" کہ تیس[3] سال سلطنت کرکے خاندان تیموریہ کو تباہی کے کنارہ پر پہونچا گیا۔"[3]

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۲۷۲ [2] ایضاً ص ۲۶۲ [3] ایضاً ص ۲۸۴۔

شاہ عالم ثانی

محمد شاہ کے زمانہ میں اگر سلطنت مغلیہ کو اخلاقی و انتظامی طور پر زوال ہوا، اور ہندوستانی معاشرہ اور طبقۂ امراء کا رجحان الناس علیٰ دین ملوکھم کے اصول کے مطابق عیش وعشرت، تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی کے ساتھ ہوا، تو شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں جو ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا، سیاسی طور پر زوال اپنے آخری مرحلہ تک پہونچ گیا، وہ اپنے ۴۷ سالہ عہد حکومت میں دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا، بکسر کی لڑائی میں اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ اور میر قاسم کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی، اور ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا، ۱۷۶۵ء میں اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات محاصل کی تحصیل وصول کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آ گیا، شاہ عالم نے خود کو مرہٹوں کی پناہ میں دے دیا، اور الٰہ آباد اور کڑہ کے اضلاع اُن کی طرف منتقل کر دیئے۔

شاہ عالم ثانی کے عہد سے بہت پیشتر سے پورا ملک مرہٹوں، سکھوں اور دہلی و آگرہ اور راجپوتانہ جاٹوں کے رحم وکرم پر تھے، جو آندھی پانی کی طرح آتے اور پورے علاقہ کو تاراج کر جاتے، ملک میں کوئی طاقت امن و قانون قائم کرنے کے قابل نہ تھی[1]، احمد شاہ ابدالی نے ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ملک کو ان کے خطرہ سے محفوظ کر دیا، اس نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بڑی کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، مجبور ہو کر اس کی والدہ نواب زینت محل سے بھی خط لکھوایا، اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان اور شاہ عالم میں سلطنت کی

---

[1] تفصیل کتاب کے باب نہم میں ملاحظہ ہو۔

صلاحیت ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتیجہ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں اپنا اقتدار بحال کرلیتا لیکن سلطنت بے روح، اور بادشاہ عزم و ہمت ہی نہیں، حمیت اور غیرت سے بھی عاری تھا بقول اقبال۔ ع

حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

بادشاہ پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء میں الٰہ آباد سے دہلی آیا، وقت گذر چکا تھا، اس لئے وہ پانی پت کی اس عظیم الشان فتح اور مرہٹوں کی شکست سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا وہ یہاں آکر نئے فتنوں، امراء کے جوڑ توڑ، روہیلوں کی نئی طاقت اور سکھوں کے حملوں سے دوچار ہوا، بالآخر نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۸ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا، شاہی محل لوٹا، شہزادیوں کو کوڑے لگوائے اور سلطنت تیموری کے وارث مغل شہنشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لیں سلطنتِ مغلیہ اور اس کے مالک و وارث کی بے حرمتی و بے آبروئی اس سے پہلے ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۷۸۹ء میں سندھیہ نے غلام قادر کو بڑے دردناک طریقہ پر قتل کیا، اور شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا، نو لاکھ روپیہ سالانہ اس کے اخراجات کے لئے مقرر کیا، متعدد لڑائیوں کے بعد ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک انگریزی فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا، مرہٹوں کو نکال دیا، اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سال مقرر کردی[1]، شاہ عالم ۴۵ برس تخت نشین اور ۱۸ سال نابینا رہ کر ۱۸۰۶ء میں راہی ملک بقا ہوا۔

علمی و روحانی حالت

سیاسی انتشار، اجتماعی بدنظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات،

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۳۴۳، بعض انگریزی تاریخوں میں نوے ہزار بیان کی گئی ہے۔

تدریسی وتصنیفی انہماک، روحانی یکسوئی، باطنی ترقی، اور نفوس کے تزکیہ و اصلاح کا دور تھا جس میں متعدد ایسی باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو اس دورِ انحطاط سے کوئی مناسبت اور جن پر حالات سے یاس وہراس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، کہتے ہیں کہ بہت سے علمی وادبی شاہکار ان افراد کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں، جو کسی مزمن مرض میں مبتلا، یا کسی معذوری اور اندرونی صدمہ کا شکار تھے، علمائے نفسیات اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں قوتِ مقابلہ اور اس مجبوری کی تلافی کا عزم ابھر آتا ہے، اور آدمی سے ایسے کام کرا لیتا ہے جو معتدل (NORMAL) حالات میں نہیں ہوتا، ہندوستان کے اس دور کا علمی اور روحانی پہلو، اور اس دورِ انحطاط میں ایسی قدآور شخصیتوں کا ظہور، ایک مریض اور برسرِ انحطاط معاشرہ کی اندرونی قوتِ مقابلہ کا ثبوت، اور اسلام کی مردآفرینی اور آدم سازی کی صلاحیت کی دلیل ہے۔

وفورِ علم، ذہانت، قوتِ تدریس اور حسنِ تصنیف کے لحاظ سے ہمیں اس دور میں مولانا احمد بن ابوسعید عرف ملّا جیون امیٹھوی (سنہ ۱۰۴۷ھ – سنہ ۱۱۳۰ھ) صاحب "نور الانوار" اور "التفسیرات الاحمدیہ" ملا حمد اللہ سندیلوی (م سنہ ۱۱۶۰ھ) صاحبِ "شرح سلّم" مشہور بحمد اللہ، مولانا محمد حسن معروف بملا حسن فرنگی محلی صاحبِ شرح سلّم مشہور بملا حسن (م سنہ ۱۱۹۹ھ)، مولانا رستم علی قنوجی (م سنہ ۱۱۷۸ھ) شیخ صفۃ اللہ خیرآبادی (م سنہ ۱۱۵۷ھ) شیخ علی اصغر قنوجی (م سنہ ۱۱۴۰ھ)، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (سنہ ۱۱۱۰ھ – سنہ ۱۲۰۰ھ) مولانا غلام نقشبند لکھنوی (م سنہ ۱۱۲۶ھ) قاضی محب اللہ بہاری (م سنہ ۱۱۱۹ھ) مصنف "سلّم العلوم" و "مسلّم الثبوت" (جنھوں نے تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے علماء ومدرسین کو ان دونوں کتابوں کی شرح وتحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی کتابیں مصر تک کے علماءِ کبار اور اساتذۂ ازہر کی مرکزِ توجہ رہیں) قاضی مبارک گوپاموی (م سنہ ۱۱۶۲ھ) مصنف شرح سلّم معروف بقاضی، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف کشّاف اصطلاحات الفنون (جو اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب

ہے) اور سب سے اول و آخر میں ملا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) جن کے ترتیب دیئے ہوئے درس کا سکہ ہندوستان سے بخارا اور سمرقند تک رواں ہے، اور جن کو مصنف "نزہۃ الخواطر" نے "غیث الإفادة الهتون، العالم بالربع المسکون، أستاذ الأساتذة وإمام الجهابذة" کے القاب سے یاد کیا ہے، جیسے سرآمد روزگار، اور فخر بلاد و امصار عالم، مدرس، مصنف، اور پوری پوری علمی تحریک اور سلسلۂ تدریس و تربیت کے بانی اسی صدی کے رجال و اعیان میں تھے۔[1]

سلوک و طریقت کے لحاظ سے دیکھئے تو اس صدی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۱ھ۔ ۱۱۹۵ھ) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی ہستی موجود تھی، جن کے متعلق خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شہادت ہے کہ "ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے"۔[2]

سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ اور ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی (م ۱۱۳۶ھ) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۲ھ) اور اسی سلسلہ کے ناشر و امام شاہ فخر الدین (شاہ فخر دہلوی) (م ۱۱۹۹ھ)، سلسلۂ قادریہ کے مشہور شیخ شاہ محمد غوث قادری لاہوری (م ۱۱۵۴ھ) سلسلہ نقشبندیہ کے شیوخ کاملین شیخ محمد عابد سنامی (م ۱۱۶۰ھ) خواجہ محمد ناصر عندلیب (والد خواجہ میر درد) (م ۱۱۷۲ھ) شاہ منیب اللہ بالاپوری اور حضرت شاہ نور محمد بدایونی[3] (م ۱۱۳۵ھ) اس عہد میں مسند آرا اور فیض رساں نظر آتے ہیں، غرض یہ زمانہ سلاسلِ ثلاثہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے شیوع و انتشار کا زمانہ تھا، اور تینوں سلسلوں کے شیوخ کاملین موجود تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز

---

[1] مستفاد از "نزہۃ الخواطر" ج ٦۔ [2] "کلمات طیبات" ص ٦٥۔ [3] یہ اسمائے گرامی، ان کے سنین وفات اور امتیازی خصوصیات "نزہۃ الخواطر" تصنیف مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، جلد ششم سے اخذ کئے گئے ہیں۔

رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے:۔

درعہد محمد شاہ بادشاہ بست ودو بزرگ	محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بائیس[۲۲]
صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی	بزرگ صاحب ارشاد مختلف خانوادوں
بودند، وایں چنیں اتفاق کم می شود۔[له]	سے تعلق رکھنے والے دہلی میں موجود
	تھے، اور ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

اخلاقی ومعاشرتی پستی

لیکن ان نامور اہل کمال، اور مسیحا نفس شیوخ کاملین کی موجودگی میں واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اور خاص طور پر طبقۂ امراء سلطنت کے اثر، سیاسی زوال، دولت کی فراوانی، اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اس کردار کے ادا کرنے سے قاصر تھا، جو طبقۂ امراء نے ہر دور میں انقلاب سلطنت کے موقعہ پر ادا کیا ہے، اسی طبقہ میں سے (جو SECOND LINE رہا ہے) وہ افراد سامنے آئے ہیں جنھوں نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے، جو سیاسی وانتظامی میدان میں پیدا ہو جاتا تھا، سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے:۔

"ہندوستان کی دولت وثروت نے خود اس طبقۂ امراء کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا۔ ...... ہم ان امیروں کی ساری کوشش وقابلیت ادنیٰ اغراض کے لئے سازش اور ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں، انقلاب سلطنت اور حصولِ بادشاہی تو درکنار، کسی مسلمان امیر کو اپنے اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی جسارت نہ ہوتی، اور اس عرصہ میں ادھر تو نظم ونسق کی اندرونی خرابیاں

له ملفوظات عزیزیہ صفحہ ۱۰۶

بڑھتی رہیں، اور ادھر حکمراں طبقہ کے افراد سے انتظام حکومت اور اشتراک عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی"[1]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

بخانۂ قمرالدین خاں عورات غسل اخیر را از گلاب می کردند، وخانہ دیگر نواب سہ صد روپیہ گل وپان برائے عورات می رفت۔[2]	نواب قمرالدین خاں کے گھر میں عورتیں اخیر کا غسل گلاب سے کرتی تھیں، دوسرے نواب کے گھر میں تین سو روپے کے پھول اور پان عورتوں کے لئے جاتے تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ "مآثر الکرام" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیر الامراء (حسین علی خاں) کے عہد میں شہر کے اکثر لوگ اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتے تھے، امیر الامراء کی سرکار کے باورچی اپنا حصہ بیچ ڈالتے تھے، پُرتکلف پلاؤ کی ایک قاب چند پیسوں میں لوگوں کو مل جاتی تھی"[3]

اعتقادی کمزوری اور شرک و بدعات کا زور

اس معاشرتی اور اخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک، اور خدا کی نصرت سے محروم، اور حقیقی طاقت سے عاری کرنے والی خرابی ضعیف الاعتقادی، قرآن مجید کے اعلان "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ"[4] کے خلاف بکثرت عوام کی زندگی، مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم وعادات کی تقلید تھی، شرک جلی کی ایسی متعدد صورتیں بہت سے مقامات اور حلقوں میں پائی جاتی تھیں،

---

[1] تاریخ ہند کتاب سوم از مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ص ۲۶۳-۲۶۴ ، حیدر آباد ۱۹۲۱ء۔

[2] ملفوظات عزیزی۔ [3] مآثر الکرام۔ ج ۱ ص ۱۷۰ [4] الزمر۔ ۳

جن کی کوئی علمی توجیہ ممکن نہیں کھلی ہوئی قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی، مزارات اور اس کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا منّتیں ماننا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات کا طواف، وہاں میلہ لگانا، تہوار منانا، گانا بجانا اور چراغاں کرنا، اور مختصر الفاظ میں ان کو قبلہ و کعبہ اور ملجا و ماویٰ سمجھنا، کوئی ایسا واقعہ اور منظر نہ تھا جس کو دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت دیر انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی، شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیئے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کے دفع کرنے میں ارواح خبیثہ اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضا جوئی اور خوف چیچک کی بیماری میں سیتلا کی تعظیم، اولیاء و صالحین کے لئے منّتیں ماننا اور قربانیاں کرنا، اولیاء اور نیک بیبیوں کے نام سے روزے کی نیت کرنا اور ان سے اپنی حاجت براری اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا، اور اس سلسلہ میں خاص دن خاص کھانے (بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ) اور ان میں خاص آداب کی پابندی، یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں جن کے ماتحت توہمات، عقائد فاسدہ، رسوم جاہلیت اور التزامات اور پابندیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش، اور سالار بخش، نام عام تھے۔

ایک بڑے دائرہ میں عقیدۂ توحید اس مفہوم میں محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان اور کائنات کا حقیقی خالق اور صانع ہے، اور وہی معبود حقیقی ہے، اور بڑے بڑے امور وہی انجام دیتا ہے لیکن اس نے سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اور محکمے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں، جو ان کے مالک و مختار ہیں، اور سیاہ سپید کرتے رہتے ہیں، اب ان کو راضی کئے اور ان سے رابطہ قائم کئے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کامیابی اور کار براری نہیں ہو سکتی، شرک صرف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور ہستی کو اس دنیا کا صانع و خالق اور مالک حقیقی سمجھا جائے،

اور اس کو براہ راست عبادت و سجدہ کا (بلا توسل اور شفاعت کے خیال کے) مستحق سمجھا جائے۔[1]

غرض بارہویں صدی کا ہندوستان سیاسی، انتظامی، اخلاقی، اور بہت حد تک اعتقادی حیثیت سے انحطاط و پستی کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا، جو اسلامی ملکوں کے زوال، اور مسلم معاشرہ کی پستی کا افسوسناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس مجموعی صورت حال کا نقشہ اپنے ایک مضمون میں بڑی بلاغت و اختصار کے ساتھ کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے، اور اپنے بزرگوں کی مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پُرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب، اور احادیث کے احکامات وارشادات، اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے"۔[2]

---

[1] اس تصور توحید اور نقطۂ خیال کی توضیح، شاہ صاحب کے اعتقادی اصلاح و تجدید کے باب میں تفصیل سے آئیگی وہاں ملاحظہ کی جائے۔ [2] مقالات سلیمانی ص ۳۴

بابِ سوم
شاہ صاحب کے اجداد و والد بزرگوار

شاہ صاحب کے اجداد

شاہ صاحب کے اجداد اولین کا زمانہ (جو شیخ شمس الدین مفتی کے زمانہ سے شہر رہتک میں قیام پذیر رہے) ہندوستان کی علمی و تصنیفی تاریخ کا وہ عہد ہے، جب یہاں تذکرے و تراجم کی تصنیف کا دور عام طور پر شروع نہیں ہوا تھا، زیادہ تر نامور مشائخ طریقت کے انفرادی تذکرے تھے، جن میں محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا تذکرہ سیر الاولیاءؒ (مرتبہ امیر خورد) خاص امتیاز رکھتا ہے، یا صلحاء و مشائخ وقت کے ملے جلے تذکرے تھے، جن میں دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک شاہ محمد بن حسن غوثی مندوی کی گلزار ابرار (جس میں زیادہ تر مانڈو و مالوہ کے صلحاء و مشائخ کا تذکرہ ہے) دوسرے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار، اہل کمال اور نامور اشخاص کے تذکروں کی کمی تھی، جن میں مختلف خاندانوں کے برگزیدہ اشخاص یا مختلف علاقوں کی ممتاز شخصیتوں کا (جو کسی سلسلہ کی بانی یا اس کی اہم کڑی نہیں تھیں) تعارف و تذکرہ ہو، ان تذکروں میں بھی قدرتاً مرکزی یا علاقائی دار السلطنت اور اس کے اطراف، اور ہندوستان کے مرکزی و تاریخی شہروں کی نامور شخصیتوں کا تذکرہ زیادہ ہے، جن کے حالات و کمالات سے واقفیت کے ذرائع مصنف کو

آسانی سے میسّر تھے، شاہ صاحبؒ کا خاندان شیخ شمس الدین مفتی کے وقت سے جدّ بزرگوار شیخ وجیہ الدین کے عہد تک رہتک میں رہا، جس کو یہ مرکزیت واہمیت حاصل نہ تھی، اس لئے ان تذکروں میں بھی ان کے حالات و وقائع عام طور پر نہیں ملتے۔

یہ باب بالکل تشنہ رہتا اور شاہ صاحبؒ کے تذکرہ نویس یا اس خاندان کی تاریخ لکھنے والے کو سخت زحمت پیش آتی، اگر خود شاہ صاحب اپنے اجداد کے تذکرہ میں امداد فی مآثر الاجداد کے نام سے ایک مختصر رسالہ خود قلم بند نہ فرما دیتے[1]، اس میں بھی اجداد اولین کا تعارف و تذکرہ نہایت اجمال واختصار کے ساتھ اور جدّ امجد شیخ وجیہ الدین کا (بوجہ قرب زمانہ اور قلت وسائط) نسبتاً تفصیل کے ساتھ کرایا گیا ہے، انھیں اشارات کو لے کر مصنف حیات ولی مولوی حافظ محمد رحیم بخش مرحوم دہلوی نے اپنی انشا پردازی سے بہت پھیلا کر لکھا ہے، جو کتاب کے ۱۱۳ صفحات میں آیا ہے، انھوں نے شاہ صاحبؒ کے اس بنیادی تذکرہ میں (جو سب سے مستند اور قابل اعتماد ماخذ ہے) دوسری معاصر تاریخوں اور کتابوں سے جو مضامین اضافہ کئے ہیں، ان میں صفحات تو علیحدہ رہے، کتاب اور مصنف کا نام بھی کہیں نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف مآثر الاجداد ہی پر اکتفا کریں گے۔

شجرۂ نسب

شاہ صاحبؒ نے جو فاروقی النسب ہیں، اس رسالہ کے شروع میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اپنا شجرہ نسب درج کر دیا ہے، شمس الدین مفتی جو اس خاندان میں سب سے پہلے رہتک آئے،

---

[1] یہ رسالہ متوسط تقطیع پر دسؔ صفحات میں آیا ہے، اور شاہ صاحبؒ کے پانچ رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے جس کا پہلا رسالہ "انسان العین" ہے..... مطبوعہ مطبع احمدی دہلی، "انفاس العارفین" میں ساتؔ رسائل کا جو اضافہ ہے اس میں بھی شامل ہے۔

اور طرح اقامت ڈالی ان کے ایک بھائی سالار حسام الدین تھے، ان کی اولاد میں شاہ ارزانی بدایونی ایک بزرگ گذرے ہیں، ان کے خاندان کے نسب ناموں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، یہاں پر یہ شجرۂ نسب من وعن درج کیا جاتا ہے۔

"شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ہمایون بن قریش ابن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب[1]"

اس نسب نامہ میں کئی ناموں کے ساتھ "ملک" خطاب آتا ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"یہ زمانۂ قدیم میں تعظیمی لقب تھا، جیسے ہمارے زمانہ میں خان"

خاندان کی ہندوستان آمد

شاہ صاحبؒ کی روایت کے مطابق ان کے خاندان کے پہلے بزرگوار جنھوں نے رُہتک میں قیام اختیار کیا، (اور غالباً وہی ہندوستان میں سب سے پہلے آئے) وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے، ان واسطوں اور پشتوں کی تعداد اور ان کی طبعی اور تقریبی عمروں کے حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان آئے ہوں گے،

[1] الامداد فی مآثر الاجداد مشمولہ مجموعۂ رسائل حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی دہلی، انفاس العارفین مطبوعہ مطبع مجتبائی (۱۳۳۵ھ) میں الامداد فی مآثر الاجداد کا جو نسخہ شامل ہے (ص۱۵۸ ۔ ص۱۶۸) اس میں جو شجرۂ نسب درج ہے اس میں متعدد اغلاط اور نقائص ہیں جو غالباً طباعت کی غلطی اور تصحیح کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، مذکورہ بالا نسخہ مشمولہ مجموعہ رسائل تنہا قابل اعتماد ہے، اور اسی سے شجرہ نقل کیا گیا۔

جب تاتاریوں کے حملہ سے عالم اسلام کا مشرقی حصہ زیروزبر، خاندانوں کی عزتیں برباد، ان کے علمی اندوختے غارت، اور ایران و ترکستان کے نامی گرامی شہر تاراج و بے چراغ ہو رہے تھے، تاریخ فیروز شاہی اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں عراق، ایران، و ترکستان کے شریف و نجیب خاندان اور ذی علم و باکمال خانوادے کثرت سے ہندوستان آئے، جہاں ترکی النسل مسلمان خاندانوں کی حکومت تھی، اور جنھوں نے تاتاری حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر ہندوستانی سرحدوں سے پسپا، اور اس ملک کو نہ صرف ان کی غارت گری سے محفوظ بلکہ اپنی دین پروری اور معارف نوازی سے دارالعلم اور ایک وسیع مدرسہ بنا دیا تھا، جہاں جا بجا درس کے حلقے، یادِ الٰہی اور تزکیۂ نفس کے مرکز، اور اہل قلم اور اہلِ تحقیق کے لئے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرنے کے مواقع تھے[1]

رُہتک کا قیام

ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاہ صاحبؒ کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رُہتک اُس وقت کی نئی اسلامی سلطنت کا ایک اہم شہر، اور مغرب سے دہلی کی طرف آنے والی اسلامی افواج، مجاہدین، داعیانِ اسلام اور مشائخ و علماء کی دہلی سے پہلے کی ایک اہم منزل اور فرودگاہ تھی، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قریش کی نسل سے پہلے جو بزرگ اس شہر میں آئے، اور ان کی وجہ سے اسلامی شعائر کا غلبہ اور کفر و جاہلیت کا زوال ہوا، وہ شیخ شمس الدین مفتی ہی تھے، شاہ صاحب نے ان کی بعض کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کی بزرگی اور اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے باعث استعجاب نہیں، اس زمانہ میں جو صاحب علم و فضل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۱۹-۲۱

مسلمان اس شہر میں قیام کرتا تھا، اس کو قضا واحتساب کا عہدہ اور شہر کا نظم ونسق بھی سپرد ہوجاتا تھا، لیکن اس زمانہ میں اس کو قاضی ومحتسب کے لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔

شیخ شمس الدین مفتی سے شیخ وجیہ الدین تک

شیخ شمس الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں سب سے بزرگ فرد کمال الدین مفتی، ان کے بعد ان کے صاحبزادہ قطب الدین، ان کے بعد ان کے فرزند عبدالملک ان عہدوں پر فائز اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے، ان حضرات کے بعد قضاۃ کا باقاعدہ ان اطراف میں تعیّن ہونے لگا، شیخ عبدالملک کے صاحبزادہ قاضی بدھ نے اپنے خاندان کی اس روایت اور وجاہت کو قائم رکھا، ان کے دو لڑکوں سے ان کی نسل چلی، اس خاندان کی شادیاں رُہتک کے صدّیقیوں اور سونی پت کے سادات میں ہوئیں، شیخ محمود کی (جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جدّ خامس ہوتے ہیں، اور جنھوں نے عہدہ قضا ترک کرکے حکومت کے عہدوں کو سنبھالا) شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی، جن سے ایک صاحبزادہ شیخ احمد پیدا ہوئے، شیخ احمد نے صغر سنی میں رہتک کو خیرباد کہا، اور شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ سونی پت میں بود وباش اختیار کی، شیخ عبدالغنی نے اپنی صاحبزادی سے ان کا عقد کردیا، اور مدت تک ان کی تربیت کی، اس کے بعد وہ رُہتک آئے، اور قلعہ کے باہر ایک عمارت بنائی، اور اپنے اہل تعلق کو مجتمع کیا، ان کے صاحبزادہ شیخ منصور وجاہت شجاعت اور حکومت کے فضائل کے جامع تھے، ان کی پہلی شادی شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے صاحبزادہ شیخ معظم اسم بامسمّٰی اور بارہیبت ووجاہت بزرگ تھے، شجاعت کا بڑا جوہر رکھتے تھے،

واقعات عجیبہ کا ان سے صدور ہوا، شاہ صاحبؒ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ شیخ منصور کی ایک راجہ سے جنگ ہوئی، لشکر کا میمنہ شیخ معظم کے سپرد کیا گیا، اس وقت ان کی عمر بارہ[۱۲] سال کی تھی، سخت معرکہ پیش آیا، اور دونوں طرف کے بہت سے لوگ مقتول ہوئے، اس درمیان میں کسی نے شیخ معظم سے کہدیا کہ ان کے والد شیخ منصور نے شربت شہادت نوش فرمایا، اور لشکر اسلامی کو شکست ہوئی، یہ سن کر ان کی غیرتِ اسلامی اور رگِ فاروقی حرکت میں آئی، وہ مردانہ وار حریف لشکر میں گھس گئے اور صفیں درہم برہم کرتے ہوئے بڑی کوشش کے بعد راجہ کے ہاتھی تک پہونچ گئے، ایک بڑا مخالف سردار مقابلہ میں آیا، انھوں نے تلوار کے ایک وار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے، اس کے ساتھیوں نے شیخ معظم کو گھوڑے پر سے اتار لیا، لوگوں نے ان پر ہجوم کیا، اس راجہ نے سب کو ڈانٹا اور منع کیا، اور کہا کہ ایسا نوعمر ایسی جواں مردی اور جرءت دکھائے' یہ تو عجائبات زمانہ میں سے ہے' راجہ نے ان کے دونوں ہاتھ لے کر چومے اور بڑے احترام سے پیش آیا، اور پوچھا کہ اتنا غصہ کیوں ہے؟ کہا کہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ میرے والد شہید ہو گئے، میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور مخالف لشکر کے سردار کو جب تک ٹھکانہ نہ لگا دوں دم نہ لوں' میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ یا ماروں یا مر جاؤں' راجہ نے کہا جس نے تم کو یہ اطلاع دی اس نے جھوٹ کہا، تمہارے والد زندہ ہیں' اور ان کے جھنڈے وہ نظر آرہے ہیں' اس وقت راجہ نے شیخ منصور کے پاس کسی کو بھیجا کہ ہم نے اِس لڑکے کی خاطر صلح کر لی' اور جو کہا گیا اس کو منظور کیا اور واپس گیا۔

شاہ صاحبؒ اپنے والد صاحبؒ کی زبانی موضع شکوہ پور کے (جو شیخ معظم کی تعلقہ داری میں تھا) ایک معمر زمیندار کی یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ تیس[۳۰] ڈاکو اس گاؤں کے مویشیوں کو لوٹ لے گئے، اس وقت شیخ معظم تنہا وہاں تھے' ان کے عزیزوں اور

فرزندوں میں سے کوئی نہ تھا، ان کو اس واقعہ کی اطلاع کی گئی، اس وقت دسترخوان لگ گیا تھا' اور کھانا چن دیا گیا تھا، انھوں نے کسی عجلت اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا، پورے اطمینان اور معمول کے مطابق کھانے سے فراغت کی، ہاتھ دھوئے' پھر کہا ہمارے ہتھیار اور گھوڑا لے آؤ، جب سوار ہو کر چلے تو زمینداروں میں سے بھی کچھ لوگ ہتھیار لگا کر ساتھ ہوئے، شیخ معظم نے سب کو واپس کیا، اور فرمایا کہ میں اتنی تیزی سے جاؤں گا کہ تم میرے گھوڑے کی گرد کو بھی نہ پہونچو گے، البتہ اس قصہ کے راوی کو جو دوڑنے میں گھوڑے کے برابر تھا، ساتھ لے لیا تاکہ وہ واقعہ کی اطلاع دے سکے، پھر گھوڑا دوڑا کر ان ڈاکوؤں کو جو کئی منزلیں طے کر چکے تھے، جالیا، اور ان کو غیرت دلا کر میدان میں مقابلہ کے لئے اتارا اور تیراندازی شروع کی، ان کی قادر اندازی اور تیرافگنی دیکھ کر اس پورے گروہ پر رعب طاری ہو گیا، انھوں نے فریاد کی کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف کیا جائے، شیخ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ یہ ہے کہ اپنے ہتھیار خود اتارو' ہر ایک دوسرے کا ہاتھ باندھے، اسی حالت میں مویشیوں اور سلاح اور اس دست بستہ گروہ کو گاؤں تک لائے' ان لوگوں کے مذہب کے مطابق ان سے قسم لی کہ اس بستی پر کبھی نظر نہ اٹھائیں گے' انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

شیخ معظم کے سید نور الجبار سونی پتی کی صاحبزادی سے تین صاحبزادے پیدا ہوئے' شیخ جمال شیخ فیروز، شیخ وجیہ الدین، شیخ وجیہ الدین شاہ صاحب کے حقیقی دادا ہیں۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید

شاہ صاحب نے اپنے حقیقی دادا شیخ وجیہ الدین شہید کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں' وہ فرماتے ہیں' ان میں تقویٰ اور شجاعت کی دونوں صفتیں جمع تھیں، والد صاحب (شاہ عبدالرحیم صاحب) فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) نے دن رات میں قرآن کے

ڈو سیپارے پڑھنے کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا جس کو وہ سفر و حضر، اور چستی و کسل مندی دونوں حالتوں میں کبھی ترک نہیں کرتے تھے، جب عمر زیادہ ہوئی اور بصارت کمزور تو خط جلی کا ایک قرآن شریف اپنے ساتھ رکھتے تھے، سفر میں بھی کسی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ اپنے گھوڑے کو کبھی کسی کی کھیتی میں گھسنے نہیں دیتے تھے، خواہ تمام لشکر کاشت کی ہوئی زمین میں گھوڑے دوڑاتا ہو، بعض اوقات اس بناء پر متعارف راستہ سے مشقت برداشت کرکے الگ چلتے، یہ بھی فرماتے تھے کہ کسی جنگ میں اگر سامان رسد کم ہو جاتا، اور کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہ ہوتیں، تو ساتھی گاؤں کے مویشیوں کو زبردستی پکڑ کر کے ان سے اپنی غذا حاصل کر لیتے، لیکن وہ ان سے مجتنب رہتے، جب ڈو تین فاقوں کی نوبت آجاتی، اور قوت جواب دے جاتی تو رزاق حقیقی رزق مہیا فرما دیتا، بعض مرتبہ وہ فکر میں ہوتے، زمین پر چابک پٹختے وہاں سے چنے بقدر خوراک کے نکل آتے، وہ اس کو دھو کر اور پاک کر کے بھگو لیتے اور تناول فرماتے، فرماتے تھے کہ میرے والد کا معاملہ شاگرد پیشہ لوگوں، اور بھوسہ چارہ بیچنے والوں کے ساتھ ایسی نرمی اور انصاف کا تھا کہ بڑے بڑے متقیوں سے بھی ایسا کم دیکھنے میں آیا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک سفر میں انھوں نے بعض آثار ولایت کا مشاہدہ کیا، بیعت کی اور اشغال صوفیہ کے ساتھ مشغول ہوئے، تقلیل کلام اور قلت اختلاط با انام کو (جو صوفیائے باصفا کا شیوہ ہے) اپنا شعار بنایا، اور اس کی ایسی پابندی کی جو اس زمانہ کے صوفیوں میں بھی کم دیکھی گئی ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ والد صاحب ان کی شجاعت کا بہت ذکر کیا کرتے تھے، اس موقعہ پر شاہ صاحب نے والد صاحب کی زبانی ان کی نمایاں شجاعت اور تہوّر کے متعدد واقعات لکھے ہیں، بعض مرتبہ تنہا انھوں نے پورے پورے گروہ کا مقابلہ کیا، وہ لشکر شاہی میں مالوہ تک تشریف لے جاتے تھے، اپنے زمانہ کے اچھے اچھے شہ سواروں اور سورماؤں سے انھوں نے مقابلہ کیا،

اور بعض مرتبہ اپنے ساتھیوں یا افسروں کو جو مخالف کی زد میں آگئے تھے، عین موقعہ پر بچا لیا، ایک مرتبہ انھوں نے تین[۳] جنگ آزما مبارز طلبوں کو جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، زیر کیا، وہ فنون سپہ گری میں طاق تھے[۱]۔

جنگِ برادران میں وہ عالمگیر بادشاہ کے ساتھ تھے، جب شاہ شجاع نے بنگالہ میں خروج کیا تو وہ عالمگیر کے لشکر میں تھے، اور انھوں نے کارنمایاں انجام دیا، اور ولی نعمت کے ساتھ پوری وفاداری اور استقامت کا ثبوت دیا[۲]، ان کی مردانگی سے اس معرکہ میں عالمگیر کو فتح ہوئی، فتح کے بعد بادشاہ نے چاہا کہ منصب میں اضافہ کر دے، انھوں نے از روئے استغنا قبول نہیں کیا، بعض مرتبہ انھوں نے اپنے خاص احباب و رفقاء کے ساتھ حق دوستی ادا کیا اور خطرہ مول لے کر ان کی امداد کی[۳]، شاہ عبد الرحیم صاحب نے ان کی قوت قلبی، بلند ہمتی اور مہم جوئی اور خطر پسندی کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، اسی کے ساتھ ان کی ہمدردی و دل جوئی اور غریب پروری کے واقعات بھی لکھے ہیں۔

شیخ وجیہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمد کی دختر نیک اختر سے ہوئی، شیخ رفیع الدین قطب العالم کے فرزند تھے، اور وہ حضرت شیخ عبد العزیز شکر بار[۴] کے صاحبزادہ، ان کے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، آثار الاجداد ص ۶-۷ [۲] ایضاً ص ۸ [۳] ایضاً ص ۸-۹

[۴] شیخ عبد العزیز عباسی جونپوری ثم دہلوی (۸۹۸ھ - ۹۷۵ھ) کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہے، شیخ قاضی خاں ظفر آبادی اور شیخ تاج محمود جونپوری سے طریقۂ چشتیہ میں اجازت حاصل تھی، بے نفسی اور تواضع کا پیکر تھے، اور اخلاق عالیہ سے متصف، وحدۃ الوجود کا مذاق رکھتے تھے، خطوط میں اپنے نام سے پہلے "ذرّۂ ناچیز" لکھا کرتے تھے، (جس سے ان کے مذاق کا اظہار ہوتا ہے) عجیب اتفاق ہے کہ اسی سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے "فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۝" (یٰسٓ - ۸۳) پر طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ان کے حالات میں رسالہ "النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ" اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ باختصار)

تین صاحبزادے پیدا ہوئے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالرحیم، شیخ عبدالحکیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) ایک شب تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، ایک سجدہ میں اتنی دیر تک سربسجود رہے کہ خیال ہوا کہ شاید روح پرواز کرگئی، جب سر اٹھایا تو آپ سے اتنی دیر تک ساکت وصامت پڑے رہنے کے بارے میں میں نے دریافت کیا، فرمایا غیبوبت کی حالت پیدا ہوگئی تھی، اس میں شہید کے درجہ اور ثواب کا حال معلوم ہوا، میں نے حق تعالیٰ سے شہادت کی تمنا کی اور اس میں اتنے الحاح وزاری سے کام لیا کہ اس کی قبولیت کا انکشاف ہوا، دکن کی جانب اشارہ ہوا کہ وہ شہادت کی جگہ ہوگی، والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اگرچہ فوج کی ملازمت ترک فرمادی تھی، اور اس شغل سے طبیعت کو نفرت ہوگئی تھی، لیکن از سرنو اسباب سفر مہیا کئے، گھوڑا خریدا اور دکن کی جانب متوجہ ہوئے، ان کا خیال تھا کہ یہ واقعہ سیوارا میں پیش آئے گا، جو اس وقت سلطنت اہل اسلام کے حدود سے خارج تھا، اور وہاں کا حاکم مسلمانوں کے قاضی کے ساتھ بڑی بے حرمتی کے ساتھ پیش آیا تھا، لیکن جب برہانپور پہونچے تو وہاں منکشف ہوا کہ شہادت کی جگہ تو پیچھے چھوڑ آئے، وہیں سے واپس ہوئے، راستہ میں بعض سوداگروں کی جو صلاح وتقویٰ سے آراستہ معلوم ہوتے تھے، صحبت وہمراہی اختیار کی، قصبہ ہنڈیا سے چاہتے تھے کہ ہندوستان واپس آئیں کہ ایک دن ایک ضعیف العمر آدمی ملا کہ افتاں وخیزاں بھاگا جاتا تھا، ان کو اس کے حال پر رحم آیا، انھوں نے وجہ پوچھی، کہا کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں، فرمایا، روزانہ تین پیسے ہماری ملازمت سے لے لیا کرو، وہ بڈھا اصل میں کفار کا جاسوس تھا، جب نوبزیا کی سرائے میں پہونچے تو جاسوس نے اپنے ساتھیوں کو خبر کردی (کہ سوداگروں کا قافلہ اس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے) ڈاکوؤں کی ایک جماعت کثیر اس سرائے میں آئی، شیخ وجیہ الدین اس وقت تلاوت میں مشغول تھے، ان میں سے دو تین آدمی سامنے آئے

اور کہا کہ وجیہ الدین کون ہیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ہوں، انھوں نے کہا کہ تم سے ہمیں کوئی کام نہیں ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ مال نہیں، اور تمہارا ہمارے گروہ میں سے ایک پر حق نمک بھی ہے لیکن ان سوداگروں کو جن کے پاس ساز و سامان ہے ہم نہیں چھوڑیں گے، چونکہ آپ کی غرض اصلی ہی اس سفر سے شہادت تھی، آپ رفاقت چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے، اور حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگئے، آپ کو بائیس ۲۲ زخم آئے، آخری زخم میں سر مبارک جسد سے جدا ہو گیا، اس حالت میں بھی دیر تک تکبیر زبان پر جاری رہی، اور کچھ دور کفار کا تعاقب بھی کیا،[۱] بالآخر ایک جگہ گرے اور وہیں مدفون ہوئے، اللہ تعالٰی نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ واقعہ دکھایا، انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے زخم دکھا رہے ہیں، شاہ صاحب نے جسد مبارک کو منتقل کرنے کا ارادہ بھی کیا، مگر اشارۂ غیبی نے ان کو اس سے باز رکھا۔

شاہ صاحب کے نانا شیخ محمد پھلتی

شاہ صاحب کے نانا حضرت شیخ محمد پھلتی[۲] تھے، ان کے خاندان کا وطن اول سنّور ہے،[۳] سلطان سکندر لودھی کے زمانہ میں یہ خاندان پھلت منتقل ہوا، آپ کے والد کا نام شیخ محمد عاقل تھا، وہ بچپن سے بڑے ہونہار اور زمانہ کے صلحا اور اہل دل کے منظور نظر تھے حضرت سید آدم بنوری کے خلیفہ شیخ جلال نے ان کی ولادت پران کے مراتب عالیہ کی بشارت دی تھی، تعلیم انھوں نے اولاً شاہ صاحب کے چچا شیخ ابوالرضا محمد بن شیخ وجیہ الدین سے حاصل کی، اس کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پاس گئے، ان سے بڑی مناسبت معلوم ہوئی، وہاں سے علم کی تحصیل کر کے

---

[۱] ایسے واقعات بعض اور شہداء کے متعلق بھی کتابوں میں دیکھنے میں آئے ہیں۔ [۲] ان کے حالات میں شاہ صاحب کا مستقل رسالہ "العطیۃ الصمدیۃ فی الانفاس المحمدیۃ" کے نام سے اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے [۳] حال ضلع بارہ بنکی۔

پھر پھلت واپس آئے، بذل و سخا، خود شکنی و فنا میں پایہ بلند رکھتے تھے، قوی التاثیر و صاحب ارشاد تھے، شاہ صاحب نے ان کی اپنے استاد و مربّی شاہ عبدالرحیم صاحب کے ساتھ اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا کے متعدد واقعات لکھے ہیں[۱]، ان کو شاہ صاحب سے اجازت بھی حاصل ہوئی، ان کے صاحبزادہ شیخ عبیداللہ تھے، جو شاہ صاحب کے ماموں اور خسر، اور شاہ صاحب کے خلیفۂ اجل حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے والد نامدار تھے[۲]، شاہ صاحب نے حضرت شیخ محمد پھلتی کی قوت تاثیر اور افادہ و افاضہ کے متعدد واقعات لکھے ہیں[۳]، شیخ محمد کی وفات ۸ جمادی الآخرہ ۱۱۲۵ھ کو ہوئی[۴]۔

شاہ صاحب کے عم محترم شیخ ابوالرضا محمد

حضرت شیخ ابوالرضا محمد حضرت شیخ وجیہ الدین کے فرزند اکبر اور شاہ صاحب کے بڑے چچا ہیں، شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کے بعد ان کا مستقل تذکرہ لکھا ہے، ان کو امام الطریقۃ والحقیقۃ کے بلند الفاظ سے یاد کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک (اگرچہ انھوں نے اساتذۂ وقت سے تعلیم پائی تھی) ان کے علوم زیادہ تر وہبی تھے، اپنے والد صاحب کی اجازت و ایماء سے ایک امیر کی سرکار میں آمد و رفت شروع کی، کہ ناگاہ جاذبۂ توفیق الٰہی نے ان کو اس سے باز رکھا اور تجرید تام اور توکّل کلّی اور عمل بالسنّۃ کو اپنا شعار بنایا، زوجۂ محترمہ کو بھی "اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا"[۵] پر عمل کرتے ہوئے اختیار دیا کہ اگر فقر و فاقہ برداشت ہے تو ہمارے ساتھ رہو، ورنہ میکہ چلی جاؤ، انھوں نے بھی

---

[۱] ص ۲۰ [۲] حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶

[۳] ص ۲۲-۲۵ [۴] ص ۲۵ [۵] الاحزاب - ۲۸

ازواج مطہرات کی سنت پر عمل کرتے ہوئے فقر وفاقہ کو ترجیح دی، اور رفاقت نہیں چھوڑی، اکثر متواتر دو دو تین تین فاقے ہوجاتے، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبتِ خاص حاصل تھی، اور سیدنا علی مرتضیٰ سے محبتِ خاص اور مناسبت باختصاص حاصل تھی[1]، عالمگیر بادشاہ نے کئی مرتبہ زیارت کا ارادہ کیا قبول نہیں فرمایا، امراء واہل دُوَل کی طرف بالکل التفات نہیں تھا، البتہ جوتے بنانے والوں، اور لپائی کا کام کرنے والوں اور ایسے ہی پیشہ وروں کی طرف بڑی توجہ فرماتے تھے، اگر وہ چار پانچ پیسے ہدیۃً نذر کرتے تو بڑی خوشی سے قبول فرماتے۔

شاہ صاحب نے ان کے تعارف میں قوی العلم، فصیح اللسان، عظیم الورع، وسیع المعرفہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، زیبا صورت، طویل القامت تھے، رنگ گورا، داڑھی ہلکی، نرم کلام تھے، جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کہتے تھے، اور تین حدیثیں زبانی سناتے تھے، پھر فارسی میں اس کے بعد ہندی (ریختہ) میں ان کا ترجمہ کرتے تھے، اور ان احادیث کے مطالب پر روشنی ڈالتے تھے، لیکن اعتدال واختصار کے ساتھ، پہلے ہر فن کی ایک کتاب پڑھاتے تھے، اور لوگ ان کی تقریر کے ذوق میں بہت جمع ہوجاتے تھے، آخر میں صرف دو سبق رہ گئے تھے، ایک بیضاوی کا ایک مشکوٰۃ کا، وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اور اس بارے میں صاحبِ تحقیق تھے، صوفیا کے متعلق ملفوظات کی خوب شرح کرتے تھے، مستجاب الدعوات تھے، شاہ صاحب نے ان کی محبوبیت واجتبائی شان کے بہت سے واقعات لکھے ہیں[2]، سنتوں کے ادا کرنے کا بڑا اہتمام تھا، ہندی کے عارفانہ دوہے کبھی کبھی پڑھتے تھے، شاہ صاحب نے ان کے کشف وکرامات کے متعدد واقعات لکھے ہیں[3]، شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں، جن کا سمجھنا اور

---

[1] انفاس العارفین ص۸۶-۸۸ [2] ایضاً ص۸۹-۹۰ [3] ایضاً ص۹۰-۹۴

ان سے فائدہ اٹھانا بھی اس زمانہ میں مشکل ہے اس لئے ان کو ترک کیا جاتا ہے[۱]، عمر پچاس[۵] اور ساٹھ[۶] کے درمیان تھی، کہ ۷ ارمحرم الحرام ۱۱۰۱ھ کو نماز عصر کے بعد سفر آخرت اختیار کیا' آفتاب کے لفظ سے تاریخ وفات نکلتی ہے[۲]۔

والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیم رح

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کے حالات' کمالات و کرامات میں خود ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے' جس کا نام عربی میں "بوارق الولایۃ" اور مشہور نام "انفاس العارفین[۳]" ہے' ایک باکمال فرزند کے قلم سے باکمال پدر بزرگوار کے حالات میں مؤرخانہ اور ذمہ دارانہ طریقہ پر مستقل کتاب لکھنے کی اسلام کی علمی تاریخ میں زیادہ مثالیں نہیں ملتیں' اس سلسلہ میں علامہ تاج الدین سبکی کا اپنی شہرۂ آفاق کتاب "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" میں اپنے والد نامدار علامہ شیخ تقی الدین السبکی کا مفصل تذکرہ[۴] اور فخر المتاخرین ابو الحسنات مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کا اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الحلیم لکھنوی کے حالات میں مستقل رسالہ "حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم" کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں سے زیادہ تر وہ حالات و واقعات انتخاب کئے جائیں گے' جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں' اور جن سے ان کے علمی' دینی اور روحانی پایہ کا کچھ اندازہ

۱؎ انفاس العارفین ص ۹۴-۱۱۹   ۲؎ ایضاً ص ۱۵۵

۳؎ پہلی مرتبہ مطبع احمدی دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی دوبارہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی حوالے اسی لئے مذکر طباعت پیش نظر ہے   ۴؎ یہ باریک ٹائپ کے ۱۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے اور خود شاہ صاحب کی زندگی اور رجحان اور مزاج و مذاق کی تشکیل میں انھوں نے جو بنیادی کردار ادا کیا ہوگا، اس کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، کرامات و کشوف، روحانی تجربات و ترقیات کا (جس کا وہ خاص دور اور صاحب تذکرہ کو اس سے خاص مناسبت تھی) زیادہ ذکر نہیں کیا جائیگا کہ ان کا فہم و ادراک بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے، اس کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع مناسب ہوگا، صرف اجمالاً اتنا لکھنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے حالات ایک اعلیٰ روحانی استعداد اور فطری و باطنی کمال پر دلالت کرتے اور اولیائے متقدمین کی یاد تازہ کرتے ہیں، جن کی استعدادیں نہایت قوی، زمانہ نہایت مساعد اور ماحول نہ صرف سازگار بلکہ محرّک و مشوّق تھا، اور "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ[1]" کے بموجب اس میدان میں اللہ تعالےٰ کی قدرت، اس کی تربیت، اور اس کی تجلّیات کا ظہور تھا، اور "كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ مِنْ عَطَاۗءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَاۗءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا[2]" (ان کو اور ان کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے بھر بھر کر دیتے ہیں اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رکی ہوئی نہیں ہے) کی تفسیر۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا (جو خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے) شیخ رفیع الدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا اثاثہ اپنے وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا، اپنی اولاد میں ہر ایک کو اس کے حسب حال سامان دیا، شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں، جب ان کی باری آئی تو ان کو طریقت کے فوائد و اوراد اور مشائخ کا شجرہ عنایت فرمایا، شاہ رفیع الدین صاحب کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ ابھی اس بچی کی شادی بھی نہیں ہوئی، اس کو جہیز کا سامان دینا چاہئے تھا، نہ کہ یہ رسائل، فرمایا کہ یہ رسائل ہمیں اپنے بزرگوں سے ترکہ میں ملے ہیں، اس بچی کا ایک فرزند ہوگا جو ہماری اس معنوی میراث کا مستحق ثابت ہوگا، جہاں تک

---

[1] سورۃ الرحمٰن ــ ۲۹ [2] سورۃ الاسراء ــ ۲۰

جہیز و شادی کے سامان کا تعلق ہے، اللہ اس کا انتظام فرمائے گا، ہمیں اس کی فکر نہیں، شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں پیدا ہوا، اور کچھ سیانا ہوا تو میری نانی نے وہ سامان میرے حوالہ کیا، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا[1]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کی ولادت کا سنہ کہیں صراحتاً نہیں ملتا، لیکن چونکہ انھوں نے سنہ ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی، اور ۷۷ برس کی عمر ہوئی، اس لئے سنہ ولادت سنہ ۱۰۵۴ھ ہونا چاہیئے[2]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب تین[3] بھائی تھے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالحکیم اور شاہ عبدالرحیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں صغر سنی ہی میں سر پر پگڑی باندھ کر سر بہ زانو بیٹھتا، وضو میں تمام اعضاء کو پورے طور پر دھوتا، اور وضو کی سنتوں کا اہتمام کرتا، میرے ماموں شیخ عبدالحی جو خود صالح بزرگ تھے، دیکھ کر خوش ہوتے، اور فرماتے کہ اس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اسلاف کی یہ دولت ہماری نسل میں باقی رہے گی، اگر پوتوں کو نہ ملی تو کیا حرج ہے، نواسے اس کے حامل و محافظ ہوں گے[3]۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کی بچپن ہی سے طبیعت دین کی طرف مائل اور دنیا کی دولت و عزت سے اچاٹ تھی، جو بزرگ کوئی ایسا وظیفہ بتانا چاہتے جس سے دنیا کا کوئی مقصد حاصل ہوتا، اس کی طرف توجہ نہ کرتے، اور کہتے مجھے اس کی ضرورت نہیں، ایک نقشبندی بزرگ نے جن کا نام خواجہ ہاشم تھا، اور بخارا سے تشریف لا کر شاہ صاحب کے محلہ ہی میں فروکش تھے، ان کی طبیعت کا یہ انداز دیکھ کر ان کو اسکتات[4] کا

---

[1] انفاس العارفین ص ۴۲ [2] ایضاً ص ۸۵ [3] ایضاً ص ۴۲

[4] مشائخ لوح دل پر اللہ کا نام نقش کرنے کے لئے کاغذ پر اسم ذات کو کثرت سے لکھواتے ہیں، تاکہ وہ ذہن پر منقش ہو جائے، یہ یاد الٰہی کے لئے ایک طریقۂ علاج تھا۔

طریقہ تلقین کیا، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ مجھ پر اس کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں نے ملا عبدالحکیم کا حاشیہ (یہ شرح عقائد پر ملا عبدالحکیم کا حاشیہ ہے) نقل کرنا شروع کیا، پورے ایک جزء پر اسم ذات لکھتا چلا گیا، اور مجھے شعور نہ ہوا۔[1]

شاہ صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ شیخ عبداللہ مشہور بخواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جو بڑے عارف تھے، بعض غیبی اشارات اور روحانی بشارات کی بناء پر انھوں نے ان سے بیعت کی درخواست کی، انھوں نے خیر خواہانہ مشورہ دیا کہ سید آدم بنوریؒ کے خلفاء میں سے کسی ایسے شیخ سے جو تشرّع اور ترک دنیا اور تہذیب نفس میں راسخ القدم ہو اس سے بیعت کرلو، میں نے کہا کہ ہمارے جوار میں حضرت کے خلفاء میں حافظ سید عبداللہ[2] تشریف رکھتے ہیں، فرمایا بہت غنیمت ہیں، جلد ان سے بیعت ہوجاؤ، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ ان پر اخفاء وخمول (بے نشانی) کا غلبہ تھا، انھوں نے پہلی درخواست پر بیعت فرمالیا، میں دونوں بزرگوں خواجہ خورد اور سید عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض، حافظ سید عبداللہ کی بھی توجہ من جانب اللہ شاہ عبدالرحیم صاحب کی جانب تھی، ایک مرتبہ فرمایا، تم بچہ تھے، اور بچوں میں کھیل رہے تھے، میری طبیعت کی تمہاری طرف کشش ہوئی، میں نے دعا کی کہ خدایا اس بچہ کو اولیاء میں شامل فرما، اور اس کا کمال میرے ہاتھ سے ظاہر ہو، الحمدللہ کہ اس دعا کا ثمرہ ظاہر ہوا۔[3]

تعلیم

شاہ عبدالرحیم صاحب نے چھوٹے رسائل سے شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے برادر بزرگ

---

[1] ایضاً ص۵ [2] حافظ سید عبداللہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" از ص۶-۱۵ [3] ایضاً ص۱۱

ابوالرضا محمد سے پڑھے، بقیہ کتابیں مرزا زاہد ہروی (مشہور بہ میر زاہد) سے پڑھیں، فرماتے تھے کہ "شرح مواقف" اور اصول کی ساری کتابیں مرزا زاہد سے پڑھیں، ان کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی، یہاں تک کہ اگر میں کسی دن کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تو فرماتے کہ ایک دو سطر پڑھ لو، تاکہ ناغہ نہ ہو، خواجہ خورد سے بھی حاشیہ خیالی وغیرہ کے مشکل مقامات میں رجوع کیا اور تشفی ہوئی، بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی کتاب کا ابتدائی حصہ پڑھا اور آخر تک اس کا درس خود دیا، خواجہ خورد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا شیخ رفیع الدین کے شاگرد تھے، اور خواجہ خورد نے ان سے علمی و باطنی دونوں طرح کا استفادہ کیا تھا، اس لئے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

حافظ سید عبداللہ کی وفات کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب نے سلسلۂ ابوالعلائیہ احراریہ کے ایک بلند مرتبہ خلیفہ شیخ ابوالقاسم اکبر آبادی[1] سے رجوع کیا، امیر نورالعلا سے بھی استفادہ کیا، خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ صاحب کو اجازت بھی دی، خلیفہ صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب کی تعظیم اور خصوصی خیال اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کو شاہ عبدالرحیم صاحب کے جدّ مادری شیخ عبدالعزیز شکر بار سے بھی خصوصی نسبت تھی۔

شاہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں شاہ عبدالرحیم صاحب کے اپنے زمانہ کے مشائخ و اولیاء اور مجاذیب سے ملاقاتوں، ان کی توجہ خصوصی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں کہ

---

[1] شیخ ابوالقاسم شیخ ولی محمد نارنولی کے خلیفہ تھے، اور وہ امیر ابوالعلاء حسینی اکبر آبادی کے، شیخ ابوالقاسم نے ابوالعلاء کا زمانہ پایا، اور ان کی صحبت اٹھائی، لیکن اجازت شیخ ولی محمد نارنولی سے پائی، وفات ۱۰۸۹ھ، واضح رہے کہ ابوالعلائی احراری سلسلہ میں چشتیت و نقشبندیت کا امتزاج ہے، کالپی کا مشہور سلسلہ جس کے شیخ سید محمد ترمذی تھے، اس سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۲۲)

یہ زمانہ جذب وسلوک، خدا طلبی، عشق الٰہی، اور درویشی کا گویا موسم بہار تھا، اور ایسے حضرات کی کثرت تھی، جو اس کا ذوق رکھتے تھے، اور روحانی اور باطنی کمالات سے آراستہ تھے[1]، اور انھوں نے شاہ صاحب پر خاص توجہ فرمائی، اور ان سے شاہ صاحب کی اچھی صحبتیں رہیں، شاہ صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے کشف ارواح وغیرہ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، جن سے ان کی باطنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے[2]، اسی طرح ان کے اشراقات اور کرامات کے واقعات درج کئے ہیں[3]، اس کے بعد شاہ صاحب نے بہت تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں[4]، ملفوظات سے ان کی دقتِ نظر، غیر معمولی ذہانت، اور اعلیٰ استعداد علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، والد صاحب کا عمل اکثر امور میں مذہب حنفی کے موافق تھا، لیکن بعض مسائل میں حدیث کے مطابق یا اپنے وجدان سے کسی دوسرے مذہب فقہی کو بھی ترجیح دیتے تھے، ان تفردات یا استثناءات میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا، جنازہ میں بھی سورہ فاتحہ پڑھنا تھا۔

کم سنی سے خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے روحانی وعلمی استفادہ اور ان کی شخصیت و باطنی کمالات سے متاثر ہونے، نیز خواجہ ابوالقاسم اکبرآبادی سے بھی روحانی تربیت حاصل کرنے کی بنا پر (جو اس سلسلۂ ابوالعلائیہ میں صاحبِ اجازت تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے واسطہ کے بغیر خواجہ عبید اللہ احرار اور سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار تک پہونچتا تھا) نیز انھوں نے امیر نورالعلاء بن امیر ابوالعلاء

---

[1] ملاحظہ ہو "ذکر ملاقات حضرت ایشاں با سائر اہل اللہ از مجاذیب وغیر آں"، ص ۲۹-۳۴

[2] ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" ص ۳۵-۵۰ [3] ایضاً ص ۵۰-۶۵ [4] ایضاً ص ۶۶-۸۵

اکبر آبادی سے بھی استفادہ کیا تھا، شاہ عبدالرحیم صاحب پر حضرت سید آدم بنوری کی نسبت خاص کے مقابلہ میں جو مسلک وحدۃ الشہود میں راسخ القدم تھے، حضرت خواجہ باقی باللہ کی نسبت غالب تھی، جو عرصہ تک توحید وجودی کے ذوق و مسلک پر رہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے بالکلیہ انقطاع عمل میں آیا، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کے قریب کے اجداد مادری میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکربار (م ۹۷۵ھ) بھی گزرے ہیں جن پر توحید وجودی کا غلبہ تھا، ان موروثی و تربیتی اسباب کی بنا پر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب توحید وجودی کا ذوق اور شیخ اکبر سے عقیدت، اور ان کی تحقیقات سے ایسا ذوق و شغف رکھتے تھے، جو جادۂ شریعت اور دائرۂ علم سے متجاوز نہیں ہونے پاتا تھا۔[1]

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ والد صاحب شیخ محی الدین ابن عربی کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے، فرماتے تھے اگر میں چاہوں تو فصوص الحکم کا منبر پر کھڑے ہو کر بیان کروں، اور اس کے تمام مسائل کو آیات و احادیث کے ساتھ مبرھن کروں، اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو شبہ نہ رہے، لیکن اسی کے ساتھ وحدۃ الوجود کی صراحت کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ اس زمانہ کے اکثر لوگ اس کو سمجھ نہیں سکیں گے، اور الحاد و زندقہ کے گڑھے میں گر جائیں گے۔

شاہ عبدالرحیم صاؒ فتاویٰ عالمگیری کو ترتیب دینے والی جماعت علماء میں شامل تھے، جو ملک کے ممتاز ترین فقہ حنفی کے عالم و صاحبِ نظر و صاحبِ درس فقیہ تھے، اس جماعت کے نگراں کار اور صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اس کام پر دو لاکھ روپیہ صرف کیئے[2]، مصنف "الثقافة الاسلامية في الهند" نے بڑے تفحص و تحقیق

---

[1] شاہ عبدالرحیم صاحب کے اس ذوق نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک منتقل ہو کر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق کا رنگ اختیار کر لیا۔ [2] اس زمانہ کے لحاظ سے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں ہوں گے۔

کے بعد اس کے مرتبین کے نام درج کئے ہیں، جن کی تعداد اکیس ۲۱ ہوتی ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بھی اس جماعت کے ایک رکن تھے[1]۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "انفاس العارفین" میں لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بڑا اہتمام تھا، ملا نظام (افسر سر رشتۂ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے، ایک دن انھوں نے وہ حصہ پڑھا جو ملا حامد کے سپرد تھا، انھوں نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کر کے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی، شاہ عبدالرحیم صاحب (جو ان کے دوست تھے) کی نظر جب اس مقام پر پڑی تو اس کی تحقیق کی معلوم ہوا کہ دو کتابوں کی مختلف المعنی عبارتیں جمع کر دی ہیں، آپ نے مسودہ کے حاشیہ پر عربی کی عبارت لکھدی کہ "من لم یتفقّہ فی الدین قد خلط فیہ، ھذا غلط وصوابہ کذا" (یعنی تفقّہ نہ ہونے کی وجہ سے کاتب سے یہاں خلطِ مبحث ہو گیا ہے، صحیح یوں ہے۔)

ملا نظام نے متن کی عبارت کے ساتھ شاہ عبدالرحیم صاحب کا حاشیہ بھی پڑھ دیا، وہ تو روانی میں پڑھتے گئے، لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سنتے تھے، چونک پڑے اور فرمایا "ایں عبارت چیست"؟ ملا نظام گھبرائے کہ انھوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا، پھر سنبھل کر کہا کہ میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا، گھر آئے تو ملا حامد سے شکایت کی کہ میں نے یہ حصہ تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمہاری وجہ سے مجھے بادشاہ کے سامنے خفّت اٹھانی پڑی، ملا حامد نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا، شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی، شاہ صاحب نے کتابیں کھول کر ان کو دکھایا کہ عبارت میں خلل اور انتشار پیدا ہو گیا ہے، اس سے بعض معاصرین

---

[1] "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ۔ طبع المجمع العلمی دمشق۔ ص۱۱۱

اور رفقاء کو حسد پیدا ہوا، اور شاہ صاحب کچھ عرصہ اس کام میں شریک ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے۔[1]

اخلاق و شمائل و معمولات

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ خصائل حمیدہ اور اخلاق ستودہ کے جامع تھے، شجاعت و فراست اور غیرت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، عقل معاد کی طرح عقل معاش بھی کامل اور وافر طور پر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں توسّط و اعتدال کو پسند کرتے تھے، زہد و عبادت میں نہ اتنا تعمّق اور غلو تھا کہ رہبانیت سے اس کے حدود مل جائیں، اور نہ اتنی بے تکلفی اور وسعت کہ تساہل تک بات پہونچ جائے، لباس میں تکلف نہیں تھا، نرم اور سخت لباس جو میسر آتا استعمال فرماتے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ ان کو اچھا ہی لباس مرحمت فرمایا، اللہ تعالےٰ ان کی سب ضرورتیں پوری فرما دیتا تھا، بازار جا کر کسی چیز کے خریدنے کی مشکل ہی سے نوبت آتی، امراء اور رؤساء کے گھروں پر تشریف نہیں لے جاتے تھے، اس دروازہ کو کلیۃً بند کر رکھا تھا، ہاں اگر اس طبقہ کے لوگ خود زیارت کے لئے آتے تو آپ بڑی خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آتے، ان میں جو زیادہ معزز ہوتا اس کا اسی طرح اعزاز کرتے، اور اگر وہ نصیحت کی فرمائش کرتے، تو بڑی نرمی کے ساتھ نصیحت فرماتے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے، ہمیشہ علم و علماء کی تعظیم کرتے، جہالت اور جاہلوں سے نفور رہتے، ہر حال میں آثار نبوی کا تتبع کرتے، استقامت کی بات یہ ہے کہ کبھی ساری زندگی بغیر عذر کے جماعت فوت نہیں ہوئی، بچپن و جوانی میں کبھی منہیات کی طرف میلان نہیں ہوا، ضروری امور میں بیع و شراء سے بھی احتراز نہ کرتے، نہ متقشّفہ علماء کی پر تکلف ہیئت کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۲۴

پابندی کرتے، نہ آزاد فقراء وصوفیاء کے بے قید لباس کی، بے تکلف زندگی گذارتے تھے، بغیر ضرورت کے قرض لینا پسند نہیں کرتے تھے، جو لوگ تنعّم و تفکّہ (لذت اندوزی اور لطف) کے لئے قرض لیتے اس کو ناپسند فرماتے اور ملامت کرتے، طب میں بھی ذہن رسا پایا تھا۔

روزانہ ایک ہزار بار درود شریف، ایک ہزار بار نفی اثبات، کچھ حصہ بجہر اور کچھ حصہ خفا کے ساتھ، بارہ ہزار بار اسم ذات روزانہ کا معمول تھا، اپنے بھائی ابوالرضا محمد کے انتقال کے بعد مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین کو سامنے رکھ کر وعظ فرماتے آخر میں تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تھا، زہراوین (سورہ بقر و آل عمران) سے فارغ ہوئے تھے کہ ضعف کا غلبہ ہوا، اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

حمیّت اسلامی

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ میں بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق، اور پدر بزرگوار شہیدؒ (شیخ وجیہ الدین) کی وراثت میں مجاہدانہ جذبات اور حمیت اسلامی پورے طور پر موجود تھی، اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے خاندان والاشان میں نسلاً بعد نسل جہاد و عزیمت کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے پایا تھا، غیرت و شجاعت ان کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی، اگرچہ شخصی و جسمانی طور پر کسی معرکۂ جہاد میں شرکت کا ذکر نہیں ملتا، مگر "انفاس العارفین" میں درج واقعات سے ان کے علوّ ہمت، عمل بالعزیمت اور دینی غیرت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہی دولت ہے، جو ان کی اولاد میں منتقل ہوئی۔

ازدواج واولاد

شاہ عبدالرحیمؒ صاحب کا پہلا نکاح اپنے والد صاحب کی زندگی میں ہوا تھا، جن سے ایک صاحبزادہ صلاح الدین نام پیدا ہوئے، جو کچھ بڑے ہو کر فوت ہو گئے[۱]، زوجہ محترمہ عرصہ تک حیات رہیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شادی کے بعد ۱۱۲۸ھ یا ۱۱۲۹ھ میں وفات پائی[۲]۔

دوسرا نکاح کبر سنی میں بعض بشارات واشارات غیبی کی بناء پر شیخ محمد پھلتی صدیقی کی صاحبزادی سے ہوا، جن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے، شاہ ولی اللہؒ، اور شاہ اہل اللہؒ۔

وفات

۷۷ سال کی عمر میں رمضان میں آخری بار روزے رکھے، شوال میں بیمار ہو گئے، اور امید زیست منقطع ہو گئی لیکن اس کے بعد صحت عود کر آئی لیکن اوائل صفر میں مرض پھر غالب آیا، صبح صادق سے پہلے آثار موت ظاہر ہوئے تو پوری توجہ اس طرف تھی کہ نماز فجر فوت نہ ہو، اس ضعف کی حالت میں کئی بار پوچھا کہ صبح ہو گئی یا نہیں، حاضرین مجلس نے کہا کہ ابھی نہیں ہوئی، جب وقت آخر بالکل قریب آ گیا، تو ان جواب دینے والوں کو سختی سے جواب دیا کہ اگر تمہاری نماز کا

---

[۱] القول الجلی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علاتی بھائی شیخ صلاح الدین جوانی کی عمر تک پہونچے، القول الجلی (قلمی)۔ [۲] شاہ صاحب "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۴ سال کی عمر میں میرے والد نے میرا نکاح کر دیا، اور بڑی عجلت فرمائی، جو لوگ مہلت چاہتے تھے، ان سے فرمایا کہ اس میں مصلحت ہے، شادی کے بعد ہی متعدد خاندانی حادثے پیش آئے کہ ان میں سے کوئی حادثہ پیش آتا تو شادی ملتوی ہو جاتی، ان حوادث میں آخری حادثہ کے طور پر اپنے بڑے بھائی صلاح الدین کی والدہ صاحبہ کی وفات کا ذکر کیا۔ ص۲۔

وقت نہیں آیا تو ہماری نماز کا وقت آگیا، فرمایا میرا رخ قبلہ کی طرف کردو، اس وقت اشارہ سے نماز پڑھی حالانکہ وقت میں شک تھا، اس کے بعد زیر لب اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوگئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ واقعہ چہارشنبہ ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ کا ہے، یہ فرخ سیر کی حکومت کے آخر کا دور ہے، آپ کے انتقال کے بعد فرخ سیر پچاس دن محبوس رہا اور شہر میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، انتقال کے وقت عمر شریف ۷۷ سال تھی[1]

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی اگرچہ کوئی اہم تصنیف جس سے ان کا علمی مرتبہ ظاہر ہو (سوائے ایک رسالہ کے) موجود نہیں، ان کی شہرت زیادہ تر اپنے لائق اور باکمال فرزند ہی کے ذریعہ ہے، اور انھیں نے ان کا تعارف "انفاس العارفین" کے ذریعہ کرایا، جہاں تک علم ہے، ان کے حالات میں ان کے کسی اور مسترشد کی کوئی کتاب نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ کی تصنیفات بالخصوص "انفاس العارفین" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے علوئے مرتبہ، قوتِ باطنی، مقبولیت عنداللہ، اور علم وسلوک میں ان کے مراتب عالیہ سے علیٰ وجہ البصیرۃ اس سے زیادہ معتقد اور متاثر ہیں، جتنا کہ ایک سعادت مند فرزند عام طور پر اپنے باکمال باپ کے کمالات واحسانات کا معترف اور مداح ہوتا ہے، شاہ صاحب کو ان کے کمالات باطنی و علمی کے بارے میں علم الیقین اور وجدانی کیفیت، اور ان کے تذکرہ میں ایک شکر اور سرشاری کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت، کمالات علمی و باطنی کے حصول، اور علم وسلوک میں درجۂ امامت ـــــــ واجتہاد تک پہونچنے میں والد بزرگوار کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۸۳-۸۵

نسبتِ باطنی، قوتِ تاثیر اور شفقت اور دعاؤں کا بڑا حصہ ہے۔

ہندوستان کے عربی النسل خاندان اور ان کی خصوصیات اور روایات

شاہ صاحبؒ کے اجداد کرام کے مختصر تذکرہ سے (جس کا خلاصہ ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے) اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تین[۳] نمایاں صفتیں قدرِ مشترک کے طور پر بالعموم متوارث رہیں۔

۱۔ ایک علم و دین، ورع و تقویٰ، اور قضا و افتاء سے عمومی تعلق[۱]، جو علم و دین سے نسلی و خاندانی مناسبت اور عزیمت و علو ہمت کی بناء پر (جس کو خاندانی روایات و واقعات اور مخلص و بلند ہمت سرپرستوں اور مربیوں کی تعلیم و تربیت غذا پہونچاتی رہتی تھی) بعید از قیاس نہیں، اسلاف کے کارناموں اور ان کی صلاح و تقویٰ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے خاندانوں کی حفاظت فرمائی ہے، اور دولت دین کی حفاظت کا ان میں اسی طرح سے انتظام فرمایا ہے، جیسا کہ ان دُو یتیموں کی دیوار کو اپنے ایک مقبول بندہ کے ذریعہ گرنے سے بچایا اور مستحکم کر دیا، جن کا باپ صلاح و دینداری سے متصف تھا" وَکَانَ اَبُوْھُمَا صَالِحًا"[۲] (ان دونوں کا باپ نیک تھا) ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کی تاریخ اس تسلسل اور حفاظت و عنایتِ خداوندی کی شہادت دیتی ہے، جن میں صدیوں تک علم و دین، قضاء و افتاء، تدریس و تصنیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری و قائم رہا۔

۲۔ دوسری حفظ انساب، خاندانی شجروں کی ترتیب و نگہداشت اور "کفاءت" کا

---

[۱] ظاہر ہے کہ یہ کوئی کُلیّہ نہیں جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہ ہو، شرفاء و اہل فضل کے خاندانوں کی طرح اس کو "اکثریہ" ہی کہا جا سکتا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو سورۂ کہف کی آیات "وَاَمَّا الْجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ (الیٰ) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" (الکہف ۸۲)

وہ معیار و اہتمام جو بلادِ عربیہ اور قدیم اسلامی ممالک میں بھی اس درجہ میں نہیں تھا، غالباً اس کی وجہ دیارِ عجم میں اپنے اس نسب کی حفاظت کا جذبہ (جو یہ خاندان بلادِ عربیہ سے لے کر آیا تھا) اور خود ہندوستان کے طبقاتی نظام اور خاندانی تفاخر کا اثر بھی اس کا باعث تھا، باوجود اس کے کہ شریعت نے اس اہتمام کا مکلّف نہیں کیا ہے، اور اس میں بعد کی صدیوں اور غیر عرب ملکوں میں غلو پیدا ہو گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ نتیجہ ضرور قابلِ لحاظ ہے کہ صدیوں تک ان خاندانوں میں نسلی خصوصیات قائم رہیں، اور وہ عجمی اور غیر اسلامی ملک کے معاشرہ اور تہذیب میں تحلیل نہ ہونے پائے۔

۳۔ تیسری صفت جلادت و شجاعت، سپہ گری کے صفات جس کو عربی میں "فروسیۃ" اور "فُتُوّۃ" (شہ سواری و مردانگی) کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، جو نسل عرب اور قبیلۂ قریش کی نسلی و موروثی صفت ہے، اور جس کے نمونے شیخ معظّم اور شیخ وجیہ الدین کے حالات میں واضح طور پر گذر چکے ہیں، اور اس کا ظہورِ اتم خود شاہ صاحب کے پوتے مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ان نمایاں صفات کے ظہور و توارث کے نفسیاتی و عقلی اسباب بھی ہیں، جو عربی النسل خاندان تاریخ کے مختلف دوروں میں حجاز، عراق، اور ایران و ترکستان سے ہندوستان منتقل ہوتے رہے، ان میں سے اکثر کی ہجرت اور ہندوستان میں توطّن کا سبب یا اپنے دین و ایمان کی حفاظت یا عزت و ناموس بچانے کا جذبہ تھا کہ وہ تاتاری حملہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، یہ مقصد بعد کی کئی پشتوں تک لوگوں کو یاد رہا، اور ان کو بھی اس کی لاج تھی، اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی برکت سے ان کے دینی حالات میں ترقی دی کہ وہ " فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا " (آل عمران۔۱۸۵) کا مصداق تھے۔

یا یہاد فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ کا جذبہ تھا جس کا اس وقت (چھٹی ساتویں صدی ہجری کی دنیا میں) ہندوستان میں سب سے بڑا میدان تھا، اس وسیع ملک کے جس کو برّصغیر کہنا صحیح ہوگا، بہت سے حصے سلطنت اہل اسلام کے ابھی زیرنگیں نہیں آئے تھے، اور وہاں مختلف حاکم وراجہ حکومت کر رہے تھے، اور بعض اوقات احکام شرعی کی تعمیل اور شعائر اسلام کے اظہار میں خلل انداز ہوتے تھے، ان میں سے بہت سے وقتاً فوقتاً سرکشی اور بغاوت بھی کرتے رہتے تھے، ہر جگہ لشکر سلطانی کا پہونچنا مشکل بھی تھا، بیرون ہند سے آنے والے ان شریف ونجیب اور حوصلہ منداور جہادوغزا کے شائق عربی النسل خاندانوں اور ان کے سربرآوردہ افراد کے لئے ان علاقوں کا فتح کرنا اور ان کو مرکزی سلطنت کے حوالہ کرنا ان کی حوصلہ مندیوں کی تسکین کا سامان بھی تھا، دینی جذبات کی آسودگی کا ذریعہ بھی، اور دنیاوی وجاہت وامارت کا وسیلہ بھی، ان کو ان علاقوں میں معافیاں دی جاتی تھیں، ان کے افراد منصب قضا ونیابت پر مامور بھی ہوتے تھے، چنانچہ ان عربی وایرانی النسل خاندانوں کی تاریخوں میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ان کے پیش روؤں نے ہندوستان کے بعض ایسے دور دراز علاقے اور مجہول اور غیر اہم مقامات فتح کئے، جو باقاعدہ ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہو سکے تھے[1]۔

---

[1] اس کی ایک مثال امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی (م ۶۷۷ھ) ہیں جو اودھ کے خاندان قطبی حسنی کے بانی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے جدّ امجد ہیں، وہ غزنی کے راستہ سے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اعزہ وسادات اور غزنی کے رؤسا وشرفاء ومجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دہلی تشریف لائے، دہلی سے پورب کا قصد کیا اور اول قنوج، پھر مانک پور اور کڑہ پر (جو اس زمانہ میں ایک مستقل حکومت کا مرکز تھا) حملہ کیا اور اس تمام علاقے کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ اول ص ۷۹)

ان خاندانوں کو اس کا احساس تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک بلند مقصد کے لئے آئے تھے، ہمارے دین، ہماری تہذیب اور ہماری سعادت کا اصل سرچشمہ مرکزِ اسلام جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس ہے، ہم کو اپنی اس اصل سے کُلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہونا چاہئے، اور اپنے نسلی، تہذیبی، اور اخلاقی امتیازات کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہئے، ہم جب ہی دنیا کے اس دور افتادہ حصہ اور بیگانہ تہذیب و ماحول میں جو اپنے اندر ایسی تحلیلی طاقت اور ایک طرح کا تیزاب رکھتا ہے، جس نے باہر سے آنے والی قوموں اور نسلوں کو اپنے اندر کُلّی طور پر جذب اور ان کی خصوصیات کو فنا اور سوخت کر دیا، محفوظ اور باعزت رہ سکتے ہیں، اس احساس نے ان کے اندر دینی و نسلی غیرت اور خارجی اثرات کے مقابلہ میں غیر معمولی قوتِ مقابلہ پیدا کر دی جس سے ان کی انفرادی شخصیت بہت حد تک محفوظ اور ان کی خصوصیات صدیوں تک نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔

اس حقیقت کا اظہار بڑے واضح طریقہ پر خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اِس وصیت نامہ میں ہوا ہے، جو "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" کے نام سے انھوں نے قلم بند فرمایا، جس میں ان کے مخاطب سب سے پہلے ان کے خاندان کے لوگ ہیں، پھر تمام اہلِ تعلق اور ملت اسلامیہ ہندیہ، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے اجداد نے ہندوستان ہجرت کی، نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لئے دو بڑی فخر کی باتیں ہیں، یہی ہم کو سیّد الاولین والآخرین، افضل الانبیاء والمرسلین، مفخرِ کائنات و فخرِ موجودات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب کرتی ہیں، اس نعمت عظمیٰ کے شکریہ کا تقاضا ہے کہ ہم امکانی حد تک ——

ان عربِ اولین کے عادات و روایات سے یکسر بے تعلق نہ ہونے پائیں جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نشو و نما ہوا تھا، اور عجمیوں کے رسوم اور ہندوؤں کے طور طریق کو اپنے اندر پھیلنے نہ دیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"ہم میں خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان میں کچھ درخور حاصل ہو، صرف، نحو، ادب میں دخل ہو اور حدیث و قرآن سے واقفیت رکھتا ہو، ہمیں حرمین شریفین میں بھی حاضری دیتے رہنا چاہیئے، اور اس سے قلبی وابستگی رہنی چاہیئے، اس میں ہماری سعادت کا راز ہے، اور اس سے اعراض و روگردانی کرنے میں شقاوت و محرومی پنہاں ہے۔"[1]

عربی النسل اور عالی نسب ہونے کے ماسوا اس خاندان کو فاروقیت کا شرف بھی حاصل تھا، دیارِ عجم میں اس خاندان سے اللہ تعالیٰ نے بارہا حفاظتِ دین، شعائرِ اسلام کے اعلاء اور دشمنِ اسلام تحریکوں کے مقابلہ کا مجدّدانہ کام لیا، جس میں فاروقی غیرت کا بھی دخل تھا، اور فاروقِ اعظم سے نسبت و نسبی تعلق کا احساس و افتخار بھی کام کرتا ہوگا، جو ایک طاقتور نفسیاتی محرک بھی ہے، دسویں صدی ہجری میں اسی خاندان کے ایک فردِ فرید نے اکبری فتنہ کا استیصال کیا، اور ہندوستان کو کفر و الحاد، وحدتِ ادیان کے فتنہ اور "نیا دور نیا آئین" نیا ہزارہ" "نئی امامت" کی خطرناک سازش کا شکار بننے سے بچا لیا،[2] حضرت شیخ احمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کو اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ

---

[1] "المقالة الوضية في النصيحة والوصية" فارسی، طبع دہلی ۱۲۶۸ھ

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم صہ ۶۱-۶۳ اور صہ ۱۰۵-۱۰۸

دینی حمیت کو اس کا تقاضہ اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہلِ سنت اور عقائدِ اسلامیہ کے خلاف ایک مشہور عارف و شیخ کی ایک تحقیق سن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"مخدوما! ایں فقیر را تابِ استماع امثال ایں سخنان نیست، بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید"[1]	مخدومی! یہ فقیر اس طرح کی باتوں کے سننے کی تاب نہیں رکھتا، بے اختیار میری فاروقی رگ حرکت میں آجاتی ہے۔

اسی طرح یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمداً ترک کر دیا، تحریر فرمایا:۔

"چوں استماع ایں خبر وحشت انگیز در شورش آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود"[2]	جب اس خبر وحشت اثر سے طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، اور اس نے میری فاروقی رگ کو حرکت دی، یہ چند لفظ میرے قلم سے نکل گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید و احیاء دین کے وسیع اور کثیر الانواع کام میں (جس میں اصلاح عقائد، ردِ شرک و بدعت، اشاعت کتاب و سنت، ترویج فن حدیث، اثبات خلافت خلفاء راشدین، اور رفض و شیعیت کی تردید شامل ہے) یقیناً یہ نسبت اور اس کے شرف و ذمہ داری کے احساس کو بھی دخل ہوگا، جو نفسیات، علم الحیاۃ، اور نسلی اصول و تجربات کے لحاظ سے (جس کے شواہد بکثرت نسلوں اور

---

[1] مکتوب ۱۹۳ دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری۔

[2] مکتوب ۱۵ حصہ ششم دفتر دوم

خاندانوں کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں) ہر طرح قرین قیاس اور مطابق عقل ہے، حدیث میں بھی آتا ہے کہ "الناس معادن کمعادن الذهب والفضة، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا"[1]

[1] لوگ اسی طرح سے (جواہرات کی) کانیں ہیں، جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، جو ان میں جاہلیت کے زمانہ میں بہتر تھے، وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، بشرطیکہ وہ (دین کی) سمجھ حاصل کریں۔

(روایت صحیح مسلم)

بابِ چہارم[۳]

مختصر حالاتِ زندگی[۱]

ولادت

شاہ صاحب کی ولادت چہار شنبہ کے دن ۴ شوال ۱۱۱۴ھ طلوعِ آفتاب کے وقت اپنے نانیہال قصبہ پھلت (حال ضلع مظفر نگر) میں ہوئی، تاریخ ولادت عظیم الدین سے نکلتی ہے[۲]، شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت کے وقت آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی عمر ساٹھ[۶۰] سال تھی، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو اس مبارک فرزند کی ولادت سے پہلے بہت سے مبشّرات نظر آئے تھے، شاہ عبدالرحیم صاحب نے ساٹھ[۶۰] سال کی عمر میں پہلی اہلیہ کی موجودگی میں جو شیخ صلاح الدین کی والدہ تھیں، شادی کا ارادہ کیا، اس میں اشاراتِ غیبی اور بشارات کو دخل تھا، جب شیخ محمد پھلتی کو معلوم ہوا تو

۱۔ خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحبؒ کے قلم سے اختصار کے ساتھ اپنی زندگی کے ضروری حالات، تعلیم و تعلیمی نصاب جو انھوں نے پڑھا، والد صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کے بعض خصوصی انداز، بیعت و اجازت، سفر حجاز اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ، ان کا تعارف و تذکرہ اور زندگی کے بعض اہم واقعات محفوظ ہو گئے ہیں، ان مواد و معلومات کے دو بڑے ماخذ ہیں، "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" اور رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" شاہ صاحبؒ کی زندگی کے مختصر حالات انھیں دونوں کتابوں "الجزء اللطیف" اور "انسان العین" سے ماخوذ اور مقتبس ہیں، کہیں کہیں "انفاس العارفین" اور "القول الجلی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔ الجزء اللطیف ص ۲ مطبوعہ لاہور۔

انھوں نے اپنی صاحبزادی کو نکاح میں دینے کا فیصلہ کیا[۱]، اور اوائل ۱۱۱۴ھ میں یہ مبارک عقد ہوگیا۔

"القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسم گرامی فخر النساء تھا، اور وہ علوم دینیہ میں ایسا درک رکھتی تھیں، جس کا خواتین کو بہت کم موقعہ اور شرف حاصل ہوتا ہے، کتاب کے مصنف شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، جو ان کے حقیقی بھائی کے فرزند تھے، وصاحب البیت أدری بما فیہ:-

والدۂ شریفۂ شاں کہ بعلم شریعت از تفسیر و حدیث عالمہ، و بآداب طریقت متادبہ، و باسرار حقیقت عارفہ، و بمصداق اسم خود فخر النساء بودند۔[۲]

آپ کی والدۂ ماجدہ تفسیر و حدیث جیسے علوم شرعیہ کی عالم، آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ، اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے والی، اور ان وجوہ سے حقیقتاً طبقۂ اناث کے لئے باعث فخر اور اسم با مسمّٰی تھیں۔

ولادت سے پہلے شاہ عبد الرحیم صاحب نے خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ کی خواب میں زیارت کی انھوں نے فرزند کی بشارت دی، اور فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر قطب الدین احمد رکھنا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میری ولادت ہوئی تو والد صاحب کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی، اور انھوں نے ولی اللہ نام رکھا، کچھ مدت کے بعد یاد آیا تو میرا دوسرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا۔[۳]

شاہ صاحب ساتؔ سال کے تھے کہ والدین کے ساتھ تہجد میں شریک ہوئے، اور دعا کرتے وقت ان دونوں کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دیئے، اور اس طرح وہ خواب پورا ہوا، جو ان کے والد ماجد نے ان کی ولادت سے قبل دیکھا تھا۔[۴]

---

[۱] انفاس العارفین ص۶۲-۶۳ [۲] القول الجلی (قلمی) محفوظ کتب خانہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری [۳] انفاس العارفین ص۲۴۴ [۴] ایضاً ص۶۳

تعلیم

شاہ صاحب کی عمر جب پانچ[۵] سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کئے گئے[۱]، سات[۷] سال کی عمر میں سنت ابراہیمی ادا ہوئی اور ختنہ ہوا، اور اسی عمر سے نماز کی عادت ڈال دی گئی، اس سال کے آخر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی، اور فارسی کتابیں اور عربی کے مختصرات پڑھنا شروع کئے[۲]، اور کافیہ ختم کر، دس[۱۰] سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی، فرماتے ہیں کہ مجھ میں بالجملہ مطالعہ کی استعداد پیدا ہو گئی[۳]، چودہ[۱۴] سال کی عمر میں بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا، پندرہ[۱۵] سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت کی، والد صاحب نے اس خوشی میں بہت بڑی دعوت کی اور بڑے پیمانہ پر کھانا تیار کیا جس میں خواص و عوام شریک ہوئے[۴]۔

اسی پندرہ[۱۵] برس کی عمر میں والد صاحب سے مشکوٰۃ کا درس لیا جس کا صرف تھوڑا حصہ (کتاب البیوع سے آداب تک) رہ گیا، کتاب کی قراءت دوسرے ساتھی نے کی تھی، جو حصہ رہ گیا تھا، اس کی بھی اجازت والد صاحب سے حاصل ہوئی، والد صاحب ہی سے صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل ترمذی مکمل، تفسیر مدارک و بیضاوی کا کچھ کچھ حصہ پڑھا[۵]، فرماتے ہیں کہ خدا کا ایک بڑا انعام یہ ہوا کہ والد صاحب کے درس قرآن میں کئی بار شریک ہوا، جس سے معانی قرآن کا ایک دروازہ کھل گیا[۶]۔

شاہ صاحب کا پڑھا ہوا نصاب

شاہ صاحب نے الجزء اللطیف میں اپنے پڑھے ہوئے نصاب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے،

---

[۱] الجزء اللطیف ص۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص۳ [۵] ایضاً [۶] ایضاً۔

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کچھ حصہ چھوڑ کر) اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا بڑا حصہ، منطق میں شرح شمسیہ مکمل، اور ایک حصہ شرح مطالع کا، علم کلام میں شرح عقائد مکمل، خیالی کے حاشیہ کے ایک حصہ کے ساتھ، کچھ حصہ شرح مواقف کا پڑھا، سلوک میں ایک حصہ عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ کا، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح اللمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء وآیات میں وہ مجموعہ جو خاص اس موضوع پر ہے، اور الفوائد المأة وغیرہ، والد صاحب نے کئی بار مجھے ان خواص و فوائد کی اجازت دی۔

طب میں موجز، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، معانی میں مطول کا بڑا حصہ، مختصر المعانی کا اتنا حصہ جس میں ملا زادہ کا حاشیہ ہے، ہندسہ اور حساب میں بعض مختصر رسائل۔

شاہ صاحب کے اس نصاب میں ان کے والد ماجد اور استاد حقیقی شاہ عبدالرحیم صاحب کے اجتہاد وانتخاب کو بھی کچھ دخل تھا، ساتویں صدی ہجری سے ہندوستان میں جو نصاب درس رائج تھا، اور جس میں نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے ملتان سے دہلی آنے پر علم کلام وبلاغت ومعقولات کی بعض کتابوں کا اضافہ ہوا، پھر دسویں صدی میں امیر فتح اللہ شیرازی کی آمد ہندوستان پر ایران کے علمائے متاخرین محقق دوانی، میر صدر الدین شیرازی، اور میر غیاث الدین منصور، اور مرزا جان کی تصنیفات داخل نصاب ہوئیں، غالباً شاہ عبدالرحیم صاحب کی حقیقت پسندی، اور اپنے ہونہار فرزند کی ذکاوت پر اعتماد کرکے ان میں سے کئی کتابوں کو (جن میں اکثر مکرر مضامین تھے) حذف کر دیا گیا، مثلاً نحو میں مصباح، لب الالباب (مصنفہ قاضی ناصر الدین بیضاوی) ارشاد (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) کے بجائے صرف کافیہ، اور شرح جامی پڑھائی گئی، اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح، اور اصول بزدوی کے بجائے حسامی، اور توضیح وتلویح کا کچھ حصہ، تفسیر میں کشاف ترک کر دی گئی،

حدیث میں "مشارق الانوار" شامل نہیں ہے، ادب میں مقامات حریری کا عام رواج تھا، اور بعض بزرگوں کے حفظ کرنے کا بھی ذکر آتا ہے، لیکن شاہ صاحب کے نصاب درس میں وہ نظر نہیں آتی، یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں بارہویں صدی کے اوائل تک بہت سے حلقہائے درس میں متروک ہو گئی ہوں۔

واضح رہے کہ بارہویں صدی ہجری ہی میں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے جو حضرت شاہ صاحب کے کبیر السن معاصر تھے، اور جنھوں نے شاہ صاحب کی وفات سے پندرہ[۱۵] سال پہلے ۱۱۶۱ھ میں رحلت کی، اس نصاب درس میں بہت عظیم اضافہ کیا، خاص طور پر صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و بلاغت، اور علم کلام میں کثیر التعداد کتابوں کا اضافہ کیا، جن میں مزید اضافہ کے بعد (جو ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے دور میں بغیر کسی منصوبہ کے ہوا) اس نصاب نے درس نظامی کی وہ آخری شکل اختیار کی جو ابھی تک قدیم مدارس میں رائج ہے[۱]۔

شاہ صاحب کے بیان کئے ہوئے نصاب درس میں ادب عربی کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی، حالانکہ شاہ صاحب کی عربی تالیفات بالخصوص "حجۃ اللہ البالغہ" شہادت دیتی ہے کہ ان کو عربی زبان اور اس میں تحریر و انشاء پر نہ صرف قدرت تھی، بلکہ (جہاں تک حجۃ اللہ البالغہ کا تعلق ہے) وہ اس میں ایک ایسے طرز و اسلوب کے بانی ہیں، جو علمی مضامین و مقاصد کے شرح و بیان کے لئے موزوں ترین اسلوب ہے، اور جس میں علامہ ابن خلدون کے بعد ان کا کوئی

---

[۱] نصاب درس کی عہد بعہد تبدیلیوں، معیار فضیلت کے بدلنے اور ایک ہی کتاب کے متعدد شروح و حواشی کے اضافہ اور ان کے اسباب و محرکات سے واقف ہونے کے لئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" مطبوعہ المجمع العلمی دمشق، اور اردو میں ان کا پُر مغز اور محققانہ مضمون "ہندوستان کا نظام درس اور اس کے تغیرات" مطبوعہ دار العلوم ندوۃ العلماء ملاحظہ ہو۔

ہم پایہ اور ہمسر نظر نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بطور خود عربی ادب اور نثر و نظم کی ان قدیم معیاری کتابوں کا مطالعہ کیا، جو سلاست و حلاوت کا نمونہ تھیں اور جو عجمی عربی کے اثرات سے بہت کچھ محفوظ تھیں، اور حجاز کے قیام میں خاص طور پر عربی میں اس عظیم تصنیفی کام کی تیاری کی جس کو تدبیر الٰہی نے شاہ صاحب کے لئے مخصوص کر رکھا تھا[1]، اگر مقامات حریری کا ذکر سہواً نہیں چھوٹ گیا ہے، تو اس کے شاہ صاحب کے نصاب میں داخل نہ ہونے سے بجائے نقصان کے فائدہ ہوا ہوگا کہ متاخرین عام طور پر اس کے زخم خوردہ ہیں، اور اس کی وجہ سے سجع و قوافی کے ایسے پابند کہ بے تکلفی اور روانی کے ساتھ مطالب عالیہ کے ادا کرنے اور اظہار ما فی الضمیر سے عام طور پر قاصر نظر آتے ہیں، حریری کے بعد جس نے بھی کسی مضمون پر قلم اٹھایا حریری ہی کے قلم سے لکھا جس کا قط پرانا ہو گیا تھا، رسائل و خطوط اور کتابوں کی تقریظیں حتیٰ کہ فتاوے کی طویل عبارتیں بھی حریری کے اس اثر سے آزاد نہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں مضامین عالیہ ذہن میں آتے تھے، جن میں برابر ترقی محسوس ہوتی تھی[2]، والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی کتب اور عقلی علوم کی کتابیں پڑھانے کی پابندی کی، اور ہر علم میں غور و خوض اور اشتغال کا موقعہ ملا۔

والد ماجد کی شفقت و تربیت اور اجازت و خلافت

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کم کسی

---

[1] صاحب "الیانع الجنی" لکھتے ہیں "وقد اقام بالحجاز سنین و زاحم العرب وسمع من اهل البادیة وهم یومئذ احسن حالا منهم فی زماننا" (حجاز میں کئی سال قیام فرمایا، عربوں سے اختلاط و صحبت رہی اور اہل بادیہ سے جو اس زمانہ کے مقابلہ میں بہتر تھے صحیح و فصیح زبان سنی) ص۸۳ [2] الجزء اللطیف ص۳

باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر، اور کسی شیخ کی مرید پر ہو گی[1]، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی تربیت کا انداز بھی بڑا حکیمانہ تھا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز زمانۂ طفولیت میں احباب واعزہ کی ایک جماعت کے ساتھ ایک باغ کی سیر کو چلا گیا، جب واپس آیا تو والد صاحبؒ نے فرمایا، ولی اللہ! تم نے اس دن رات میں وہ کیا حاصل کیا جو باقی رہے؟ ہم نے اس مدت میں اتنا درود پڑھا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، یہ سن کر میرا دل باغات کی سیر و تفریح سے بالکل سرد ہو گیا، اس کے بعد پھر اس کا شوق نہیں پیدا ہوا[2]، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحبؒ مجھے حکمت عملی، آداب مجلس اور تہذیب و دانش مندی کی باتیں بہت سکھاتے تھے، اور اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطُّف با دشمناں مدارا[3]

فرماتے تھے کہ مجھے ہدایت فرمائی کہ جو لوگ مرتبہ میں کم ہوں ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرنا، اور ان سے ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آنا، اور ان کی خیریت واحوال دریافت کرنا، اور اس کو معمولی بات نہ سمجھنا ؎

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

یہ بھی فرماتے تھے کہ بعض لوگ کسی خاص پوشاک یا عادت کے پابند ہو جاتے ہیں، کوئی تکیہ کلام مقرر کر لیتے ہیں، بعض کھانوں سے ایسے متنفر ہو جاتے ہیں، کہ ان کی وہ چڑھ مقرر ہو جاتی ہے، ان سب چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے، اپنی کسی خواہش کی تکمیل میں

---

[1] الجزء اللطیف ص۳ [2] انفاس العارفین ص۶۳ [3] ایضاً ص۸۳

صرف لذّت جوئی مقصود نہ ہو، اس میں کسی ضرورت کی تکمیل، کسی فضیلت کا حصول، یا ادائے سنت مقصود ہونی چاہیئے، چال ڈھال، نشست و برخاست، کسی سے ضعف یا کسل مندی کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ صاحب کے بیان کے مطابق شجاعت، فراست، خوش انتظامی اور غیرت کے اوصاف عالیہ سے متّصف تھے، عقل معاش بھی عقل معاد کی طرح کامل و وافر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتے تھے، شاہ صاحب کی سیرت و اخلاق میں انھیں چیزوں کا پرتو تھا۔[۱]

والد صاحب ہی سے چودہ[۱۴] سال کی عمر میں بیعت کی اور اشغال صوفیہ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوئے، توجہ اور تلقین حاصل کی، والد صاحب نے آداب طریقت کا ایک حصہ تعلیم کیا، اور خرقہ پہنایا[۲]، شاہ صاحب کی عمر سترہ[۱۷] سال کی تھی، کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، آپ نے مرض موت میں بیعت و ارشاد کی اجازت دی، اور بار بار فرمایا کہ یدہٗ کیدی (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے)۔[۳]

شادی

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر چودہ[۱۴] سال کی تھی کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی شادی آپ کے ماموں شیخ عبید اللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے کر دی، سسرال والوں نے جب مہلت کا تقاضا کیا تو شاہ عبدالرحیم صاحب نے معذرت کی اور کہا کہ اسی میں مصلحت ہے، بعد کے پے در پے خاندانی حوادث نے ثابت کر دیا کہ اگر اس زمانہ میں شادی نہ ہو جاتی تو اس کو

---

[۱] انفاس العارفین ص۱۸۳ [۲] الجزء اللطیف ص۲ [۳] ایضاً ص۳

بہت دنوں کے لئے ملتوی کرنا پڑتا[1]، ان زوجہ سے آپ کے بڑے صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوئے، جنھوں نے آپ ہی سے تعلیم پائی، شاہ صاحب نے ان کے لئے ایک ابتدائی رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا، شمائل ترمذی کے درس میں شاہ عبدالعزیزؒ کے شریک اور قاری تھے[2]، شاہ صاحب کی وفات کے بعد قصبہ بڑہانہ منتقل ہوگئے، اور مدۃ العمر وہیں رہ کر ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی اور قصبہ کی جامع مسجد کے صحن میں مدفون ہوئے[3]، اسی بناء پر شاہ صاحب ابومحمد کنیت کرتے تھے[4]، شیخ محمد کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ جو ان کے ساتھ ہی مدفون ہیں، مقالات طریقت میں آتا ہے، لیکن کتابوں میں ان کو منقطع العقب لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ رائے بریلوی کے نام تین خطوط میں برادر بزرگ شیخ محمد بن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا سلام لکھا ہے، ان میں کہیں "برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب" اور کسی خط میں "الشیخ الکبیر محمد" کے نام سے سلام لکھا ہے، ان خطوط سے بھائیوں کی باہمی مُوَدَّت و تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے[5]۔

دوسرا عقد

شاہ صاحب کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سید ثناء اللہ سونی پتی کی

---

[1] شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چند ہی دنوں کے بعد میری ہونے والی خوشدامن نے انتقال کیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کی نانی نے پھر میرے چچازاد بھائی شاہ فخرالعالم نے پھر میری پہلی والدہ (برادر صلاح الدین کی ماں) نے انتقال کیا۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۶ [3] ایضاً [4] الارشاد فی مہمات الاسناد

[5] مکتوب المعارف (قلمی) ص ۱۶-۱۷-۱۸

صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا جو سونی پت کے رہنے والے تھے اور سید ناصر الدین شہید سونی پتی[1] کی اولاد میں تھے، ان زوجہ محترمہ سے آپ کے چاروں نامور صاحبزادے (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ و شاہ عبدالغنیؒ) تولّد ہوئے، جو ہندوستان میں

---

[1] سید ناصر الدین شہید کا تذکرہ کتاب "قصر عارفان" تالیف مولوی احمد علی خیر آبادی میں (جو ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے) ص ۲۸۱-۲۹۰ میں ملتا ہے، مصنف نے ان کو امام باقر بن امام زین العابدینؒ کا فرزند اور امام جعفر صادقؒ کا بھائی لکھا ہے، مصنف نے ان کا سفر شہر واسط سے خراسان اور خراسان سے غزنی پھر غزنی سے چھیاسٹھ ۶۶ سواروں کے ساتھ (جن کے مصنف نے نام بھی دیئے ہیں) قنوج کی طرف رخ کرنے کا حال لکھا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق ۱۴۶ھ میں ان کا سونی پت میں ورود ہوا، یہ سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ اور امیر الممالک نصیر الدین کی حکومت کا دور تھا، حاکم دیار ارجن دیو نے عربی گھوڑوں کی خریداری کی پیش کش کی جس کو امام نے قبول نہیں کیا، بعد میں گفتگو نے طول کھینچا اور جنگ کی نوبت آئی، امام کے رفقاء نے ارجن دیو کو شکست دی لیکن اس کے بھائی ہرہر دیو کے مقابلہ میں ۱۲ محرم ۱۴۷ھ میں امام عالی مقام نے اپنے رفقاء جاں نثار کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

یہ بیان اور ۱۴۷ھ میں خاندان اہل بیت کے کسی فرد جلیل کا شمالی ہند کے مقام سونی پت تک پہونچنا اور شہادت حاصل کرنا درایت اور تاریخی مسلّمات کے خلاف ہے کہ مسلمان حوصلہ مندوں اور غازیوں کی رسائی اس وقت تک سندھ و ملتان کے آگے نہیں تھی نہ اس وقت تک اسلامی حکومت سندھ و ملتان سے آگے بڑھنے پائی تھی، منصورہ تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کی ابتدا میں اسلامی سلطنت کا مرکز بنا، خود محمود غزنوی ۳۸۷ھ میں اورنگ نشین ہوا، اس کا پہلا حملہ ہندوستان ۳۹۱ھ میں ہوا، جہاں تک شہاب الدین محمد غوری کا تعلق ہے جس کے عہد میں امام ناصر الدین کی مہم بتائی جاتی ہے اس نے ۵۷۲-۵۷۳ھ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کا رخ کیا، اور ۵۸۸ھ میں پرتھوی راج کو مکمل شکست دے کر ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کی، مزید یہ کہ امام محمد باقر کے صاحبزادوں میں کسی کا نام کتب انساب میں امام ناصر الدین نہیں ملتا، بعض مرتبین شجرہ نے ان کو امام کی بائیسویں ۲۲ پشت میں دکھایا ہے، اس لئے مصنف "قصر عارفان" کا بیان واقعات و مسلمات
(باقی ص ۱۰۷ پر)

دین کی نشأۃ ثانیہ کے "ارکان اربعہ" ہیں رحمہم اللہ تعالیٰ، اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں، ان کا عقد مولوی محمد فائق ابن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا، وہ صاحب اولاد تھیں، ان کا سلسلہ جاری رہا۔

سفرِ حج

شاہ صاحبؒ کی علمی، فکری اور دعوتی و تجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام ایک تاریخ ساز واقعہ اور ان کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب اور حد فاصل ہے، حجاز کے اسی طویل قیام میں جو ایک سال سے زیادہ رہا، ان کے ملکات ذہنی و علمی نے ارتقاء کے وہ منازل طے کئے جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہ تھے، اور اس کے لئے حرمین ہی جیسی مرکزی و عالمی جگہ درکار تھی، اسی سفر میں انھوں نے علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا، اور اس کے شیوخ کاملین سے جو دیار و امصار سے وہاں جمع ہوئے تھے، اس فن شریف کی تکمیل کی، جو ان کی تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں حجر الزاویۃ (کونہ کے پتھر) کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس سے وہ تحقیق و اجتہاد کے اس مقام پر پہونچے جس پر ان آخری صدیوں میں کم لوگ (اور جہاں تک مقاصد و اسرار شریعت اور تطبیق بین الفقہ والحدیث کا تعلق ہے) کئی صدیوں سے کوئی نہیں پہونچا تھا۔

(باقی صـ۱۰۶ کا) کے خلاف اور مشہور تاریخ سے کھلا تضاد رکھتا ہے، اور قابل اعتبار نہیں، البتہ امام ناصرالدین کی شہادت (جس کے سنہ کا تعین مشکل ہے) ایک تاریخی حقیقت ہے، جو تواتر کے ساتھ اس جوار میں چلی آرہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی اس خاندان والا شان سے قرابتیں قدیم سے چلی آرہی تھیں اور آپ کی دوسری شادی جیسا کہ اوپر گذرا اسی خاندان میں ہوئی۔

سفر حج کے وقت شاہ صاحبؒ کی عمر تیس۳۰ سال تھی[۱]، اس وقت کے سیاسی حالات، راستوں کے امن وامان کی کیفیت، بعض غیر ملکی طاقتوں کے تسلط، برّی اور بحری خطرات اور قزّاقی کے پیش نظر یہ سفر ان کی عالی ہمتی، شوق علم اور حرمین شریفین سے قلبی وابستگی کی روشن دلیل ہے، نیز ان کی حمیّتِ اسلامی، دور بینی وبلند نگاہی پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ہندوستان میں حفاظت دین اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے عروج واستقلال کے لئے ان کی نگاہ ہندوستان ہی کے حالات کے مطالعہ اور وہیں اس کی تدبیر وعلاج کی تلاش میں محدود نہیں تھی، وہ قرآن مجید کے اشارۂ بلیغ " لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ[۲]" پر عمل کر کے عالم اسلام کے اس قلب ومرکز اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے وفود الاسلام وضیوف الرحمٰن کے علوم ومعارف، عقول واذہان اور تجربات ومساعی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اس وقت سورت ہندوستان کی بندرگاہ اور باب مکہ تھا، راستہ کے مقامات بالخصوص مالوہ وگجرات مرہٹوں کی غارت گری اور استحصال کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند تک کے اس طویل راستہ کو اس وقت کی سواریوں، بہیلیوں اور اونٹ گاڑیوں سے طے کرنا آسان نہ تھا[۳]، بحر ہند اور بحر احمر کے تمام سواحل، پرتگیزی ولندیزی (ڈچ) قزّاقوں اور

---

[۱] "القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اس سفر حج سے پہلے جو مکمل ہوا، ایک مرتبہ بیس۲۰ سال کی عمر میں اچانک سفر کا ارادہ اور ہجرت کا عزم فرمایا تھا، اور مخفی طور پر بے زاد وراحلہ کوچ فرمایا، جب ساحل سمندر پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ جہاز روانہ ہو چکے ہیں، اب کوئی جہاز باقی نہیں، مجبوراً شہر کھمبات میں قیام فرمایا، ایک مرتبہ مراقبہ میں ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دل سفر سے سرد ہو گیا، اور واپسی کا فیصلہ فرمالیا، اس میں کچھ بارگاہ رسالت پناہ کا اشارہ بھی شامل تھا۔ (القول الجلی نسخۂ مخطوطہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری) [۲] الحج - ۲۸

[۳] شاہ عبد العزیز صاحب کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس سفر میں راجپوتانہ سے بھی گذرے تھے۔ ص۳۳

فرنچ وانگریز، ملک گیروں کے بحری حملوں کے خطرہ سے محفوظ نہ تھے، حجاج کی ان مصیبتوں اور حوادث کی تفصیل اس وقت کے سفرناموں میں (جو بہت کم مرتب و محفوظ رہ سکے ہیں) دیکھی جاسکتی ہے، خود ہندوستان کے راستہ کا حال یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے۔

سورت سے جدّہ پینتالیس ۴۵ روز میں پہونچنا ہوا، ۱۵ ر ذیقعدہ کو داخل مکہ معظمہ ہوئے، علماء اور طلبہ کی درخواست پر مسجد حرام میں مصلے حنفی کے پاس درس شروع کیا، جس میں بہت ہجوم ہوتا۔[1]

شاہ صاحب "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے شوق کا غلبہ ہوا، ۱۱۴۳ھ کے آخر (ذی الحجہ) میں حج سے مشرف ہوا، ۱۱۴۴ھ تک بیت اللہ کی مجاورت کی، اور زیارت مدینہ سے مشرف ہوا، شیخ ابو طاہر مدنی اور دوسرے مشائخ حرمین سے حدیث کی روایت کی، علمائے حرمین سے مجالس رہیں، شیخ ابو طاہر مدنی نے خرقہ پہنایا، جو غالباً صوفیہ کے تمام خرقوں کا جامع ہے، اس سال ۱۱۴۴ھ کے اختتام پر دوبارہ مناسک حج ادا کئے، اور ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان روانہ ہوا، اور ۱۰ ر رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے مستقر (دہلی) پر پہونچا۔[2]

شاہ صاحب کے مشائخ واساتذۂ حرمین

شاہ صاحب نے مشائخ واساتذۂ حرمین کے تعارف اور تذکرہ میں مستقل رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" تصنیف فرمایا، اس رسالہ میں اپنے شیخ خاص اور اپنے محسن ومحبوب استاد شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا، چونکہ

---

[1] القول الجلی (قلمی) [2] الجزء اللطیف ص ۵

خصوصی اساتذہ ومشائخ کی عالی استعداد تلامذہ پر گہری چھاپ ہوتی ہے اور ان کے رجحانات وتحقیقات کا ان شاگردانِ رشید پر انقلاب انگیز اثر ہوتا ہے اس لئے ان کا قدرے تفصیل ہی کے ساتھ تذکرہ مناسب ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم نے اپنے والد شیخ ابراہیم الکردی سے علم الحدیث کی تحصیل کی، اس کے بعد شیخ حسن عُجیمیؒ[1] سے زیادہ تر استفادہ کیا، اس کے بعد احمد نخلی، شیخ عبداللہ بصری سے شمائل نبویؐ، اور مسند امام احمدؒ دو مہینے سے کم میں پڑھی، حرمین میں آنے والے علماء سے استفادہ کرتے رہے، شیخ عبداللہ لاہوری سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابوں کی روایت کی اجازت پائی، شیخ سعید کوکنی سے بعض کتب عربیہ اور فتح الباری کا ایک ربع پڑھا[2]۔

"الیانع الجنی" میں علامہ محسن بن یحییٰ ترہتی نے لکھا ہے کہ شیخ ابوطاہر کہا کرتے تھے کہ شیخ ولی اللہ مجھ سے لفظ کی سند لیتے ہیں، اور میں ان سے حدیث کے مطالب میں استفادہ کرتا ہوں، اپنی اجازت میں بھی ایسا ہی لکھا ہے[3]۔

شیخ ابوطاہر (محدث کبیر ہونے کے باوجود) صوفیہ کے بڑے معتقد اور ان پر تنقید کرنے سے محترز تھے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں شیخ ابوطاہر سے رخصت ہونے گیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کل طریقٍ کنت أعرفہ — إلّا طریقاً یؤدّینی لربعہ

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

---

[1] شاہ صاحبؒ نے "انسان العین" میں ان کا لقب عجمی لکھا ہے، جو غالباً طباعت کی غلطی ہے، تذکرہ کی عام کتابوں میں ان کو العجیمی (تصغیر کے ساتھ) یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو زرکلی کی الاعلام جلد ۲ ص ۲۲۳) [2] انسان العین ص ۱۳

[3] الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنیؒ، مجموعہ کشف الاستار عن رجال معانی الآثار، برحاشیہ مطبوعہ دارالاشاعت والتدریس، دیوبند

یہی جواب شاہ صاحب کا بھی تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو استاد محترم سے عرض کیا اور وہ یہ سن کر خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا سوائے علم دین و حدیث کے۔[1]

شاہ صاحبؒ کی بعد کی زندگی اور مشاغل نے (جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئیگی) اس کی تصدیق کردی کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کو کر کے دکھادیا "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (سورۃ الاحزاب - ۲۳)

رمضان ۱۱۴۵ھ میں شیخ ابوطاہر نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی، گویا شاہ صاحب کی مدینہ طیبہ سے روانگی کے کچھ عرصہ اور ان کے دہلی پہونچنے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد[2] ان کی وفات ہوئی، اور شاہ صاحب کی آمد ہندوستان کے بعد ان کو افادہ و تربیت کا بہت مختصر وقت ملا "وَذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ"

ان کے تذکرہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے والد شیخ ابراہیم کورانی[3] امام ابن تیمیہؒ کی طرف سے مدافعت کیا کرتے تھے، علامہ سید نعمان خیر الدین آلوسی بغدادی اپنی مشہور کتاب "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین" میں لکھتے ہیں:-

وکان سلفی العقیدۃ ذابّاً عن	وہ سلفی العقیدہ تھے، شیخ اسلام ابن تیمیہ
شیخ الاسلام ابن تیمیۃ وکذا	کی طرف سے مدافعت کرتے تھے،
یذبّ عمّا وقع فی کلمات	اسی طرح سے ان صوفیہ کے ان الفاظ
الصوفیۃ مما ظاهره الحلول	کی تاویل کرتے تھے، جن سے ظاہری طور پر

---

[1] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز ص۹۳ [2] انسان العین ص۱۴

[3] ولادت ۱۰۲۵ھ وفات ۱۱۰۱ھ شیخ ابراہیم اسّی سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

او الاتحاد أو العینیۃ۔[1] حلول واتحاد یا عینیت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ شیخ الاسلام کی کتابوں سے تعارف، ان کی حمایت ومدافعت کا جو اظہار شاہ صاحب کی تحریروں سے ہوا، نیز اس تطبیقی رجحان میں جو شاہ صاحب کی خاندانی روایت و وراثت تھی، شیخ ابو طاہر کی گفتگو کا بھی اثر اور حصہ ہوگا جس کا رجحان انھوں نے اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم کورانی سے وراثتاً پایا ہوگا۔

شاہ صاحب کے دوسرے شیخ جن سے شاہ صاحب کو اجازت حاصل ہوئی شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ تھے، حدیث میں ان کی اکثر تعلیم شیخ عبداللہ بن سالم مصری سے ہوئی، صحیحین شیخ عجیمی سے پڑھی، اور ان سے اجازت مطلقہ حاصل ہوئی، ان کو شیخ احمد نخلی وغیرہ سے بھی اجازت ہے، شاہ صاحب نے تین۳ روز ان کے درس بخاری میں شرکت کی، کتب ستہ کے اطراف اور مؤطا کا ایک حصہ، مسند دارمی، امام محمد کی کتاب "الآثار" اور مؤطا ان سے سنی، شیخ نے ان سب کتابوں کی اہل مجلس کو اجازت دی، شاہ صاحب بھی شریک تھے، شاہ صاحب نے حدیث مسلسل بالاوّلیۃ بھی ان سے سنی۔[2]

شاہ صاحب نے حافظ حدیث اور جامع کمالات شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کے (جو نسخۂ بتونیہ کے مالک تھے، اور اس کو استنبول سے حرمین میں لائے تھے، اور جمہور اہل حرمین کے استاد تھے) صاحبزادہ شیخ محمد وفد اللہ سے بھی اپنے والد کی تمام مرویات کی اجازت حاصل کی، اس کے علاوہ مؤطا یحییٰ بن یحییٰ کا ملاً ان سے پڑھی اور اس کی اجازت لی۔[3]

---

[1] جلاء العینین مطبوعہ مطبعۃ المدنی، مصر ص۲۱ [2] انسان العین ص۱۵-۱۶ [3] ایضاً ص۷

شاہ صاحب زمانۂ تعلیم ہندوستان میں اپنے زمانہ کے امام حدیث شیخ محمد فضل سیالکوٹی کے درس میں بھی شریک ہوئے تھے،[1] جنھوں نے حدیث کی سند شیخ سالم بن عبداللہ بصری سے حاصل کی تھی، اور ان سے حدیث پڑھی تھی، وہ شیخ عبدالاحد ابن خواجہ محمد سعید سرہندی کے بھی شاگرد تھے، غازی الدین خاں کے مدرسہ میں دہلی میں حدیث کا درس دیتے تھے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے حدیث وسلوک دونوں میں ان سے استفادہ کیا[2]۔

اس سفر میں آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ بارہوی اور ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق پھلتی (مصنف القول الجلی) بھی ساتھ تھے، شاہ صاحب نے اپنی والدہ ماجدہ کی خبر وفات اسی سفر حج میں واپسی پر مکہ معظمہ میں سنی[3]۔

شاہ صاحب کے لئے فن حدیث کے خصوصی ذوق، حرمین میں اس کی تدریس واشاعت کے آسان مواقع اور وہاں بیٹھ کر مختلف ممالک سے آنے والے طالبین علم اور علماء کو مستفید کرنے کا امکان، پھر مجاورت بیت، اور جوار نبویؐ کی برکت وسعادت اور ہندوستان کے غیر یقینی حالات، سلطنت اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدم، اور غیر ملکی طاقتوں کے روزافزوں تسلط کا علم، حجاز میں مستقل قیام وہجرت کی نیت کے قوی اسباب ومحرکات تھے، اور نہ صرف اس کے جواز کے دلائل بلکہ دینی وعلمی مصالح کی تائید بھی فراہم کرتے تھے، لیکن آپ نے ہندوستان کی واپسی کا وہ فیصلہ کیا، جس میں اللہ تعالے نے وہ خیر مقدر فرما رکھی تھی، جس کا آپ کے تجدیدی واجتہادی کارنامہ میں ظہور ہوا، اور اس بشارت نبویؐ کا تحقق جو آپ کو مدینہ طیبہ کے قیام میں حاصل ہوئی تھی۔

اِنَّ مرادالحق فیك أن یجمع خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ تمہارے

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ [2] ایضاً [3] القول الجلی (قلمی)

شملاً من شمل الأمة المرحومة بك[1] ۔	ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو۔

شاہ صاحب کے نہ صرف اپنے بارے میں، بلکہ اپنے خواص اصحاب کے بارے میں بھی رجحان یہی تھا کہ وہ ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں اور علمی و دینی خدمات کا مرکز بنائیں، جس ملک پر ان کے اسلاف نے اپنی بہترین علمی و دینی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کیں، اور جس نے ہر دور میں محقق و عارف پیدا کئے، اور اس کو مستقبل میں علم حدیث، اور دوسرے علوم دینیہ کا مرکز بنانا تھا، آپ کے ایک تلمیذ خاص مخدوم معین الدین سندھی نے حجاز جاکر جب وہیں رہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، تو شاہ صاحب نے ان کو اس سے منع کیا اور لکھا:۔

أما عزم ترك الرجوع إلى الوطن فلا تستبد وإياه حتى يشرح الله صدركم أو صدر رجل لأجلكم[2] ۔	جہاں تک وطن کی طرف مراجعت نہ کرنے کے ارادہ کا تعلق ہے، تو ابھی اس بارے میں قطعی فیصلہ اور اس پر اصرار نہ کیجئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کا یا آپ کے کسی خاص تعلق والے کا شرح صدر نہ فرمادے۔

شاہ صاحب کا درس حدیث

شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آنے کے بعد اپنے والد صاحب کے مدرسہ رحیمیہ میں

---

[1] فیوض الحرمین، مطبع احمدی، دہلی ص ۶۲ [2] حیات ولی (مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب المکتوب العاشر) ص ۵۳۶ مطبوعہ مطبع ۔ لاہور۔

جو اس وقت پرانی دلی میں اس محلہ میں جو اب مہندیاں کہلاتا ہے، واقع تھا، درس شروع کر دیا لیکن چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلباء کھنچ کھنچ کر پہونچنے لگے، اس وقت یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی، اللہ تعالےٰ نے یہ سعادت (بہت سی بے توفیقیوں اور کمزوریوں کے ساتھ) محمد شاہ بادشاہ کے مقدّر میں رکھی تھی، اس نے شاہ صاحب کو شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر شہر میں بلا لیا، اور آپ نے وہاں درس شروع کر دیا[1]، مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں:۔

"یہ مدرسہ ... مانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا، غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا، غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے"۔

مولوی صاحب مزید لکھتے ہیں:۔

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے"۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اس مدرسہ کی مسجد کا تذکرہ ہے، شاہ صاحب نے فرمایا:۔

درآں ہنگام بزرگان بسیار واولیاء بسیار از یاران والد ماجد مثل شاہ محمد عاشق ومولوی نور محمد وغیرہ معتکف مسجد ہذا می بودند[2]۔	(میری ولادت کے وقت) بہت سے بزرگ اور اولیاء جو والد ماجد کے احباب وخواص میں سے تھے مثلاً شاہ محمد عاشق ومولوی نور محمد وغیرہ اس مسجد میں معتکف ہوا کرتے تھے۔

---

[1] "دارالحکومت دہلی" جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ مؤلفہ مولوی بشیر الدین۔

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیز صاحب (فارسی) صفحہ ۱۰۹ مطبع مجتبائی، میرٹھ

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مصنف "نزہۃ الخواطر" نے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، ۲۶ رجب کے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"میاں سید نذیر حسین صاحب کے درس سے آنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا ومولیٰ الکل، مقتدائے اربابِ تمیز شاہ عبدالعزیز صاحب رفع اللہ روحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں جس میں ہمارے بزرگوں نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے اور جس کی خاکروبی کو فخر وسعادت سمجھا ہے[1]، یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا، چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو وہ سید ھا خانقاہ کو گیا ہے[2]، دوسرا بائیں ہاتھ کو اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا، آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کو کوچۂ فولاد خاں کو سڑک گئی ہے، وہ سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ المشائخ مولانا ومقتدانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اس کی حالت کو دیکھ کر "خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا"[3] کی آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک وہ دن تھا کہ عرب وعجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے، اور فائدہ حاصل کرتے تھے، اور آج اس کی یہ حالت ہے کہ ویران اور خراب پڑا ہے، کوئی رہنے والا نہیں[4]۔"

پھر اسی خاندان کی ایک یادگار مولوی سید ظہیر الدین احمد صاحب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

---

[1] اس جگہ مولانا نے اپنے خاندان حسنی قطبی کے متعدد بزرگوں کے نام لکھے ہیں، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے وقت سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے وقت تک یہاں آتے اور استفادہ کرتے رہے۔

[2] اس سے مراد حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ ہے، اس محلہ کو اب شاہ ابوالخیر مارگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[3] البقرہ - ۲۵۹ [4] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۶۳-۶۴

منہدیوں میں جہاں ان حضرات کے مزار ہیں، وہاں مدرسہ بھی تھا، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ نئے شہر میں تشریف لائے، یہ مدرسہ ان کو دیا گیا، اور وہ یہیں رہ پڑے[۱]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبانی حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض خصائص و معمولات

افسوس ہے کہ کوئی معاصر تذکرہ، سفرنامہ، یا روزنامچہ ایسا سامنے نہیں ہے، جس سے شاہ صاحبؒ کے خصائص، معمولات، نظام الاوقات اور نشست و برخاست کے حالات تفصیل سے معلوم ہوں، ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ[۲] (فارسی) میں کہیں کہیں کچھ اشارے آئے ہیں۔

فرمایا کہ میں نے اپنے والد ماجد کا جیسا قوی الحفظ نہیں دیکھا، سننے کا انکار تو نہیں کر سکتا، لیکن مشاہدہ میں نہیں آیا[۳]، علوم و کمالات کے ماسوا ضبط اوقات میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، اشراق کے بعد جو نشست رکھتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجاتے نہ تھوکتے[۴]، ہر فن میں ایک ایک آدمی کو تیار کر دیا تھا، اس فن کے طالب کو اسی کے سپرد فرما دیتے، اور خود بیان حقائق و معارف اور ان کی تدوین و تحریر میں مصروف رہتے، حدیث کا مطالعہ اور درس فرماتے تھے، جس چیز کا کشف ہوتا تھا، اس کو لکھ لیتے تھے، بیمار بہت کم ہوتے تھے[۵]، جد بزرگوار اور عم محترم (جو طبیب بھی تھے) لوگوں کا علاج کرتے تھے، والد صاحبؒ نے اس شغل کو موقوف کیا، البتہ طب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے[۶]، طبیعت میں بچپن سے نظافت و لطافت تھی، اشعار صوفیانہ کم پڑھتے، کبھی کبھی ضرور کوئی شعر پڑھتے[۷]۔

---

[۱] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۶۷ [۲] کتاب کے طابع و ناشر محمد بشیر الدین صدیقی صاحب کو جامع ملفوظات کا مسودہ کی بوسیدگی و کرم خوردگی کی وجہ سے نام نہیں معلوم ہو سکا، لیکن کتاب میں ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان ملفوظات کی نسبت میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ [۳] ملفوظات ص ۱۱ [۴] ایضاً ص ۴۳ [۵] ایضاً ص ۸۰ [۶] ایضاً ص ۲۲ [۷] ایضاً ص ۴۳

وفات

بالآخر اس بیش قیمت و بابرکت مدت حیات کے جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی، اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید، اور احیاءِ سنت، قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت تعلیم و تربیت، یاد الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر میں مصروف تھا، خاتمہ بالخیر کا دن آ گیا جس سے "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ"[1] کے اعلان و وعدہ کے مطابق نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے، نہ کوئی ولی، نہ مجدد نہ مجاہد، ۱۱۷۶ھ شروع ہوا تھا، محرم کی آخری تاریخ تھی کہ یوم موعود آپہونچا، اور حضرت شاہ صاحب نے مختصر علالت کے بعد باسٹھ[62] سال کی عمر[2] میں اس دار فانی کو خیر باد کہا، اور جان جان آفریں کے سپرد کی ؎

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

کسی تذکرہ میں علالت اور واقعۂ وفات کی تفصیلات نہیں ملتیں، ناچیز مصنف کے لئے یہ بات قابل فخر و شکر ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ معلومات و تفصیلات ملتی ہیں، ان کا واحد ذریعہ رائے بریلی کے سادات حسنی قطبی اور خاندان علم اللّٰہی کے ایک ممتاز فرد سید محمد نعمان حسنی کا مکتوب ہے، جو انھوں نے اسی خاندان کے دوسرے بزرگ و نامور فرد حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ کے نام شاہ صاحبؒ کی وفات کے عین بعد دہلی سے لکھا تھا، کاتب حضرت سید محمد نعمان[3] مجاہد کبیر

---

[1] آل عمران ۱۸۵ [2] ملفوظات شاہ عبد العزیزؒ اردو میں شاہ صاحبؒ کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ عمر شریف اکسٹھ[61] برس چار[4] ماہ کی ہوئی، چوتھی شوال ۱۱۱۴ھ کو پیدا ہوئے اور انتیسویں[29] محرم ۱۱۷۶ھ کو وفات پائی، وفات کی تاریخ امام اعظم دین ہے (ملفوظات ص ۵۶ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ) [3] سید محمد نعمان حضرت شاہ علم اللہؒ کے پرپوتے ہیں، ان کا شجرہ اس طرح ہے، نعمان بن نور بن ہدیٰ بن علم اللہ حسنی الحسینیؒ خاندان کے وطن قدیم نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں ولادت ہوئی، کچھ عرصہ مقامی علماء سے تعلیم حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر مولانا عبد اللہ امیٹھویؒ سے درسیات کی تکمیل کی، پہلے حضرت شاہ علم اللہؒ کے عالی نسبت صاحبزادہ حضرت سید محمدؒ سے بیعت و تربیت حاصل کی،

(باقی ص ۱۱۹ پر)

حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی چچا اور مکتوب الیہ (حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ) حضرت سید صاحب کے حقیقی نانا تھے، حضرت شاہ ابو سعیدؒ شاہ صاحب کے مریدین اور اصحاب با اختصاص میں سے تھے، جن کے نام شاہ صاحب کے خود متعدد مکاتیب موجود ہیں، یہ خط بجنسہٖ خاندانی مجموعۂ مکاتیب "مکتوب المعارف" (قلمی) سے نقل کیا جاتا ہے:۔

الحمد للہ علی النعماء والرضاء	باسمہ سبحانہ تعالیٰ شانہ۔ اللہ تعالیٰ
علی القضاء، والصبر علی المصیبۃ	کا شکر ہے اس کی نعمتوں اور تقدیر
والبلاء، والصلاۃ والسلام علی	پر راضی رہنے اور بلاء و مصیبت میں
سید الشاکرین وزبدۃ الراضین	صبر کی توفیق پر صلوٰۃ وسلام ہو سید
وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین	الشاکرین وزبدۃ الراضین، قدوۃ
ورحمۃ للعالمین محمد وآلہ وصحبہ	الصابرین شفیع المذنبین اور رحمۃ للعالمین
الطیبین الطاھرین وعلی ورثتہ	محمد رسول اللہ اور ان کی آل واصحاب
العلماء الراسخین والاولیاء	پر جو طیبؐ طاہر تھے، اور آپ کے وارث
المرشدین إلی یوم الدین	علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر
بعد ہذا اگر شرح سوگواری و بیان	قیامت تک اس کے بعد عرض ہے کہ

(باقی ص۱۱۸ کا) ان کے انتقال کے بعد ان کے عالی مرتبت صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ علم اللہ صاحب سے استفادہ اور اخذ فیض کیا، ان کے انتقال کے بعد رخت سفر باندھا اور حضرت شاہ علم اللہؒ کے خلفائے نامدار اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے فیوض و برکات حاصل کئے، خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت موجود اور ان کی توجہات خاصہ سے محظوظ تھے، شاہ صاحب کی وفات کے بعد سفر حج اختیار کیا، حج و زیارت کے بعد بیت المقدس اور مدینۃ الخلیل (حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کا مسکن و مدفن) کا رخ کیا، راستہ میں وقت موعود آپہونچا، اور سرزمین انبیاءؑ بیت المقدس میں مدفون ہوئے، یہ واقعہ ۱۱۹۳ھ کا ہے (نزہۃ الخواطر ۶)

عزای وماتم داری واقعۂ ارتحال امام
سنت وجماعت ومقتدای ارباب کرامت
پیشوای عرفاء زمان سرآمد اولیاء جہان
قطب ربانی محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا
ولی اللہ فاروقی مجدد مأۃ دوم الف ثانی
رضی اللہ عنہ ازیں عالم پرملال بصوب
دار الانفصال بوصال ذو الجلال برصفحہ
روزگار ثبت باید بآئینہ مانند حال ما غریبان
غمزدگان سزد ے

چہ بخاطر رسید یار مرا
کہ بہجراں کشید کار مرا

وامصیبتاہ ایں چہ بے نیازی ونیرنگ
سازی است کہ ہمچنیں روح مقتدای
را در کمتر وقت بعمر شصت ودو سالگی نداء
"ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً"
(الفجر-۲۸) دادند واصحاب بدع
ضلال را عشرت آگیں نمودند واصحاب
دین را اندوہ گیں کردند یعنی بتاریخ
سلخ محرم الحرام سنہ ۱۱۷۶ھ یک ہزار

امام اہل سنت وجماعت، مقتدائے
ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے
زماں، سرآمدِ اولیائے جہاں
قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا
ومرشدنا شاہ ولی اللہ فاروقی
مجدد قرنِ دوازدہم رضی اللہ عنہ
کے واقعۂ ارتحال کی تفصیل اگر
صفحۂ روزگار پر ثبت ہو تو ہم مسکینوں
کے حسب حال ہے ے

چہ بخاطر رسید یارِ مرا
کہ بہجراں کشید کار مرا

وامصیبتاہ! اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب
شانِ بے نیازی ہے کہ ایسے مقتدیٰ کی
روح کو صرف ۶۲ سال کی مختصر عمر میں
"ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً"
(الفجر-۲۸) کی پکار سنادی گئی اور اہلِ
بدعت وضلالت کو خوش اور دیندار
کو اندوہ گیں کر دیا گیا، یعنی محرم کی آخری
تاریخ سنہ ۱۱۷۶ھ شنبہ کے دن، ظہر کے

وبکصد وہفتاد و شش یوم السبت
وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر
الحضرت از قالب عنصری مفارقت
نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ
وبمقتضائی "وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ
مِنَ الْاُوْلٰى ○ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ
رَبُّكَ فَتَرْضٰى ○ (الضحیٰ۔ ۴، ۵)
ای لقاء رفیق اعلیٰ دران پرداختہ
اما حالت تمام اصحاب و احباب
از مفارقت آنجناب چناں تباہ و
خراب بود کہ از حیز تحریر بیرونست
یقینیکہ استیلاء و کاہش آلام
بر منتسبان مہجوران منتہا یافتہ
باشد رضینا بقضاء اللہ انا للہ
و انا الیہ راجعون رحمۃ اللہ
علیہ و علی من بجنابہ یتوسلون"
آمدیم برآنکہ از فضل الٰہی و تصدق
جناب حضرت رسالت پناہی
صلے اللہ علیہ و علی آلہ جاذبہ

وقت حق تعالےٰ کے حکم سے حضرت
کی روح پاک نے قالب عنصری کو
چھوڑکر اوج علیین پر اپنا نشیمن
بنالیا...... تمام اصحاب و احباب
کی حالت آنجناب کی فرقت سے
ایسی تباہ و خراب تھی جو احاطۂ
تحریر سے باہر ہے إنا للہ و انا
الیہ راجعون اللہ کی رحمت
آپ پر اور آپ کے متوسلین پر
نازل ہو، مقصد تحریر یہ ہے کہ
فضل الٰہی اور حضرت رسالت
پناہی صلے اللہ علیہ و علیٰ آلہ وسلم
کے صدقے میں حضرت کی کشش
نے اپنی طرف کھینچا، ذی قعدہ کے
مہینے میں بڈھانہ جاکر آستاں بوسی
کی سعادت حاصل کی اور جناب
قدسی القاب کی صحبت سے مشرف ہوا
اور اپنے حال پر حضرت کی بلند توجہات
میں بہت اضافہ دیکھا، وہاں سے

حضرت ایشان علیہ الرحمۃ این عاصی
را بسوی خود کشید بشہر ذیقعدہ در بڈھانہ
رفتہ بتقبیل آستانہ متبرکہ استسعاد
یافتہ و بملازمت جناب قدسے
القاب مشرف گردید و بر حالات خود
توجہات عالیات بیش از بیش یافتہ،
از آنجا حضرت ایشان بجہت تداوی
و تدابیر در ماہ ذی الحجہ تاریخ نہم بشہر
دہلی بمکان بابا فضل اللہ در مسجد روشن
الدولہ بچوک سعد اللہ خاں نزول
فرمودند از فرزندان گرامی میاں محمد صاحب
و میاں عبد العزیز و میاں رفیع الدین
مدظلہم العالی و میاں محمد عاشق صاحب
و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق
و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران
حاضر خدمت بودند و ایں غلام
و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت
آخرین شرف انتساب بیعت یافتہ
ہر روز بشرف حضور پرنور و خدمت گاری

حضرت دوا علاج کے سلسلے میں
۹ ذی الحجہ کو دہلی میں بابا فضل اللہ
کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے
احاطے میں (جو چوک سعد اللہ خاں
میں ہے) مقیم ہوئے، فرزندانِ گرامی
میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبد العزیز
و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور
مریدین و متعلقین میں سے) میاں
محمد عاشق صاحب، میاں محمد فائق،
میاں محمد جواد، اور خواجہ محمد امین وغیرہ
احباب حاضرِ خدمت تھے، یہ غلام
اور میر محمد عتیق، اور میر قاسم علی
(جنھوں نے حضرت سے ان کے
آخری ایام میں شرف بیعت
حاصل کیا تھا) ہر روز حاضری
و خدمت گزاری کی سعادت حاصل
کرتے تھے۔ مشفق من! یہ آخری
مجلسیں، عجب پرفیض مجلسیں تھیں،
ملائکہ وارواح طیبہ کا برابر نزول

وسیلہ حضور در حضور سعادت اندوز
می شدیم شفقا این مجلس آخرین عجب
مجلسے بود پر فیض دائما مہبط ملاء ملکوت
و نزول ارواح طیبۂ ارکان عالم ناسوت
میگردید، و نفحات انس و رحمت و رشحات
قدس و برکت بمثال نزول غیث
می بارید اکثر یاران اہل نسبت بوجدان
صحیحہ خود می دریافتند، واحسرتا اہل اللہ
و عرفاء لازال در ہر زمان میباشند
اما این چنیں یک مرد با جمعیت اوصاف حمیدہ
اعلم بکتاب و سنت با اجتہاد مطلق و در
حقائق و معارف بحر مواج و در علوم
دیگر محض فیاض پس از صد ہا سال
بوجود می آید ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

یاراں را می باید کہ مصابرت و شکیبائی
ورزیدہ نسبت رابطہ حضرت شیخ را
بجامع ہمت در تصور نہادہ بمراقبات

محسوس ہوتا تھا، نفحات انس و رحمت
اور رشحات قدس و برکت بارش
کی طرح برستے تھے، اکثر اہل نسبت
احباب اپنے وجدانِ صحیح سے
اس کو محسوس کرتے تھے، واحسرتا!
اہل اللہ اور عارفین ہر زمانے
میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مرد حقانی
جو ایک طرف اوصاف حمیدہ کا
جامع ہو دوسری طرف کتاب
و سنت کے علم میں مجتہد مطلق کا
درجہ رکھتا ہو، حقائق و معارف
کا بحر موّاج اور دیگر علوم کا
دریائے فیّاض ہو، کہیں صدیوں
میں پیدا ہوتا ہے ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

دوستوں کو چاہئے کہ صبر و شکیبائی
اختیار کر کے حضرت شیخ کی نسبتِ رابطہ کو
پوری ہمت کے ساتھ تصور میں رکھ کر مراقبات

معلومہ مشغول باشد انشاء اللہ تعالیٰ
فیض صحبت ورابطہ برابر خواہد بود
کما یفیض من بعض رسائلہ
رحمۃ اللہ علیہ۔

معلومہ میں مشغول ہوں، انشاء اللہ
فیض صحبت ورابطہ برابر جاری
رہے گا، جیسا کہ حضرتؒ کے بعض
رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔

والحمد للہ رضامندی حضرت صاحب
قدس سرہ ازاں صاحب وتوجہات عالیات
بحال ایشاں زیادہ از حد بیان یافتہ
اکثر اوقات استفسار احوال سامی
میفرمودند وماجرای غارتگری ابدالیاں
ودرسیدن آنصاحب درعین رستخیز وانطفاء
یافتن التہاب نہیب بسبب قدوم گرامی
از زبان دُرفشاں موردی ساختند و
شاید منظور لقای آخریں بضمیر منیر بودہ
باشد، مرۃ فرمودند کہ میر ابوسعید ارادۂ
آمدن دارند اگر زود برسند بہتر
باشد۔

الحمد للہ کہ حضرت قدس سرہٗ کی آپ سے
رضامندی اور آپکے حال پر توجہات عالیہ
حد بیان سے باہر پایا، اکثر اوقات جناب کے
حالات دریافت فرماتے تھے، ابدالیوں کی
جنگ اور آپکے عین معرکہ پر پہنچنے اور فتنہ
کی آگ سے آپکے قدوم گرامی سے فرو ہوجانے
کے واقعات زبان دُرفشاں سے بیان فرماتے
تھے[1]، شاید آپکے آخری ملاقات کی
تمنا حضرت کے دل میں تھی، کیونکہ
ایک بار فرمایا کہ "میر ابوسعید آنے کا
ارادہ رکھتے ہیں اگر جلد آجائیں تو
بہتر ہو"

صاحب من ظاہر صحبت ایشاں
رو باستتار کشیدہ تصنیفات آنحضرت

صاحب من! حضرت کی ظاہری
صحبت سے تو اب محرومی ہے،

---

[1] اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

قریب نود بل زیادہ در ہر علوم دین
از تفسیر واصول وفقہ وکلام وحدیث
مثل حجۃ اللہ البالغہ واسرار فقہ منصور
وازالۃ الخفاعن خلافۃ الخفاء،
وترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد
ونود جز کلاں بحجم خواہد بود ودیگر رسایل
درحقائق ومعارف مثل لطائف القدس
وہمعات وفیوض الحرمین وانفاس
العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت
وبرکت خدمت سید ہندی باید کہ
عزیمت بریں آرند کہ ہر ہمہ را
نویسایندہ رائج نمایند، باندک
توجہات سرانجام خواہد یافت،
ومثل ایں چنیں تصنیفات واللہ
اعلم در اسلام تصنیف شدہ
باشد یا نہ، چنانچہ ارباب بصیرت
عبرت یافتہ اعتراف دارند وکلام
ایشاں در ہر باب کہ نوشتہ اند

البتہ حضرت کی تصنیفات کی تعداد
نوّے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے،
علوم دین یعنی تفسیر واصول، فقہ و
کلام اور حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ،
اسرار فقہ منصور[1]، ازالۃ الخفاعن
خلافۃ الخلفاء اور ترجمۂ قرآن کہ
ان میں سے ہر ایک کی ضخامت اسّی
نوّے جز کی ہوگی، حقائق ومعارف میں
دیگر رسالے جیسے الطاف القدس، ہمعات
فیوض الحرمین اور انفاس العارفین
وغیرہ جو حضرت کی صحبت وبرکت کی
نشاندہی کرتی ہیں، ان کے بارے میں آپ
ہمت کریں کہ ان سب کو لکھوا کر رائج
کریں، یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام
پا جائے گا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ
تاریخ اسلام میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں
یا نہیں جیسا کہ اربابِ بصیرت ان کا
اعتراف کرتے ہیں، حضرت نے

---

[1] اس سے کونسی کتاب مراد ہے اس کی وضاحت نہ ہوسکی۔

اصول است "اللهم ارزقنا
حلاوة منهم"
ویقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا
ویاران حضرت بملاحظہ فرط محبت
سامی بجناب حضرت اینست کہ بمجرد
شنیدن این حادثہ عظیمہ جہت
فاتحہ روحانیت و زیارت مرقد
مطہر راہی این صوب خواہند شد
لہذا منتظر قدوم ہستم اگر زود تشریف
بیارند باری بملاقات سامی مسرور
الوقت شوم، واگر توقف در آمدن
باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم
مراجعت وطن دارد۔
ودیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب
بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابوسعید
جیو را بنویسند کہ ہر مکاتیب کہ حضرت
ایشاں بجانب آنصاحب شرف
صدور یافتہ باشد نقل آنہا البتہ
بفرستند کہ داخل مکاتیب نمودہ شود،

جس مضمون پر بھی لکھا ہے، وہ اصولی
حیثیت رکھتا ہے۔
اس فقیر اور صاحبزادگان اور حضرت
کے احباب کو (حضرت سے آپ کے غایت
تعلق کو دیکھتے ہوئے) یہ یقین ہے کہ
آپ اس حادثۂ عظیمہ کی خبر سنتے ہی
فاتحہ خوانی اور مرقد مطہر کی زیارت
کے لئے دہلی کے لئے روانہ ہو جائیں گے،
اسی لئے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلد تشریف لائیں
تو ملاقات سامی سے میں بھی خوش وقت
ہو جاؤں گا اگر آنے میں دیر ہو تو اطلاع
فرمائیں کہ فقیر بھی وطن واپسی کا ارادہ
رکھتا ہے۔
دوسری بات یہ کہ میاں محمد عاشق
صاحب نے بعد سلام کے فرمایا ہے کہ
میر ابوسعید کو لکھ دیجئے کہ آپ کے
نام حضرت رح کے جتنے بھی مکتوبات ہوں
ان کی نقل ضرور بھیج دیں تاکہ انھیں
مکاتیب کے مجموعے میں داخل کیا جائے،

از حضرت میاں اہل اللہ صاحب
و دیگر یاران و صاحبزادہا سلام اسم
باسم مطالعہ فرمایند و کیفیت ارتحال
و وصال مرحومی مغفوری غفران پناہ
بھائی محمد معین صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ
رحمۃ واسعۃ بجناب عالی حضرت
صاحب قبلہ در مقام بڑھانہ عرض
کردم فاتحہ بروحانیت خواندند
و تاسفہا نمودند[2]۔

حضرت میاں اہل اللہ صاحب
دوسرے احباب اور صاحبزادگان
کی طرف سے نام بہ نام سلام پہنچے
بھائی محمد معین کی کیفیت
ارتحال و وصال کو میں نے حضرت
سے بڑھانہ میں عرض کر دیا تھا
حضرتؒ نے ان کی روح کو
ثواب بخشا تھا، اور افسوس کا
اظہار کیا تھا[3]۔

شاہ صاحبؒ کی وفات ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بروز شنبہ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) بوقت ظہر ہوئی، جیسا کہ مکتوب مذکور الصدر سے معلوم ہوا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظ میں ہے۔

کہ در بست نہم محرم وفات یافت
..... تاریخ وفات او بود امام اعظم دین

۲۹ محرم کو وفات پائی آپکی تاریخ
وفات "او بود امام اعظم دین" اور

---

[1] سید محمد معین بن سید محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شاہ علم اللہؒ حضرت شاہ ابوسعید صاحب کے علاتی بھائی اور عمر میں بڑے تھے، ۱۱۷۶ھ کی کسی تاریخ میں انتقال ہوا، ان کا سلسلۂ اولاد خاندان میں چل رہا ہے۔

[2] مکتوب المعارف (فارسی) ص ۱۹-۲۰ (قلمی)

[3] ترجمہ از فارسی بقلم مولوی شمس تبریز خاں صاحب۔

دیگر: ہائے دل روز گار رفت[1]   "ہائے دل روزگار رفت" سے
بست نہم محرم وقت ظہر[2]   نکلتی ہے، ۲۹ ر محرم وقت ظہر
وفات کا دن اور وقت تھا۔

مدفن

تدفین دلّی دروازہ کے بائیں جانب اس مقام پر ہوئی، جو منہدیاں کہلاتا ہے[3]، جس جگہ یہ قبرستان واقع ہے، یہاں کبھی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے جد مادری شیخ عبدالعزیز شکر بار کی خانقاہ تھی، اب بھی ان کا مزار اس سے کچھ فاصلہ پر ہے، بعد میں شیخ رفیع الدین صاحب نے یہیں قیام اختیار کیا، خاندان ولی اللّٰہی کے مکانات بھی اسی جگہ تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس جگہ قیام ترک کر کے اندرون شاہجہان آباد قیام اختیار کیا، یہیں منہدیوں

---

[1] صحیح "ہائے ولی روزگار رفت" ہے جس سے صحیح سنہ وفات نکلتا ہے (بمقالہ مولوی نورالحسن راشد کاندھلوی، برہان جولائی ۱۹۸۳ء) [2] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، ص۴۰ (مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ) [3] سرسید احمد خاں "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک عمارت تھی، نیچے تو مکانات اور درسے بنے ہوئے تھے اور اوپر چاروں کونوں پر چار برجیاں تھیں، کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عمارت کیا چیز بنی اور کب بنی تھی اور کس نے بنائی تھی، مگر عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ کوئی نواب تھے کہ جناب حضرت غوث الاعظمؒ کی منہدیاں بھرا کرتے ہیں یعنی کھپچیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر اور کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے ہیں۔ ان نواب صاحب کے یہاں یہی مہندی روشن ہونے کی رسم تھی، جب سے اس عمارت کا نام مہندیاں کر کے مشہور ہو گیا، مگر نہیں معلوم کہ وہ نواب کون تھے جنھوں نے یہ مہندی بنائی تھی" (آثار الصنادید ص۵۰-۵۱ طبع لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

کے قبرستان میں شاہ صاحبؒ کے چاروں صاحبزادگان خود شاہ صاحبؒ کے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی قبور ہیں، جن پر کتبے نصب ہیں، جن میں ان کے سنین وفات ہیں، ان حضرات کے علاوہ خاندان کے دوسرے افراد ذکور و اناث کی قبریں ہیں، متصل مسجد ہے، جس کے قرب و جوار میں بہت سے علماء و صالحین، اور خاندان ولی اللّٰہی کے عقیدت مندوں کی کثیر التعداد قبریں ہیں، جن میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

باب پنجم

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامے

اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن

شاہ صاحب کے دائرۂ تجدید کی وسعت اور تنوّع

شاہ صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے تجدید و اصلاح امت، دین کے فہم صحیح کے احیاء، علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اپنے عہد و ملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوّع پایا جاتا ہے جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دور ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے، اس کی وجہ (توفیق اور تقدیر الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصہ میں آیا، اور وہ جامعیت، علوئے ہمت اور مخصوص تعلیم و تربیت بھی جو شاہ صاحب کے خصائص میں سے ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے علم و عمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی و اصلاحی کارنامے انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار اور اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت پر قلم اٹھانے والے کے لئے، ان کا احتواء اور ان سب کا تفصیلی و تحلیلی جائزہ لینا دشوار ہو گیا ہے، اور جو اس کا ارادہ کرے اس کی زبان بے اختیار فارسی کے اس مشہور شعر کے ساتھ

شکوہ سنج ہوجاتی ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ توزداماں گلہ دارد

ہم ان کو اگر علیٰحدہ علیٰحدہ بیان کریں توان کے حسب ذیل عنوانات ہوں گے۔

۱۔ اصلاح عقائد ودعوت الی القرآن۔

۲۔ حدیث وسنت کی اشاعت وترویج، اورفقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی

۳۔ شریعت اسلامی کی مربوط ومدلّل ترجمانی اوراسرار ومقاصدِ حدیث وسنت کی نقاب کشائی۔

۴۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اوراس کا اثبات اوررّد رفض۔

۵۔ سیاسی انتشاراورحکومت مغلیہ کے دوراحتضارمیں شاہ صاحبؒ کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار۔

۶۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اوران کو دعوتِ اصلاح وانقلاب۔

۷۔ علمائے راسخین اورمردانِ کارکی تعلیم وتربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

ہم سب سے پہلے اصلاح عقائد ودعوت الی القرآن کے عنوان کو لیتے ہیں کہ تجدید دین واصلاحِ امت کا کام کسی دوراورکسی ملک میں بھی شروع کیا جائے تواس کو اوّلیت حاصل ہوگی اور اس کے بغیراحیائے دین وملت کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ نقش برآب اورعمارت بے اساس ہوگی، قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات ومکالمات سے اورمستند تاریخ نے نائبینِ انبیاء اورعلماء ربّانیین کے طرزعمل اورترتیب کارسے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے،

اور قیامت تک یہ ہر اس اصلاح و تجدید کا دستور العمل رہے گا، جس کا مزاج نبویؐ اور جس کا نظام قرآنی ہوگا۔

عقائد کی اہمیت

مُصنّف یہاں پر اپنی ایک سابقہ تحریر کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے:۔

"اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاءے کرام ایک معیّن عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے، اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسّمہ، خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود، اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو[1] اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے، اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حدِّ فاصل، واضح اور روشن خط ہے جو انبیاءے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت، اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے

---

[1] اگرچہ اس میں بڑا شبہ ہے کہ صحیح عقیدہ کی اساس کے بغیر ایسا ممکن بھی ہے۔

درمیان کھینچ دیا گیا ہے، جس کا سرچشمۂ فکر و نظر انبیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔[1]

"حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم و معارف انسانوں تک پہونچے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری واہم علم خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے، جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہئے، یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لئے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اخروی موقوف ہے، اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا راز معلوم کرتا ہے، اسی سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعیّن کرتا، اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے تعلقات استوار کرتا ہے، اور اپنے سلکِ زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعیّن کرتا ہے"۔[2]

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ جو خصوصی رابطہ اور تائید و نصرت، رضا و محبت، اور غلبہ و عزت کا جو مؤکّد وعدہ ہے، وہ محض عقائد صحیحہ ایمانی صفات و خصوصیات اور خاص طور پر خالص اور بے آمیز عقیدۂ توحید کی بناء پر ہے ارشاد ہے:۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ	نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن (صادق)

---

[1] دستور حیات صـ۲۱-۲۲ کتاب میں آیات قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے اسوہ کی مدد سے اس کے شواہد و دلائل پیش کئے گئے ہیں، اور حدیث و سیرت کے واقعات سے اس کو مدلّل کیا گیا ہے۔ [2] ایضاً صـ۶۰

مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران ـ ۱۳۹) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔

نیز کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے' اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادیگا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار
اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بِيْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ	بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(النور ـ ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے
	تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

انبیاء کے نائبین برحق، اور علمائے ربانی جو دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں' وہ اس کو کسی جگہ پر قائم کرنے کے لئے پہلے زمین کو پورے طور پر صاف و ہموار کرتے ہیں' وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں (خواہ وہ وثنیت قدیمہ کی یادگار ہوں یا قومی و مقامی اثرات کا نتیجہ) چن چن کر نکالتے اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں' چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے' اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے' وہ نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

"شرک (مختلف شکلوں میں) نوع انسانی کی سب سے خطرناک اور پرانی بیماری ہے، وہ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے ماسوا، بندوں کے روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، وہ انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کرتا ہے، قادرِ مطلق پر اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور سمیع و بصیر اور صاحب قدرت و علم، صاحب جود و عطا اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کے لامحدود صفات، اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے کمزور و عاجز، فقیر و حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں"۔[1]

عقیدۂ توحید کی ازسرِ نو تبلیغ و تشریح کی ضرورت

مصنف نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصۂ دوم میں جو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے ساتھ مخصوص ہے، امام ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم کے عنوان کے ذیل میں لکھا تھا:۔

"غیر مسلم و عجمی اقوام کے اختلاط، اسماعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل و گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخِ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیر و مسیح اور اپنے احبار و رہبان کے

---

[1] "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" از مصنف ص۲۷

متعلق رکھتے تھے، بزرگان دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت واستغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دوہائی دینے، سوال اور دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بہ سال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا، کھلی قبر پرستی، خدا سے بے خوفی، اور صاحبِ مزار سے خوف و خشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء و استخفاف، بے باکی اور شوخ چشمی، بزرگوں کے ساتھ اعتقاد الوہیت کے درجہ تک مشاہد و مزارات کا حج، اور بعض اوقات حج بیت اللہ پر اس کی ترجیح، کہیں کہیں مساجد کی ویرانی اور کس مپرسی اور مشاہد کے رونق و اہتمام، اس زمانہ کی جاہلانہ زندگی کے وہ خط و خال تھے، جن کے دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت غور سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔"[1]

یہ مصر و شام و عراق جیسے ممالک کا حال تھا جن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے فتح کیا تھا جو مرکز اسلام، مہبط وحی، اور مسکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت قریب اور مربوط تھے، جہاں کی زبان عربی تھی، جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جہاں قرآن و حدیث کے درس کا سلسلہ ایک دن کے لئے موقوف نہیں ہوا، اور جہاں علوم حدیث اور شرح حدیث پر عظیم ترین کتابیں لکھی گئیں۔

---

[1] "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ دوم ص ۲۰۴-۲۱۵ باختصار و ترمیم۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان (وہ بھی بارہویں صدی کے ہندوستان) کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے، جہاں اسلام ترکستان، ایران اور افغانستان کا چکر کاٹ کر اور اپنی بہت کچھ تازگی اور توانائی کھو کر ان لوگوں کے ذریعہ پہونچا جو براہ راست فیضانِ نبوت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے، اور جن میں سے بہت سے اپنے نسلی اور قومی اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے تھے، پھر ہندوستان میں ہزاروں برس سے ایک ایسا مذہب، فلسفہ اور تہذیب حکمرانی کر رہے تھے، جن کے رگ و پے میں وثنیت اور شرک جاری و ساری تھا، اور جو ان آخری صدیوں میں وثنیت کا سب سے بڑا نمائندہ، اور جاہلیت قدیم کا امین و محافظ رہ گیا تھا، یہاں برہمنیت اور دوسرے مشرکانہ ماحول سے منتقل ہو کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ آغوش اسلام میں آیا تھا، پھر یہ بھی ذہن میں تازہ رہے کہ اس ملک کا (طویل تر مدت میں) قرآن و حدیث سے براہ راست وہ رابطہ نہیں رہا تھا، جو ایران کے اثر سے علوم حکمت اور فلسفۂ یونان سے رہا، علوم دینیہ میں اگر اس کا علمی و درسی طور پر رابطہ رہا تو فقہ، اصول فقہ و علم کلام سے جن کا موضوع اور میدانِ بحث، مسائل و جزئیات اور اصولِ استنباط مسائل اور عقائد پر فلسفیانہ بحث سے ہے، عقائد کی اصلاح اور توحید کی ابتدائی دعوت نہیں۔

ہندوستان کے مذاہب، فلسفوں اور یہاں کے رسوم و عادات کا دسویں ہی صدی میں مسلم معاشرہ پر جو اثر پڑ چکا تھا، اس کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اپنی ایک ارادت مند نیک خاتون کے نام لکھا ہے[1]، جس سے مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد اور طلب حوائج کے مشرکانہ عقیدہ،

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۴۱ بصالحہ از اہل ارادت۔

اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم، اور ان کے رسوم و عادات کی تقلید، بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر و ذبح کرنے، پیروں اور بیبیوں کی نیت سے روزے رکھنے، اور سیتلا سے خوف اور اس کی تعظیم (جس کو چیچک کی بیماری کی ذمہ دار دیبی سمجھا جاتا تھا) تک کی ہندوانہ ذہنیت اور توہّم پرستی کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھی، اس عہد پر اور سَو برس گزر جانے کے بعد، اور قرآن و حدیث سے براہ راست قوی اور عام رابطہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے عقائد میں جو خلل غیر اسلامی بلکہ منافی اسلام، عقائد و اعمال کا جو اثر اچھے اچھے گھرانوں پر پڑا ہو، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے اثرات، قرآن و حدیث سے ناواقفیت، اور دوری اور نتائج و خطرات اور عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے آنکھیں بند کر کے موثر کوشش کے طویل خلا نے ہندوستان میں جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اور دین حنیفی کے (جس میں شرک کی کسی پرچھائیں کی گنجائش نہ تھی) متوازی جو نظام عقائد اور مسلم معاشرہ کی زندگی کے میدان میں جاہلیت کا جو سبزۂ خودرو پیدا ہو گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ خود شاہ صاحب کی کتابوں کے بعض اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

"تفہیمات" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"نبی کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کر لو گے، اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے، وہاں تم بھی قدم رکھو گے حتّٰی کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور کون ؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں، جنھوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنالیا ہے، اور یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے، ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جو کلامِ شارع میں تحریف کرتے ہیں، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں، اور گنہگار میرے لئے، یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ " لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً ط (البقرہ۔ ۸۰) (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں، جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلۂ توحید میں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پرواہ نہیں ہے"۔[1]

اپنے شہرۂ آفاق رسالہ " الفوز الکبیر " میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" اگر تم کو (عہد جاہلیت کے) مشرکین کے عقائد واعمال کے اس بیان[2] کے صحیح تسلیم کرنے میں کچھ توقف ہو، تو چاہیئے کہ اس زمانہ کے تحریف کرنے والوں کو علی الخصوص جو دار الاسلام کے نواح میں رہتے ہیں، دیکھو کہ انھوں نے

---

[1] التفہیمات الالہٰیہ جلد دوم ص ۱۳۴-۱۳۵ [2] شاہ صاحب نے اس سے پہلے مشرکین جاہلیت کے شرک کی حقیقت و نوعیت اور اس کے مظاہر کا تذکرہ کیا ہے۔

ولایت کی نسبت کیا خیال باندھ رکھا ہے، وہ لوگ باوجودیکہ اولیائے متقدمین کی ولایت کے معترف ہیں، مگر اس زمانہ میں اولیاء کے وجود کو قطعاً محال شمار کرتے ہیں اور قبروں اور آستانوں پر پھرتے ہیں اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں، اور تحریف و تشبیہ نے ان کے اندر کس قدر رسوخ پکڑا ہے، بموافق حدیث صحیح "لتتبعنّ سُنَنَ من کان قبلکم" (تم اپنے پیشرو لوگوں کے نقش قدم پر چلوگے) ان آفات میں سے کوئی آفت بھی نہیں رہی، جس پر آج مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت کاربند، اور اس کے مانند دیگر امور کی معتقد نہ ہو"عافانا اللّٰہ سبحانہ عن ذالک[1]"

مرض کا علاج اور اصلاحِ حال کا مؤثر طریقہ، اشاعتِ قرآن

شاہ صاحبؒ نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لئے قرآن مجید کے مطالعہ و تدبّر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا، اور یہ بات محض ذہانت، قوتِ مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی، جس پر قرآن مجید خود شاہد، اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخِ دعوت اور سرگذشتِ اصلاح و تجدید گواہ ہے، خاص طور پر حقیقتِ توحید، اور حقیقتِ شرک کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقتور، اور دل نشین ذریعہ کا تصور نہیں ہو سکتا، ترجمانِ قرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے مقدمہ "موضح القرآن" میں جتنے سادہ اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اس سے زیادہ مشکل ہے، فرماتے ہیں:۔

---

[1] الفوز الکبیر ص۸-۹ مکتبہ محمدی۔

• بتلانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں[1]"

حجاز مقدّس کے قیام میں شاہ صاحبؒ کو ہندوستان کی اس دینی صورت حال اور اس کے تعلیمات قرآن، اور تعلیمات اسلام سے بُعد اور منافات کا احساس اور شدّت سے پیدا ہوا ہوگا، اور وہاں کی نورانی، روحانی اور قرآنی فضا میں جہاں سے توحید کا زمزمہ سب سے پہلے بلند ہوا، شاہ صاحبؒ کے قلب بیدار میں اس کا داعیہ کہ وہ ہندوستان میں قرآن مجید کی دولت کو عام کریں ایسی وضاحت اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا جس کو اس الہام اور اشارۂ غیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو نفوس زکیّہ پر ہر عہد میں کسی ضروری دینی کام کی تکمیل کے لئے وارد ہوا کرتا ہے، اور جس کی مقاومت، اور جس پر غلبہ پانا ناممکن ہو جاتا ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے قرآن مجید کے فارسی ترجمہ کا کام جس نے "فتح الرحمٰن" کے نام سے تکمیل پائی حجاز سے واپسی پر شروع فرمایا۔[2]

---

[1] مقدمہ "موضح القرآن" حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ، [2] مصنف "حیات ولی" نے ایک معاصر کے حوالہ سے ترجمۂ قرآن کے قصور میں علماء کی شورش اور مفسدوں کے شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کی پُر اثر کہانی بیان کی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اس شورش سے بچنے کے لئے حجاز کا سفر اختیار کیا، (ص ۴۱۸-۴۲۳)

لیکن کسی اور تاریخی ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، خود "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں اس کی تصریح ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ کا کام ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ کو شروع کیا اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، جس سے صاف طریقہ پر ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا یہ مبارک اقدام سفر حجاز سے واپسی کے بھی چار پانچ سال بعد کا ہے، ہمارے خاندانی ذخیرۂ کتب میں فتح الرحمٰن کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں میں محفوظ ہے، یہ نسخہ خود شاہ صاحبؒ نے ہمارے خاندان کے (باقی ص ۱۴۲ پر)

اس وقت ہندوستان کیا تقریباً تمام عجمی ممالک میں جن میں ترکستان وایران اور افغانستان ہندوستان کے قریبی ہمسایہ تھے، ———— اور انھیں کے رجحانات، مشاغل، ذوق اور تسلیم شدہ حقائق کا سایہ ہندوستان کی علمی و دینی حلقوں پر پڑتا تھا، یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ قرآن مجید اخص الخواص طبقہ کے مطالعہ، غور وفکر اور فہم و تفہیم کی کتاب ہے، جس کا سمجھنا ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے، اس کو عوام میں لانا، عوام کو براہ راست اس کے مطالب سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کی دعوت دینا سخت خطرناک، ایک بڑی گمراہی اور فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مرادف ہے، اور عوام میں ذہنی انتشار، خود رائی، اور علماء سے بے نیازی، بلکہ بغاوت اور سرکشی کی دعوت دینا ہے، اس طرز خیال اور دلیل کو ایک مختصر رسالہ "تحفۃ الموحدین"[لہ] میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے:-

"بعض لوگ کہہ بیٹھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو بہت سے

(باقی ص۱۴۱ کا) ایک متوسّل میاں محمد اعظم عثمانی نصیر آبادی کو جو شاہ صاحب سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، ہدیہ فرمایا، میاں محمد اعظم حضرت سید محمد نعمان (عم حقیقی حضرت سید احمد شہیدؒ) کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، یہ نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ محدث شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی ملکیت میں آیا، اور منتقل ہوتے ہوئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیٔؒ کے پاس پہونچا، اس نسخہ کی کتابت ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوئی یعنی شاہ صاحبؒ کی وفات سے گیارہ سال پہلے، یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ فتح الرحمٰن کی تکمیل سفر حجاز سے واپسی کے بعد کا کارنامہ ہے، سفر حجاز سے پیشتر صرف سورۂ بقرو نساء کا ترجمہ ہوا تھا۔ لہ یہ رسالہ شاہ صاحبؒ کے نام اور نسبت کے ساتھ شائع ہوا ہے، لیکن چونکہ شاہ صاحب کی تصنیفات و رسائل کے قدیم تذکروں اور فہرست تالیفات میں عام طور پر اس کا نام نہیں آتا، اس لئے ہم جزم و وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے البتہ جو مضمون نقل کیا جا رہا ہے وہ اس طرز خیال کی صحیح ترجمانی ہے جو عام طور پر پھیلا ہوا تھا، اور اس میں اس کا جواب شافی بھی موجود ہے۔

علم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہوا ہو، اور اپنے زمانہ کا علّامہ ہو، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ" (الجمعہ۔۲) (خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے اَن پڑھوں میں پیغمبر بھیجا انھیں اَن پڑھوں میں سے، پڑھتا ہے وہ پیغمبر ان اَن پڑھوں پر خدا کی آیتیں، اور ان کو گناہ کے میل سے پاک کرتا، اور کتاب اور اس کی تدبیر سکھاتا ہے) یعنی رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی اَن پڑھ اور آپؐ کے اصحاب بزرگوار بھی اَن پڑھ تھے، مگر جب رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں، تو وہ ان کو سُن کر ہر قسم کی بُرائی اور بگاڑ سے پاک صاف ہو گئے، پس اگر ناخواندہ آدمی قرآن و حدیث نہیں سمجھ سکتا، اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا تو صحابہؓ بُرائی اور عیبوں سے کیونکر پاک صاف ہو گئے؟ اس قوم پر سخت افسوس ہے، جو "صدرہ" سمجھنے اور "قاموس" جاننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں، مگر قرآن و حدیث کو سمجھنے میں اپنے آپ کو محض نادان ظاہر کرتے ہیں، اور بعضے یوں کہتے ہیں کہ ہم پچھلے لوگ ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ کی برکت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل کی سلامت کہاں سے لائیں، جو قرآن و حدیث کے معنی بخوبی سمجھ سکیں، ان کے جواب میں حق تعالیٰ فرماتا ہے، "وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" (الجمعہ۔۳) یعنی پچھلے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں، یا اَن پڑھ مگر جبکہ وہ مسلمان ہوں، اور اصحاب کے طریقہ کی پیروی کا ارادہ کریں، اور قرآن و حدیث کو سنیں تو انھیں بھی پاک کرنے کے لئے یہی قرآن و حدیث کافی ہو سکتی ہیں، اور فرماتا ہے "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ

لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" (القمر ۲۲) (اور البتہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے واسطے آسان کر دیا، پس کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟) یہ کیونکر آسانی ہو سکتی ہے کہ "کافیہ" پڑھنے والے اور "شافیہ" جاننے والے تو اس کے معنی سمجھنے سے عجز ظاہر کرتے، اور عرب کے جنگلی لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ایک جگہ یوں فرمایا ہے، "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ" (محمد ۲۴) کہ (قرآن میں کیوں نہیں فکر کرتے) پس اگر قرآن مجید آسان نہ ہو تو اس میں فکر کیونکر کیا جائے" "اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" (محمد ۲۴) (یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں) یعنی باوجودیکہ دلوں پر قفل نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے قرآن کے فکر میں زور نہیں لگاتے؛[1]

لیکن بقول شاعر ؎

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی
حُدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

شاہ صاحب نے اس بد مذاقی، بے توفیقی اور غلط اندیشی کو دیکھ کر جس کے حدود "وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (الاعراف ۱۴۵) سے مل جاتے تھے فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کا اس سلیس فارسی زبان میں ضرور ترجمہ کرنا چاہئے، جو ہندوستان میں قیامِ حکومت اسلامیہ کے بعد سے ملک کی دفتری، علمی، تصنیفی، اور خط و کتابت کی زبان تھی، اور تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان اگر اس میں بول لکھ نہیں سکتا تھا، تو اس کو سمجھتا ضرور تھا، ہندوستان میں فارسی زبان کی اس طویل عملداری میں جس کی مدت سات صدیوں سے کم نہ تھی، قرآن مجید کے فارسی میں ایک درجن بھی

---

[1] تحفۃ الموحدین ص ۵-۶-۷ مطبوعہ المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ۔ لاہور۔

ترجمے ہوتے تو تعجب کی بات نہ تھی، لیکن حسن بن محمد علقمی المشتہر بنظام نیشاپوری ثم دولت آبادی کے ترجمہ سے پہلے جو آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں تھے، کسی فارسی ترجمہ کا سُراغ نہیں لگتا نیشاپوری کا یہ فارسی ترجمہ ان کی عربی تفسیر "غرائب القرآن" میں شامل ہے[1]۔

ہندوستان میں شیخ سعدیؒ کے ترجمہ کے نام سے ایک ترجمہ مشہور تھا، اور اگرچہ وہ بھی شیخ کی مقبول "تصنیفات" "گلستان" اور "بوستان" کی طرح رائج اور متداول نہیں تھا لیکن پھر بھی کہیں کہیں پایا جاتا تھا، مگر اس کا انتساب شیخ سعدیؒ کی طرف صحیح نہیں ہے، تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ علامہ سید شریف علی الجرجانی (م ۸۱۶ھ) کا کیا ہوا ہے، تفسیر حقانی کے مؤلف مولانا عبدالحق حقانی کا چشم دید بیان ہے کہ:۔

"جس کو آج کل جہلاء سعدیؒ کا ترجمہ کہتے ہیں، وہ دراصل سید شریف کا ترجمہ ہے، صاحبِ مطبع نے میرے سامنے رواج دینے کے لئے سعدیؒ کی طرف منسوب کردیا ہے[2]۔"

الغرض شاہ صاحب نے سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد (غالباً اصلاح عقائد کی ان کوششوں کا نتیجہ دیکھنے کے بعد جو خصوصی درس وتدریس اور وعظ وارشاد کے ذریعہ ہورہی تھیں) یہ فیصلہ کیا کہ ہدایتِ عام، اصلاحِ عقائد اور اللہ تعالیٰ سے طاقتور رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایت وتعلیمات کی براہ راست اشاعت وتبلیغ سے زیادہ مؤثر نہیں ہوسکتا، اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کی اشاعت، خود شاہ صاحب کی زبان سے اس کے محرکات واسباب

---

[1] "جائزہ تراجم قرآنی" شائع کردہ مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند، ص۱۳-۱۴

[2] البیان فی علوم القرآن مقدمہ تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق صاحب حقانی ص۵۰۷

اور اس اقدام کی تاریخ سنیئے تفسیر "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

"یہ زمانہ جس میں کہ ہم لوگ موجود ہیں، اور یہ ملک جس کے ہم باشندہ ہیں، اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ (ترجمۂ قرآن سلیس اور بامحاورہ فارسی میں بغیر اظہار فضیلت اور عبارت آرائی کے اور متعلق قصوں اور توجیہات کے ذکر کئے ہوئے بغیر) کیا جائے، تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں، اور چھوٹے بڑے سبھی معانیٔ قرآن کا ادراک کر سکیں، اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا، اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔

پہلے ترجموں پر غور کیا گیا تاکہ جس ترجمہ کو معیار کے مطابق پایا جائے اس کی ترویج کی جائے، اور یہ ترجمہ حتی الامکان اہل زمانہ کے ذوق کے مناسب ہو، مگر ان ترجموں میں یا تو بے کیف طوالت ہے یا خلل انداز تقصیر و اجمال ہے، اس عرصہ میں زہراوین (سورہ بقرو نساء) کا ترجمہ ہو گیا، اس کے بعد سفر حرمین کا اتفاق ہو گیا، اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا، کئی سال بعد ایک عزیز ترجمۂ قرآن پڑھنے لگے، اور یہ کام اس گزشتہ عزم کا محرّک بن گیا، اور یہ فیصلہ ہوا کہ سبق کے بقدر ترجمہ لکھ لیا جائے، جب ثلث قرآن مجید تک ترجمہ ہو گیا، تو ان عزیز کو سفر پیش آگیا اور ترجمہ پھر موقوف ہو گیا، ایک مدت کے بعد پھر ایک تقریب پیدا ہوئی اور وہ پرانا خیال تازہ ہوا اور دو ثلث تک ترجمہ ہو گیا۔

بعض دوستوں کو مسودہ صاف کرنے کے لئے کہا گیا اور یہ کہ اس کے ساتھ متن قرآن بھی لکھ دیں تاکہ مستقل نسخہ تیار ہو جائے، ان سعادت مند دوست نے عید الاضحیٰ سنہ ۱۱۵۰ھ سے تبییض شروع کی اس کے بعد پھر اس عزم کو تحریک ہوئی،

اور اخیر تک ترجمہ مکمل ہوگیا، اور اوائل شعبان میں تسوید ختم ہوئی، اور ۱۱۵۱ھ میں مسودہ صاف ہوگیا، اور ۱۱۵۶ھ میں برادر دینی عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالیٰ بشہودہ کے اہتمام سے اس کتاب کی ترویج ہوئی اور اس کا درس شروع ہوا، اور اس کے متعدد نسخے تیار ہوگئے، اور معاصرین اس طرف متوجہ ہوئے ؎

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می بست
آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر پدید[1]

شاہ صاحب نے ترجمہ اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑا بصیرت افروز اور عالمانہ ہے ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

"یقول الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبد الرحیم
ایں رسالہ ایست در قواعد ترجمہ مسماۃ بالمقدمۃ فی قوانین الترجمۃ
کہ در وقت تسوید ترجمۂ قرآن قلم بہ ضبط آں جاری شد"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور قرآن مجید کی تبلیغ عام کے راستہ میں جو چٹان حائل ہوگئی تھی، شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے (جس کے علمی تبحر، جامعیت، باطنی مرتبے اور اخلاص پر تقریباً اس عہد کے صحیح الخیال اور صاحبِ علم طبقہ کا اتفاق تھا) اقدام سے یہ چٹان ہٹ گئی، اور راستہ صاف ہوگیا، اسلام کی تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ کسی مسلّم الثبوت اور بلند شخصیت کے کسی کام کے آغاز کر دینے سے غلط فہمیوں اور

---

[1] دیباچہ فتح الرحمٰن مطبوعہ دہلی ۱۲۹۴ھ۔ [2] مخطوطہ محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء مشتمل بر شش صفحات تقطیع کلاں۔

بدگمانیوں کا بادل چھنٹ گیا ہے، اور شاہ راہ عام کھل گئی ہے، امام ابوالحسن اشعری کا متکلمانہ مباحث میں حصہ لینا اور عقلی استدلال سے کام لینا، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا فلسفہ کا مطالعہ اور اس کی تنقیح و تردید، اور ایسے بہت سے اقدامات جو اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق اسلام کی حفاظت یا مدافعت میں کئے گئے، اس کی روشن مثالیں ہیں۔

شاہ صاحب کے بعد کے اردو تراجم

شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارہویں صدی کے آخری ہی حصہ میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کر دی تھی، اور اردو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع ہو گیا تھا[1]، اس ضرورت اور انقلاب حال کو سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی (م ۱۲۳۰ھ) نے محسوس کیا، اور ۱۲۰۵ھ میں گویا شاہ صاحب کے ترجمہ کے پچاس برس بعد انھوں نے با محاورہ اردو میں اس کا ایسا ترجمہ کیا جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا کسی غیر عربی زبان میں ایسا کامیاب اور شگفتہ ترجمہ جس میں زیادہ سے زیادہ قرآنی الفاظ کی روح آئی ہو ابھی تک علم میں نہیں، شاہ صاحبؒ اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

> "اس بندۂ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شاہ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے، الحمد للہ کہ

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی حصہ ۱ ص ۷۲-۷۷

یہ آرزو ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں حاصل ہوئی"[1]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بعد انھیں کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ) نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، جو اپنی احتیاطوں اور مصنف کے علمی تبحر و اخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا، اور بعض حلقوں میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور بعض حلقوں میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تحت اللفظ ترجمہ رائج اور قابل ترجیح قرار پایا۔

یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رواج ہوا جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی، جہاں تک اصلاح عقائد اور عقیدۂ توحید کی اشاعت کا تعلق ہے، ان دونوں ترجموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی کوئی تعداد نہیں بیان کی جاسکتی کہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہوگی، حقیقت میں کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت و اصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی تھی جو ان تین ترجموں نے انجام دیا، جو ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں" وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"

اس کے بعد اردو ترجموں کا ایک سیلاب رواں ہوگیا جس کی تعداد کا استقصاء ایک دشوار کام اور مستقل تحقیقی بحثوں کا طالب ہے[2]۔

---

[1] موضح القرآن جلد اول ص ۲

[2] اس وقت ہمارے سامنے "جائزۂ تراجم قرآنی" کے نام کی کتاب ہے، اس میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجموں کے بعد کے جن ترجموں کا جائزہ لیا گیا اور مختصر تعارف کرایا گیا ہے، ان کی تعداد پچپن ۵۵ ہے۔

درس قرآن

قرآن مجید کے ان اردو تراجم کے علاوہ جو اسی خاندان والا شان کے دو برگزیدہ افراد حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کئے، اور ہندوستان میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی تھی گھر گھر پڑھے جانے لگے، قرآن مجید کے ذریعہ تطہیرِ عقائد اور اصلاحِ اعمال و اخلاق کی سب سے طویل، سنجیدہ و عمیق اور مؤثر و وسیع کوشش خاندانِ ولی اللٰہی کے سب سے بڑے فرد اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے کاموں کی تکمیل و توسیع کی سعادت حاصل کرنے والے بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) کے ذریعہ انجام پائی، جنھوں نے تقریباً ۶۲-۶۳ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور تیرھویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو خواص و عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس سے اصلاحِ عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا ہمارے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

"الفوز الکبیر"

دعوت الی القرآن اور خواص و اہل علم کے حلقہ میں تدبّر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے امت کی اصلاح کا جذبہ بیدار کرنے کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک تجدیدی و انقلابی خدمت اور کارنامہ "الفوز الکبیر" کی تصنیف ہے، جو اپنے موضوع پر (ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانہ میں) منفرد کتاب ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی، صرف چند اصول و قواعد تفاسیر کے

مقدمہ میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لئے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے، اور در حقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے۔

اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو، بعض بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے ہیں، دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتے، اسی رسالہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ:-

میگوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم
عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم چوں
بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ
کشادند خواست کہ بعضے نکات
نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں را
بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط
نماید امید واری از عنایت حضرت
باری آں است کہ طالب علماں را
بہ مجرد فہم ایں قواعد راہے واسع
در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ
اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گزرانیدن

فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم (اللہ ان کے ساتھ
اپنے لطف عظیم کا معاملہ فرمائے) کہتا ہے کہ
جب اللہ نے اس فقیر پر کتاب اللہ کے
فہم کا دروازہ کھولا تو اس کی خواہش
ہوئی کہ بعض مفید نکات (جن سے
لوگوں کو تدبر قرآن میں مدد ملے گی)
ایک مختصر رسالے میں لکھ دیئے جائیں
عنایت خداوندی سے امید ہے کہ
طالب علموں کے لئے ان قواعد کے
فہم کے بعد فہم مطالب قرآن کی
ایسی کشادہ راہ مل جائے گی کہ اگر

آنہا بر مفسران علیٰ انہم اقل قلیل فی هذا الزمان لسر برند بآن ضبط وربط بدست نیازند"[1]	مطالعۂ تفاسیر اور مفسرین (جن کی تعداد آجکل بہت ہی کم ہے) سے رجوع کرنے میں ایک عمر بھی گزاریں گے تب بھی فہم قرآن سے ایسا ربط وضبط نہ پیدا کر سکیں گے۔

قرآن کے مضامین ومقاصد، اس کے طرز واسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف وامتیاز اور شانِ نزول کے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں، شانِ نزول کی روایتوں کی کثرت اور ان کی اہمیت پر زیادہ زور دینے سے (جو قرونِ متاخرہ کا شعار بن گیا تھا) قرآن کریم کے مضامین وقصص اور مواعظ وعبر سے ہر زمانہ میں جو فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے اور اپنے اپنے زمانہ اور حالات پر ان کا جس طرح انطباق ہونا چاہیئے، اس میں بڑا فرق ہو گیا تھا، شاہ صاحب کی اس تحقیق وتنقیح سے وہ پردہ ہٹ جاتا ہے اور قرآن مجید کا جمالِ جہاں آرا سامنے آجاتا ہے "الفوز الکبیر" کے باب اول میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"عام مفسّرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے، اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے، اس لئے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں

---

[1] الفوز الکبیر

عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لئے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع،
اور آیات تذکیر کے نزول کے لئے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت
و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا، خاص واقعات کو جن کے
بیان کرنے کی عام مفسرین نے زحمت اٹھائی ہے، اسباب نزول میں چنداں دخل
نہیں ہے، مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے، جو
رسول اللہ صلعم کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔"[1]

قرآن مجید نے جن فرقوں کی تردید کی ہے، ان کے اصلی اور صحیح خیالات و عقائد اور کمزوریوں کا بیان ان کی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے حقیقی اسباب اور ان کی تاریخ، نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر ان کی تطبیق، فہم قرآن کی اساس ہے، جو اختصار کے باوجود اس وضاحت کے ساتھ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں ملے گی۔

نسخ میں متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح اور منسوخ و ناسخ آیات میں تطبیق، صحابہ و تابعین کے تفسیری اختلافات کا حل شاہ صاحبؒ کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے۔

نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدم مطابقت کی جو توجیہ شاہ صاحب نے کی ہے، اس کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو نحو کی تدوین کی تاریخ سے واقف اور بصرہ و کوفہ کے دبستان کے اختلافات پر نظر رکھتے ہیں، رسالہ کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر ادیان سابقہ، فرقِ ضالّہ اور اقوام و ملل کی پرانی بیماریوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کی توفیق ملتی ہے کہ قرآن کے آئینہ میں مسلمانوں کی نسلیں اور اپنے اپنے عہد کا مسلم معاشرہ اور طبقات امت اپنا چہرہ دیکھیں اور اس کی فکر کریں کہ مذاہب و فرق کی سابقہ بیماریاں اور کمزوریاں دبے پاؤں ان میں تو

---

[1] الفوز الکبیر باب اول ص۳-۴

داخل نہیں ہوگئی ہیں :۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ انبیاء ۔ ۱۰)	ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

مسئلہ توحید کی علمی تنقیح و تحقیق

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے ترجمہ اور درس قرآن ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک عالم و محقق کے انداز سے اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، عقیدۂ توحید ملت ابراہیمیؑ کا سب سے بڑا شعار اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور جدو جہد کا سب سے بڑا مقصد، خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی بنیاد اور ابتدا اور انتہا تھی، سارا قرآن اور احادیث کا دفتر اور سیرت نبویؐ اس پر شاہد ہے، آپ نے توحید و شرک کے درمیان ایسا خطِ امتیاز کھینچا، توحید کی حقیقت کو اس طرح عیاں کیا، شرک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ اور اس کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں کے خلاف ایسا جہاد کیا، امت کے عقائد میں شرک کے داخل ہو جانے اور عقائد میں فتور واقع ہونے کے ذرائع کا ایسا سدِّ باب کیا جس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں[1]، یہ سب حقائق ایسے متواتر اور بدیہی ہیں، جن کے لئے دلائل اور مثالوں کی ضرورت نہیں، جس کی قرآن و حدیث پر ذرا بھی نظر ہے،

---

[1] قبور کی تشئید، ان پر اجتماعات اور اعیاد کے اہتمام، سجدۂ تعظیمی، حلف بغیر اللہ کی ممانعت کے احکام، ایک بدو کے اِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ (اگر اللہ چاہے اور آپ چاہیں) کہنے پر سخت ناگواری اور یہ فرمانا کہ "تو نے مجھے خدا کا ہمسر بنا دیا؟ نہیں تنہا جو اللہ چاہے" اور ایسی ہی بیسیوں مثالیں اس بات کی شاہد ہیں۔

وہ اس کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پھر اس امت میں قرون مشہود لہا بالخیر کے گزرنے، نئے نئے ملکوں کے فتح ہونے، وہاں کی آبادی کے قبول اسلام، غیر مسلم اقوام کی مخالطت و مجاورت، اور مرور زمانہ کے اثر سے عوام کے ایک بڑے طبقہ میں یہ مشرکانہ عقائد و اعمال کہاں سے داخل ہو گئے، اور ان کو توحید کے بہت سے شعائر و علامات کے ساتھ مسلم معاشرہ میں اپنی جگہ بنا لینے کا کیسے موقعہ مل گیا، اور بہت سے مدّعیان علم کو ان کی تاویل اور توجیہ کی اور ان کو گوارہ کرنے اور جائز قرار دینے کی جرءت کیسے ہوئی، اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمان کیسے اس مغالطہ کے شکار ہو گئے۔؟

شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کی وجہ توحید کی حقیقت، اور مشرکین جاہلیت اور اہل عرب کے خدا کے خالق کائنات اور مدبر امور عظام ہونے کے بارے میں عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہے، عوام کے ایک بڑے طبقہ نے شرک کی حقیقت یہ سمجھی کہ کسی ہستی کو (خواہ وہ زندہ ہو یا فوت شدہ) خدا کا بالکل ہمسر اور ہم پایہ بنا لیا جائے، خدا کی تمام صفات اور افعال اس کی طرف منسوب کئے جائیں، اسی کو خالق، رازق، اور محیی و ممیت (زندہ کرنے والا اور مارنے والا) حقیقتاً و اصالتاً سمجھ لیا جائے، باقی اللہ تعالےٰ کی بعض صفات کا اس کے کسی مقبول بندہ کی طرف منسوب کرنا اور بعض افعال کا (جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں) ان سے صدور ماننا، قدرت کے بعض کارخانوں کا ان سے متعلق ہو جانا، اور اللہ کا اپنی مرضی سے اپنے بعض اختیارات ان کے سپرد کر دینا، یہ توحید کے منافی اور شرک کے مرادف نہیں، اسی طرح کسی کی محض تقرّب الی اللہ، اور شفاعت عند اللہ کے لئے ایسی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم کرنا اور ان کے ساتھ ایسے اعمال و حرکات سے پیش آنا جو عبادت کے حدود میں داخل ہیں، داخل شرک نہیں کہ یہ محض رضائے خداوندی کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس بارگاہ بے چون و بے چگوں تک

پہونچنے کا (جس کے یہاں معمولی بشر کی رسائی نہیں) ایک مفید اور مؤثر طریقہ ہے کفار عرب کہتے تھے:۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر۔۳) (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

یہ وہ مغالطہ اور التباس تھا، جس کی وجہ سے اس امت کے بھی کثیر التعداد افراد شرک کی ارض ممنوعہ میں جا پڑے تھے، اور اس سرحدی لکیر کو پار کر گئے تھے، جو توحید و شرک کی حد فاصل (LINE OF DEMARCATION) ہے، اس لئے سب سے پہلی اور اہم ضرورت یہ تھی کہ معلوم کیا جائے کہ اہل جاہلیت اور مشرکین عرب کا عقیدہ اللہ تعالےٰ کے بارے میں کیا تھا، وہ اس کی ذات و صفات کے بارے میں کن کن چیزوں کے قائل تھے، اللہ تعالےٰ کو فاطر کائنات، خالق ارض و سماوات، اور قادر مطلق سمجھنے کے باوجود اللہ کے رسول نے ان کو کیوں مشرک گردانا، اور قرآن نے ان کے مشرک ہونے کا کیوں اعلان کیا؟

شاہ صاحبؒ اپنی بے نظیر کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں لکھتے ہیں:۔

"شرک یہ ہے کہ ماسوا اللہ کے لئے ان صفات کو ثابت مانا جائے جو خدا تعالےٰ کے ساتھ مختص ہوں، مثلاً عالم کے اندر تصرفاتِ ارادی جس کو کُن فیکون سے تعبیر کرتے ہیں، یا علم ذاتی جس کا اکتساب نہ حواس کے ذریعہ سے ہو نہ عقل کی رہنمائی سے اور نہ خواب اور الہام وغیرہ کے واسطہ سے، یا مریضوں کو شفا دینا یا کسی شخص پر لعنت کرنا اور اس سے ناراض ہونا جس کے باعث اس کو تنگ دستی اور بیماری اور شقاوت گھیر لیں، یا رحمت بھیجنا جس سے اس کو فراخ دستی، تندرستی اور سعادت حاصل ہو۔

مشرکین بھی جواہر (اجسام) اور عظیم الشان امور کے پیدا کرنے میں کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک نہیں جانتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ جب خدا تعالیٰ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو کسی میں اس کے روکنے کی قدرت نہیں ہے، ان کا شرک فقط ایسے امور کی نسبت تھا جو کہ بعض بندوں کے ساتھ مخصوص تھے، ان لوگوں کا گمان تھا کہ جیسے شاہان عظیم القدر اپنے مقرّبان خاص کو ملک کے مختلف حصوں کا فرماں روا مقرر کرتے ہیں، اور بعض امور خاصّہ کے فیصل کرنے میں (جب تک کوئی شاہی حکم صریح موجود نہ ہو) ان کو مختار بنا دیتے ہیں، اور اپنی رعایا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود انتظام نہیں کرتے، اور اپنی کل رعایا کو حُکّام کے سپرد کردیتے ہیں، اور حکام کی سفارش ان کے ماتحت ملازمین اور متوسلین کے حق میں قبول کی جاتی ہے، ایسے ہی بادشاہ علی الاطلاق جلّ مجدہٗ نے بھی اپنے خاص بندوں کو رتبۂ الوہیت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اور ایسے لوگوں کی رضامندی وناراضی دوسرے بندوں کے حق میں مؤثر ہے، اس لئے وہ ان بندگان خاص کے تقرّب کو ضروری خیال کرتے تھے، تاکہ بادشاہ حقیقی کی درگاہ میں مقبولیت کی صلاحیت پیدا ہوجائے، اور جزائے اعمال کے وقت ان کے حق میں شفاعت درجۂ قبولیت حاصل کرے، اور ان خیالی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ ان کو سجدہ کرنا اور ان کے لئے قربانی کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا، اور ضروری امور میں ان کی قدرت کُن فیکون سے مدد لینا جائز سمجھتے تھے، انھوں نے پتھر، پیتل اور سیسہ وغیرہ کی مورتیں بنا کر ان (بندگان خاص) کی روحوں کی طرف متوجہ ہونے کا ایک وسیلہ قرار دیا تھا،

لیکن رفتہ رفتہ جہلاء نے ان پتھروں ہی کو اپنا اصلی معبود سمجھنا شروع کر دیا اور خلط عظیم واقع ہوا[1]۔"

نیز "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:۔

"شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کے بارے میں جو قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ رکھے کہ اس سے جو غیر معمولی افعال و واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ اس بناء پر ہیں کہ وہ شخص صفات کمال میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متّصف ہے، جس کا مشاہدہ نوع انسانی کے افراد میں نہیں ہوا، وہ صفت واجب الوجود جلّ مجدہٗ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، اس کی چند ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ واجب الوجود اپنے کسی مخلوق کو خلعت الوہیت سے سرفراز کرے، یا وہ مخلوق ذات الٰہی میں فنا ہو کر باقی باللہ بن کر رہ جائے، یا اسی طرح کی کوئی شکل جو اس عقیدہ کے حامل نے اپنی طرف سے گڑھ لی ہو، حدیث میں مشرکین کے جس تلبیہ (حج میں لبّیک لبّیک کہنا) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں وہ اسی عقیدہ کا ایک نمونہ اور اس کی مثال ہے، حدیث میں آتا ہے کہ مشرکین عرب (جاہلیت میں اور اسلام قبول کرنے سے پہلے) ان لفظوں میں لبیک کہتے تھے:

لبّیک لبّیک لاشریک لک،	خدایا! حاضر ہوں، حاضر ہوں!
إلّا شریکاً هو لک، تملکہ	تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس
وما ملک۔	شریک کے جو تیرا بندۂ خاص ہے تو

---

[1] الفوز الکبیر ماخوذ از ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب انصاری ص ۸-۷

اس کا بھی مالک ہے اور اس کی مملوکات

کا بھی مالک۔

اسی بناء پر یہ معتقد اس ہستی کے لئے (جس کو وہ خدا کے بعض صفات کا حامل اور خلعت الوہیت سے سرفراز سمجھتا ہے) اپنے انتہائی تذلّل اور فروتنی کا اظہار کرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے، جو بندوں کو خدا کے ساتھ کرنا چاہئے۔"[1]

حجۃ اللہ البالغہ میں ایک دوسری جگہ مشرکین کے شرک کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اور اس بات کی وضاحت فرماتے ہوئے کہ اللہ تبارک و تعالٰے کے بارے میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان (جو صحیح عقیدہ کے حامل ہیں) کئی باتوں پر اتفاق تھا، مشرکین عرب وجود باری اور اس کی یگانہ شان اور قدرت مطلقہ کے منکر نہیں تھے، صرف بعض صفات اور اختیارات میں وہ (خدا ہی کی مرضی اور منشا سے) اس کے بعض مقرّبین و محبوبین کو شریک اور صاحبِ اختیار سمجھتے تھے، اور اس لئے ان کے ساتھ عبودیت اور بندگی کا معاملہ کرتے تھے، باب التوحید کے عنوان کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"مشرکین اس بارے میں مسلمانوں ہی کے ہم خیال اور ہم عقیدہ تھے کہ امور عظام کے سرانجام اور جس چیز کا اللہ تعالٰے فیصلہ فرمالیں اور اس کا ارادہ قطعی ہوجائے تو اس میں کسی غیر کا اختیار باقی نہیں رہتا، باقی دوسرے امور میں انھوں نے مسلمانوں سے الگ راستہ اختیار کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ زمانۂ ماضی کے صلحاء نے عبادت کی کثرت کی اور خدا کا قُرب حاصل کیا تو اللہ تعالٰے نے ان کو الوہیت کا خلعت عطا فرمایا، اس بناء پر وہ خدا کے دوسرے بندوں کی عبادت کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۶۱ باب اقسام الشرک۔

مستحق بن گئے، جیسے شہنشاہ کا کوئی (مزاج داں) غلام بادشاہ کی خدمت کا حق ادا کر دے تو شہنشاہ اس کو بادشاہی کا خلعت عطا فرماتا ہے، اور اپنے ملک کے کسی شہر کا انتظام اس کے سپرد کر دیتا ہے، تو اس طرح وہ شہر کے باشندوں کی سننے اور بات ماننے کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ اس بات کے قائل تھے کہ خدا کی بندگی جب ہی قبول ہو سکتی ہے، جب ایسے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی غلامی بھی اس میں شامل ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے اس قدر بالا و برتر ہے کہ براہ راست اس کی عبادت کچھ کارگر اور اس کی وہاں رسائی نہیں ہے، ضروری ہے کہ ان مقربان بارگاہ الٰہی کی عبادت کی جائے، تاکہ وہ اللہ تک پہونچا دیں، وہ کہتے تھے کہ یہ (مقربین) سنتے، دیکھتے اور اپنے بندوں کی سفارش کرتے ہیں، اور ان کے معاملات کا انتظام کرتے اور ان کی مدد کرتے ہیں، انھوں نے ان کے ناموں پر پتھر تراشے، اور ان کو اپنا قبلۂ توجہ بنا لیا، بعد میں وہ لوگ آئے جو ان بتوں اور جن کے نام پر یہ بت تھے، ان کے درمیان فرق کو نہیں سمجھ سکے، اور انھوں نے ان کو بذات خود معبود سمجھ لیا۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مشرکین عرب اس کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح ان دونوں کے درمیان جو اجسام و اشیاء ہیں ان کی خلقت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں، نیز اہم امور کے سرانجام میں بھی کسی کی شرکت نہیں، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا، اور اس کے حکم قطعی کو کوئی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۱ ص ۵۹ باب التوحید۔

روکنے والا نہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ (لقمٰن۔ ۲۵)	اگر تم ان مشرکین سے پوچھو کہ آسمان وزمین کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔

قرآن خود شہادت دیتا ہے کہ یہ مشرکین خدا کو مانتے تھے، اور اس سے دعا بھی کرتے تھے۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ۔ (الانعام۔۴۱)	بلکہ اسی سے مانگتے ہو۔

نیز فرماتا ہے:۔

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ۔ (الاسراء۔ ٦٧)	اسی سے دعا کرنا کام بناتا ہے، دوسروں سے دعا بیکار جاتی ہے۔

حقیقت میں ان مشرکین کی گمراہی اور بے دینی یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ کچھ فرشتے اور ارواح ہیں جو (بڑے امور کو چھوڑ کر) اپنے پرستار کے ان جزئی وضمنی معاملات کو سنبھال لیتے ہیں، اور ان کا کام کر دیتے ہیں، جن کا تعلق اس کی ذات، اولاد، اموال واملاک سے ہے، ان کے نزدیک ان کا خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے کسی نازپروردہ غلام کا شہنشاہ سے، اور سفارشیوں اور مصاحبوں کا باجبروت بادشاہ سے ہوتا ہے، شرائع الٰہی میں جو کہیں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کام بعض فرشتوں کے سپرد کر دیئے ہیں، یا یہ کہ مقربین کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان جاہلوں نے اسی کو بنیاد بنا کر ان کو ایسا صاحب اختیار اور صاحب تصرف مان لیا، جیسے خود بادشاہ بنفس نفیس ہوتے ہیں، حالانکہ یہ قیاس الغائب علی الشاہد تھا، اور اسی سے ساری خرابی

پیدا ہوئی"۔[1]

اسی طرح شاہ صاحبؒ نے عوام اور خواص مشابہ بعوام کے بہت سے مشرکانہ عقائد واعمال کی جڑ پکڑ لی اور اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا، جس کی وجہ سے بہت سے جہلاء اور مدّعیان علم ان اعمال و رسوم، شعائر شرک، نذر و ذبح لغیر اللہ، بزرگوں کے نام پر روزے رکھنے، اولیاء و صالحین سے دعا و التجا، خوف و رجا، استمداد و استعانت، ان کے مقامات دفن، اور ان سے نسبت رکھنے والی چیزوں کی حرم شریف اور بیت اللہ کی طرح تعظیم کرنے اور ان کے لئے انھیں آداب کو مرعی رکھنے، ان کے جزئی تصرّف فی الکائنات، انسان کی شقاوت وسعادت، مرض وصحت، فراخی رزق و تنگی میں مؤثر ہونے کے عقیدۂ مشرکانہ میں گرفتار اور "فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ"[2] پر عمل کرنے، اور انابت واخبات، توکّل علی اللہ اور انقطاع الی اللہ کی جیسی بیش بہا دولت سے محروم تھے، اور جن کے بعض احوال سن کر اور اعمال دیکھ کر بے اختیار قرآن مجید کی آیت یاد آتی تھی:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ	اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر
إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ٥ (یوسف۔۱۰۶)	(اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ اور ان کے اخلاف کا اگر اس عقیدۂ توحید کی تجدید، اس کی تنقیح و توضیح اس کی اشاعت و ترویج اور اس کے سلسلہ کی غلط فہمیوں کے رفع کرنے کے سوا کوئی کارنامہ نہ ہوتا، تو تنہا یہی کارنامہ ان کو مجدّدین امت میں شمار کرنے کے لئے کافی تھا، چہ جائیکہ ان کے اور متعدد کارنامے ہیں، جن کی آئندہ صفحات میں وضاحت کی جائیگی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب ما کان علیہ حال أهل الجاهلية فاصلحہ اللہ ج ۱ ص ۱۲۵

[2] الزمر۔ ۲

عقائد کی تفہیم و تشریح کتاب و سنت کی روشنی میں اور صحابہؓ و سلف کے مسلک کے مطابق

شاہ صاحبؒ کے اس بنیادی تجدیدی کارنامہ کے ماسوا جس کا تعلق عامۃ المسلمین اور پورے مسلم معاشرہ سے تھا، اور جس کے بغیر ہدایت و نجات مشتبہ اور نصرت و تائید الٰہی محال تھی، ایک ضمنی، علمی و اصلاحی کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے عقائد کی تشریح و تفہیم کا کام کتاب و سنت کی روشنی میں انجام دیا اور اس بارے میں صحابہؓ اور سلف کے مسلک و ذوق کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دی، اور خود اس کا آغاز کر کے اس کا علمی نمونہ پیش کیا، عالم اسلام کے علمی حلقوں کو عرصہ سے ایسے نابغۂ روزگار مفکرین اور پابند نصوص مجتہدین کی ضرورت تھی، جو فلسفہ اور فلسفیوں کے آراء و نظریات سے (جن کا خود علم کلام پر پورا اثر پڑ چکا تھا) آنکھیں ملا کر بات کریں، قرآن پر اس طرح ان کا ایمان ہو، جس طرح وہ نازل ہوا خدا تعالےٰ کے صفات و افعال کو وہ بغیر کسی تحریف و تاویل کے ویسا ہی مانتے ہوں جیسا وہ خود ان کے بارے میں فرماتا ہے، اور ان حقائق کی ایسی تفسیر کرتے ہوں جن کا ایک طرف علم و دلائل شرعی مؤید ہوں، دوسری طرف عقل و منطق بھی ان کو تسلیم کرتے ہوں، یہ دانش کدۂ قرآنی، اور دبستان علوم نبویؐ سے فیض پانے والے علمائے حق ہی ہو سکتے تھے، جو علومِ حکمت اور متکلمانہ موشگافیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ عقائد میں کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ کے پابند تھے، اور خدا تعالےٰ پر انھیں صفات کے ساتھ ایمان و عقیدہ رکھتے تھے، جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں، ایک حدیث میں علمائے حق کی جو تعریف آئی ہے، وہ ان پر پورے طور پر صادق تھی۔

ینفون عن ھذا الدین تحریف   وہ غالی لوگوں کی تحریف، باطل پرستوں

الغالین، وانتحال المبطلین — کے غلط انتساب اور جاہلوں کی تاویلات

وتاویل الجاھلین[1] — سے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان علمائے اسلام سے کوئی دور خالی نہیں رہا، ان نمایاں شخصیتوں میں آٹھویں صدی ہجری کے عالم جلیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ حرّانی (م ۷۲۸ھ) ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید علامہ ابن قیم جوزیہ صاحبِ "زاد المعاد" (م ۷۹۱ھ) اور اس مسلک پر چلنے والے بعض دوسرے جلیل القدر علماء ہیں، جن کی فہرست زیادہ طویل نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کے بعد اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام پورے اعتماد کے ساتھ لیا جا سکتا ہے، اور اس کا کام اہل علم کے سامنے ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں، وہ عقائد کی تشریح وتفہیم اور اس کو سلف کے فہم ومسلک کے مطابق پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، اس لئے کہ انھوں نے ایک طرف یونانی فلسفہ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا، اور علم کلام کا پورا سرمایہ ان کی نظر کے سامنے بلکہ ان کی دسترس میں تھا، دوسری طرف وہ قرآن کے دقیق النظر مفسر، علم حدیث کے ماہر خصوصی اور اسرار ومقاصد شریعت کے رازداں تھے، اس لئے وہ "لفظیت" اور "تاویل" کے درمیان راہ اعتدال پر قائم ہیں، ان کی کتاب "العقیدۃ الحسنۃ"[2] مطالعہ کی گہرائی

---

[1] بروایت بیہقی، حدیث کے الفاظ یوں ہیں: "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین الخ"۔ [2] یہ کتاب "العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے فارسی میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاد تفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم نے اس کو اپنی شرح اور مفید حواشی کے ساتھ (جو خود شاہ صاحبؒ کی دوسری تصنیفات سے ماخوذ ہیں) اس کو "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے مرتب کیا، اور راقم سطور کے مقدمہ کے ساتھ مطبع دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی، مصنف کی کتاب "العقیدۃ والعبادۃ والسلوک" اور اس کے (باقی ص ۱۶۵ پر)

اور عبارت کی سلاست وروانی دونوں کی جامع ہے، یہ کتاب علم توحید (جس کو عام طور پر علم کلام سے موسوم کیا جاتا ہے) کا ایک ایسا متن ہے، جس میں اہل سنت کے عقائد کا وہ لُبّ لباب آگیا ہے، جس سے ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو واقف ہونا چاہیئے، جو اپنے تئیں اہل سنت میں شمار کرتا ہو، اور ان کے عقائد کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہو۔

شاہ صاحبؒ اپنے رسالہ "وصایا" میں (جو فارسی زبان میں ہے) لکھتے ہیں:۔

اول وصیت ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد وعمل، پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن...... و در عقائد مذہب قدماء اہل سنت اختیار کردن وآں را تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن وبہ تشکیکات خام معقولیان التفات نکردن۔[1]

اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں کتاب و سنت کو مضبوط ہاتھوں سے تھاما جائے اور ہمیشہ ان پر عمل کیا جائے، عقائد میں متقدمین اہل سنت کے مذہب کو اختیار کیا جائے اور (صفات و آیات متشابہات) کے سلسلہ میں سلف نے جہاں تفصیل و تفتیش سے کام نہیں لیا، ان سے اعراض کیا جائے، اور معقولیان خام

(باقی ص ۱۶۴ کا) ترجمہ "دستور حیات" میں اس کا خلاصہ آگیا ہے۔ "تفہیمات" میں "العقیدۃ الحسنۃ" کا مضمون پورا آگیا ہے، غالباً اسی سے لے کر اس کو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا (ملاحظہ ہو "التفہیمات الإلٰهیۃ" ج ا ص ۱۴۴-۱۴۸) [1] شاہ صاحب نے اس رسالہ کا نام جو فارسی میں ہے "المرآۃ الوضیئۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" رکھا تھا، یہ شاہ صاحب کے بعض دوسرے رسائل کے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔

کی تشکیکات کی طرف التفات
نہ کیا جائے۔

شاہ صاحب کے اسماء و صفات کے بارے میں ذوق و مسلک کا کسی قدر اندازہ اس اقتباس سے ہوگا جو یہاں پیش کیا جاتا ہے :-

"خدا اس سے بالا او برتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سے دریافت ہو سکے، یا اس میں صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جوہر میں ہو کر پائے جاتے ہیں، یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کر سکیں یا متعارف الفاظ ان کو ادا کر سکیں، با اینہمہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں، تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے ہو جائے، ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لئے جائیں مثلاً ہم خدا کے لئے "رحمت" ثابت کرتے ہیں، اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جس کو اصل میں رحمت کہتے ہیں) اسی طریقہ سے خدا کی وسعتِ قدرت کے اظہار کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قدرت و قوت کے لئے بولے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں، بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں...... تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طریقہ پر

بولے گئے ہیں، اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث و کاوش نہ کی جائے، اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کے خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے، (یعنی تبع تابعین کے عہد تک) اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوگئے، جنھوں نے بغیر کسی نصِّ قطعی اور دلیل مستحکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی۔[1]"

صدیوں سے عالم اسلام میں بالخصوص ان ملکوں میں جو علمی، عقلی اور درسی طور پر ایران کے زیرِ اثر تھے، جن متکلمانہ موشگافیوں، صفات کی دور از کار تاویلات جن سے نتیجۃً وہ معطّل اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہیں، اور فلسفۂ یونان سے ذہنی غلامی کی حد تک مرعوبیت کا دور دورہ تھا، اور سلف کے متعلق ان کا خیال استخفاف تک پہونچا ہوا تھا، جو بہت احتیاط و انصاف سے کام لیتے تھے وہ کہتے تھے "مذهب السلف أسلم ومذهب الخلف اعلم" (سلف کے مسلک میں احتیاط اور خلف کی تحقیقات میں علم کی شان ہے) اس پس منظر میں شاہ صاحبؒ کی یہ خدمت و جرأت ایک مجتہدانہ اور مجددانہ کارنامہ ہے۔ اسماء و صفات کے بارے میں سلف کے مسلک کی تائید، فلاسفہ متکلمین سے (جنھوں نے دور از کار تاویلات سے کام لیا اور ان کے اقوال صفات کے بارے میں وہ تعطیل و نفیِ صفات کے حدود کو چھوتے ہوئے بعض اوقات نظر آتے ہیں) عدم مناسبت اور حدیث و سنت کی محبت و تعظیم نے ان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی طرف سے دفاع اور ان کی جلالتِ شان کے اعتراف پر آمادہ کیا، جن کی ذات ان آخری صدیوں میں بڑی متنازع فیہ بلکہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد اول ص ۶۳ باب الایمان بصفات اللہ۔ ترجمہ منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۴۴-۴۵

مطاعن اور شبہات کا ہدف بن گئی تھی، شاہ صاحبؒ نے بڑے بلند الفاظ میں ان کی تعریف فرمائی، اور ان کی طرف سے دفاع کیا، وہ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں :۔

ولیس شئ منہا الا و معہ دلیلہ من الکتاب والسنۃ وآثار السلف فمثل ھذا الشیخ عزیز الوجود فی العالم، ومن یطیق أن یلحق شأوہ فی تحریرہ وتقریرہ والذین ضیقوا علیہ ما بلغوا معشار ما آتاہ اللہ تعالیٰ۔[1]	شیخ الاسلام کے اقوال میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے لئے ان کے پاس کتاب و سنت اور آثار سلف میں سے کوئی دلیل نہ ہو، ایسا عالم دنیا میں عزیز الوجود ہے، کون ایسا شخص ہے، جو تحریر و تقریر میں ان کے مرتبہ کو پہونچنے کی قابلیت رکھتا ہو، جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار کی ہے ان کو ان کے کمالات کا دسواں حصہ بھی نصیب نہیں۔

[1] جلاء العینین صہ ۴۶ بحوالہ تفہیمات الٰہیہ۔

باب ششم

حدیث وسنت کی اشاعت وترویج، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی دعوت وسعی

حدیث کی اہمیت اور ہر ملک اور ہر دور میں اس کی ضرورت

ہندوستان کے تحتی براعظم، بلکہ حقیقتاً دورِ اخیر میں (جو بارھویں صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر اس وقت تک قائم ہے) شاہ صاحبؒ نے حدیث کی ترویج واشاعت درس حدیث کے احیاء، فن حدیث کے ساتھ اعتناء، اور اس موضوع پر اپنی محققانہ ومبصرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا جو ان کے صحیفۂ تجدید اور کتاب زندگی کا ایک اہم اور روشن باب ہے، اور جو ان کے دوسرے علمی کمالات اور دینی خدمات پر ایسا غالب آیا کہ "محدّث دہلویؒ" ان کے نام کا جزء اور ان کے تعارف کا عنوان بن گیا، اور زبان وقلم پر "حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ" جاری اور ساری ہو گیا۔

لیکن اس کارنامہ کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس کارنامہ کی عظمت سمجھنے کے لئے، اس کی ضرورت ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ حدیث، دین شریعت کے نظام، اسلام کو اپنی صحیح شکل میں باقی رکھنے کی کوششوں، اور اسلامی مزاج وماحول کی

تشکیل وحفاظت میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کی اشاعت وحفاظت ہر دور اور ہر ملک میں (جہاں مسلمان آباد ہوں) کیوں ضروری ہے، اور اس سے تغافل، جہل یا انکار کن خطرات کا حامل اور کیسے عظیم نقصانات کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے، اس علم کا کسی عہد یا ملک سے ختم یا فراموش ہو جانا کون سا خلاء پیدا کرتا ہے، جو کسی اور چیز سے پُر نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت کے لئے مصنف اپنے ہی ایک رسالہ کا ایک اقتباس پیش کرے گا، جس میں اس حقیقت کو پورے طور پر واضح اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[1]

حدیث امت کے لئے صحیح میزان ومعیار

"حدیث نبویؐ ایک ایسی صحیح میزان ہے، جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس امت کے اعمال وعقائد، رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں، اور امت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں، اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے، اگر

---

[1] یہ رسالہ جس کا نام عربی میں "دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی وصیانته" ہے، اور اردو میں اس کا ترجمہ "اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" کے نام سے شائع ہوا ہے، حقیقتاً وہ مضمون ہے جس سے مصنف نے ۱۴۰۱ھ کے رابطہ عالم اسلامی کے دورِ محاضرات کا مکہ معظمہ میں افتتاح کیا، اور وہ مضمون ۱۶ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ (۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء) کو مکہ معظمہ میں اہل علم کے ایک مجمع کے سامنے پڑھا گیا انگریزی میں بھی یہ رسالہ ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC — CLIMATE & ATTITUDES — کے نام سے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

حدیث نبویؐ کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل و متوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے، اور وہ حکیمانہ نبویؐ تعلیمات نہ ہوتیں، اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ امت افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی، اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا، اور وہ عملی مثال نہ موجود رہتی جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالےٰ نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۲۱)	یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ ہے۔

اور یہ فرما کر آپ کے اتباع کی دعوت دی ہے:۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۝ (آل عمران۔۳۱)	آپ کہدیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسانوں کو ضرورت ہے، اور جس سے وہ زندگی اور قوت واعتماد حاصل کرسکتا ہے، اور یہ اطمینان کرسکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان، بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیث نبویؐ زندگی، قوت، اور اثر انگیزی سے بھر پور ہے، اور ہمیشہ اصلاح و تجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آرا، اور برسر جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں

ایسے افراد پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اصلاح و تجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے، اور بدعتوں و خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی، اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لئے حدیث نبوی امت اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے، اس کی حفاظت، ترتیب و تدوین، حفظ اور نشر و اشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی و ذہنی، عملی و اخلاقی دوام و تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں

سنت نبوی اور حدیث نبوی کے مجموعے ہمیشہ اصلاح و تجدید، اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں، انھیں سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا، انھیں احادیث سے انھوں نے استدلال کیا اور دین و اصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی، بدعتوں، فتنوں اور شر و فساد سے جنگ و مقابلہ کے معاملہ میں وہی قوت محرکہ و دافعہ تھی، آج جو بھی مسلمانوں کو دین خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے، اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت پر اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی حدیث و سنت کی

کتابوں سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں کمی آئی، اور طویل مدت تک یہ کمی باقی رہی تو داعیوں اور اخلاق کی تربیت، نفوس کا تزکیہ کرنے والے روحانی مربیوں کی کثرت، دنیا میں زہد اختیار کرنے اور کسی حد تک سنت پر عمل کرنے کے باوجود۔ اس مسلم معاشرہ میں جو علوم اسلامیہ کے ماہرین، اور فلسفہ و حکمت کے اساتذۂ فن اور ادباء و شعراء سے مالامال تھا، اور اسلام کے قوت و غلبہ اور مسلمانوں کی حکمرانی میں زندگی گذار رہا تھا، نت نئی بدعتوں، عجمی رسم و رواج، اور اجنبی ماحول کے اثرات نے اپنا تسلّط قائم کرلیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس بن جائیگا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیشین گوئی اور حدیث حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

لتتبعُنَّ سنن من کان قبلکم شبراً بشبرٍ وذراعًا بذراعٍ۔ (مستدرک حاکم) — تم پچھلی امتوں کے راستوں پر قدم بقدم چلوگے۔

اس وقت اصلاح کی آواز خاموش، اور علم کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے دینی حالات، اور مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیجئے جبکہ برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں کا حدیث شریف اور سنت کے صحیح مآخذ و مراجع سے تعلق تقریبًا منقطع ہوگیا تھا، علم دین کے مراکز، اور حجاز و یمن، مصر و شام کے ان مدارس سے جہاں حدیث شریف کا درس ہوتا تھا، کوئی رابطہ نہ تھا، اور کتب فقہ، اصول اور ان کی شروح اور فقہی باریکیوں اور موشگافیوں، اور حکمت و فلسفہ کی کتابوں کا عام چلن تھا، بآسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح بدعتوں کا دور دورہ تھا، منکرات عام ہوگئے تھے، اور عبادتوں اور تقرب الی اللہ

کی کتنی نئی شکلیں اور نئے طریقے ایجاد کر لئے گئے تھے۔

راقم الحروف نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے حصہ چہارم میں دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور و مقبول شیخ طریقت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی کتاب "جواہر خمسہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"گجرات کو مستثنیٰ کر کے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری، اور حرمین شریفین کی آمد و رفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی، اور علامہ علی متقی برہان پوری اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے (دسویں صدی ہجری میں ہندوستان صحاح ستہ، اور ان مصنفین کی کتابوں سے ناآشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور ردّ بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں و تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث کے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل وسیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث وسنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے"۔[1]

یہ صرف "جواہر خمسہ" کی خصوصیت نہیں، بزرگوں کے ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی کا

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص ۲۴۴

عام رواج تھا، قبروں کو کھلے طریقہ پر سجدہ گاہ بنا لیا گیا تھا، ان پر چراغ جلائے جاتے تھے، چادریں چڑھائی جاتی تھیں، ان کے گرد و پیش کا ادب حرمِ مکی کی طرح کیا جاتا تھا، عرس و فاتحہ کے نام سے طرح طرح کے جشن منائے جاتے تھے، جن میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی تھی، صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ معکوس، نذر لغیر اللہ، اولیاء و صلحاء کے نام پر، اور ان کی رضامندی کی نیت سے ذبح و قربانی، غیر اللہ کے نام پر روزہ، اور ایسی کتنی بدعات (جن کے حدود شرک سے مل جاتے تھے) مقبول عام و خاص تھیں، اولیاء و صالحین کے ایام پیدائش و وفات پر جلسے کئے جاتے تھے، اور میلے لگتے تھے۔

اگر علمائے اسلام کی دسترس میں کتب حدیث نہ ہوتیں، اور سنتوں و بدعتوں میں تفریق و امتیاز کا یہ معتبر و سہل ذریعہ نہ ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے عہد سے حکیم الاسلام شاہ ولی صاحب (م ۱۱۷۶ھ) کے عہد تک مصلحینِ امت اور دین خالص کے مبلّغین کا یہ سلسلہ وجود میں نہ آتا، اور مصلحین روزگار اور تصحیح عقائد و اصلاح رسوم کے علمبردار نظر نہ آتے۔

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں افغانستان (کابل و ہرات و غزنی) کے علماء کے حالات پڑھیے، اور ان کی تصنیفات دیکھیے، حمایت سنت، اور ردّ بدعت، علمی تحقیق اور مسائل کی تنقیح کا رنگ بہت کم نظر آئیگا، دفعۃً علامہ ملّا علی قاری (علی بن سلطان محمد ہروی م ۱۰۱۴ھ) کی شخصیت سامنے آتی ہے، جنھوں نے حجاز جا کر وہاں کے محدّثین عظام اور اساتذہ کبار سے کتب حدیث کا درس لیا، اور اس میں کمال پیدا کیا، کتب حدیث و فقہ کی شرح، مسائل کی

ترجیح، اور اپنے زمانہ کی بعض بدعات کی بلا رُو رعایت تردید میں ان کا یہ مصلحانہ و محققانہ رنگ صاف جھلکتا ہے، ان کو ان کے مطالعہ و تحقیق، اور حق گوئی اور انصاف پسندی نے اس مقام تک پہونچادیا کہ انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حمایت کی، اور اس کی شہادت دی کہ وہ اکابر اہل سنت وجماعت اور اولیائے امت میں سے تھے[1]، یہی حال متعدد عرب ممالک عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش وغیرہ کا ہے[2]۔"

علم حدیث اور عرب

فلسفۂ تاریخ اسلام کا یہ نکتہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلام عربوں کے ذریعہ سے پہونچا، وہاں حدیث کا علم بھی اسلام کے ساتھ پھیلا اور پھلا پھولا کہ اس کو عربوں کے مزاج، ان کی قوت حفظ، ان کی عملیت، حقیقت پسندی، اور ذات نبویؐ سے گہری وابستگی سے خاص مناسبت تھی، وہ جہاں گئے اپنے ساتھ علم حدیث بھی لیتے گئے، اور ان کی قیادت کے دور، اور اثر و نفوذ کے حلقہ میں اس کے ساتھ پورا اعتنا کیا گیا، اور اس کے درس اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ پوری سرگرمی سے جاری رہا، یمن، حضر موت، مصر و شام، عراق، شمالی افریقہ اور اندلس (اسپین) جیسے ملکوں کا یہی حال ہے، خود ہندوستان میں صوبۂ گجرات اس کی ایک مثال ہے، جس نے شیخ علی متقی برہان پوری (صاحب کنز العمال) (م ۹۷۵ھ) اور شیخ محمد طاہر پٹنی (صاحب مجمع بحار الانوار) (م ۹۸۶ھ) جیسے بلند پایہ محدث پیدا کئے، اس کی وجہ وہی ہے، جو ہم نے اوپر بیان کی کہ گجرات کا تعلق حجاز مقدس سے دوسرے صوبوں کے

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۲۷ [2] رسالہ حدیث کا بنیادی کردار ص ۳۴-۳۵

مقابلہ میں زیادہ رہا، اور وہاں علمائے عرب کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

لیکن جن ملکوں میں اہل عجم کے ذریعہ اسلام پہونچا وہاں کا یہ حال نہیں، ہندوستان میں ترکی النسل یا افغانی النسل خاندانوں نے حکومتیں قائم کیں، اور ان مشائخ اور داعیانِ اسلام کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت ہوئی جن میں بیشتر عجمی نژاد اور ایران و ترکستان کے باشندے تھے، پھر جب ہندوستان میں درس و تدریس، مدارس کے قیام اور نصاب کی ترتیب کا زمانہ آیا، تو اس پر عجمی فضلاء اور "دانشمندان ایران" کا پورا اثر پڑ چکا تھا، باب اول میں بتایا جا چکا ہے کہ ایران میں صفوی حکومت کے قیام اور شیعیت کے سرکاری مذہب ہو جانے کے بعد سے (جو دسویں صدی ہجری کے ابتدا ہی کا واقعہ ہے) ایران کا (جس نے ایوان حدیث کے اہم ستون پیدا کئے تھے) حدیث سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ سے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت اور اس کی اہمیت و عظمت قائم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا، اس کے برعکس جس قدر اس کا اثر ہندوستان کے علمی حلقوں پر گہرا ہوتا جاتا تھا، حدیث سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی، بارہویں صدی ہجری جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ظہور ہوا، اس کا نقطۂ ارتقا تھا۔

ہندوستان میں علم حدیث کا عروج و زوال

ہندوستان میں علم حدیث کے عروج و زوال کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہاں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس میں سیکڑوں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ آگیا ہے:۔

"جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کے بجائے غزنوی اور

غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے اور خراسان اور ماوراء النہر سے سندھ میں علماء آئے، تب علم حدیث اس علاقہ میں کم ہوتا گیا یہاں تک کہ معدوم ہوگیا، اور لوگوں میں شعر و شاعری، فن نجوم، فن ریاضی اور علوم دینیہ میں فقہ و اصول فقہ کا رواج زیادہ ہوگیا، یہ صورت حال عرصہ تک قائم رہی یہاں تک کہ علمائے ہند کا خاص شغلہ یونانی فلسفہ رہ گیا اور علم تفسیر و حدیث سے غفلت بڑھ گئی، مسائل فقہیہ کے سلسلہ سے جو تھوڑا سا تذکرہ کتاب و سنت میں آجاتا تھا بس اسی مقدار پر قانع تھے، فن حدیث میں امام صغانی کی "مشارق الانوار" کا رواج تھا، اگر کوئی شخص اس فن میں زیادہ ترقی کرتا تھا تو امام بغوی کی مصابیح السنۃ یا مشکوٰۃ پڑھ لیتا تھا، اور ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ محدث ہوگیا، اور یہ سب محض اس لئے تھا کہ لوگ عام طور پر ہندوستان میں اس فن کی اہمیت و مرتبت سے ناواقف تھے، وہ لوگ اس علم کی طرف سے بالکل غافل تھے، نہ اس علم کے ائمہ کے حال سے واقف تھے، اور نہ اس علم کا ان کے درمیان کوئی چرچا تھا، محض تبرکاً مشکوٰۃ شریف پڑھا کرتے تھے، ان کے لئے سب سے زیادہ سرمایہ علم فقہ کی تحصیل تھا، اور وہ بھی تقلید کے طور پر تحقیق کے طور پر نہیں، اسی وجہ سے اس زمانہ میں فتاوے اور روایات فقہیہ کا رواج بڑھ گیا تھا، نصوص و محکمات متروک ہوگئی تھیں، مسائل فقہیہ کی صحت کو کتاب و سنت سے جانچنا اور فقہی اجتہادات کو احادیث نبویہ سے تطبیق دینے کا طریقہ متروک ہوگیا تھا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ اللہ تعالےٰ نے ہندوستان میں اس علم کی اشاعت کا

انتظام فرمایا، دسویں صدی ہجری میں بعض علماء ہندوستان آئے، اور ان کے ذریعہ یہ علم ہندوستان میں رواج پذیر ہوا، مثلاً

شیخ عبد المعطی مکی بن حسن بن عبد اللہ باکثیر متوفی باحمد آباد ۹۸۹ھ۔

شہاب احمد مصری بن بدر الدین، متوفی باحمد آباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد فاکہی حنبلی بن احمد بن علی متوفی باحمد آباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد مالکی مصری بن محمد عبد الرحمن متوفی باحمد آباد ۹۱۹ھ۔

شیخ رفیع الدین چشتی شیرازی متوفی باکبر آباد ۹۵۴ھ۔

شیخ ابراہیم بغدادی بن احمد بن حسن۔

شیخ ضیاء الدین مدنی مدفون کاکوری ضلع لکھنؤ۔

شیخ بہلول بدخشی، خواجہ میر کلاں ہروی متوفی باکبر آباد ۹۸۱ھ۔

اور بہت سے علمائے کرام۔

ہندوستان کے کچھ علمائے کرام نے حرمین شریفین کا سفر اختیار فرمایا، اور وہاں انھوں نے فن حدیث شریف حاصل کیا، اور اس فن کو لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے، اور عرصہ دراز تک گجرات میں درس حدیث دیتے رہے، پھر دوبارہ حجاز ہجرت کر گئے، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ، شیخ جوہر کشمیری متوفی ۱۰۲۶ھ، شیخ عبد النبی گنگوہی بن احمد، شیخ عبد اللہ سلطان پوری بن شمس الدین، شیخ قطب الدین عباسی گجراتی، شیخ احمد بن اسماعیل مانڈوی، شیخ راجح بن داؤد گجراتی، شیخ علیم الدین مانڈوی، شیخ معمر ابراہیم بن داؤد مانیپوری مدفون باکبر آباد، شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی مصنف "مجمع بحار الانوار"

سید عبدالاول حسینی بن علی بن العلاء الحسینی اور دوسرے علماے کرام[۱]"

مصنف "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" آگے چل کر لکھتے ہیں :-

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا کارنامہ

"اس کے بعد فن حدیث کی نشر واشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بن سیف الدین بخاری متوفی ۱۰۵۲ھ کو منتخب فرمایا، ان کے ذریعہ علم حدیث کی اشاعت بہت عام ہوئی، انھوں نے دارالسلطنت دہلی میں مسند درس آراستہ فرمائی، اور اپنی ساری کوشش وصلاحیت اس علم کی نشر واشاعت پر صرف فرمائی، ان کی مجلس درس سے بہت سے علماء نے فن حدیث کی تکمیل کی، اور بہت سی کتابیں بھی فن حدیث میں تصنیف فرمائیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس علم کی نشر واشاعت میں بڑی جد وجہد کی، ان کی ذات اور ان کے علم سے اللہ کے بندوں کو بہت نفع پہونچا، فن حدیث کی نشر واشاعت میں ان کی جد وجہد اور کوششیں اپنے پیشرووں سے اس قدر نمایاں وممتاز رہیں کہ لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ فن حدیث کو ہندوستان میں سب سے پہلے لانے والے یہی شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں، حالانکہ جیسا میں نے اوپر بتلایا تاریخی حیثیت سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ نورالحق متوفی ۱۰۷۳ھ نے اس علم کی خدمت اور نشر واشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور ان کے بعض تلامذہ

---

[۱] "اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں" ص ۱۹۵-۱۹۶

اور اولاد نے بھی اس فن کی خدمت کی ہے، مثلاً شیخ الاسلام شارح بخاری اور شیخ نور الحق کے صاحبزادہ مولانا سلام اللہ مصنف "محلّٰی" و "کمالین"[1]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"بہر حال حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی، اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انھوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہو گیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز نقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا"[2]

ایک مُجدّد کی ضرورت

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے صدق و اخلاص اور برکت انفاس سے حدیث کی طرف توجہ شروع ہوئی اور انھوں نے اس کے درس و مطالعہ تدریس اور شرح و تحشیہ کا ایک نیا ذوق اور ایک نئی تحریک پیدا کر دی، امید تھی کہ ان کے جانشین و افرادِ خاندان جو اپنی اپنی جگہ پر محدث، مدرس اور صاحبِ تصنیف تھے، اس سلسلہ کو اس طرح جاری رکھیں گے کہ اس فن شریف کو ہندوستان کے نظامِ تعلیم، نصابِ درس اور علمی و تصنیفی سرگرمیوں میں شایان شان مقام حاصل ہوگا، خود ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر علامہ مفتی نور الحق دہلوی (م ۱۰۷۳ھ) جنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں چھ جلدوں میں شرح لکھی اور شمائل ترمذی

---

[1] "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" صفحہ ۱۹۷-۱۹۸ [2] حیات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ص ۴۳

پر بھی ان کی شرح ہے، اس سلسلہ میں ان کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل فرما سکتے تھے، لیکن غالباً عہدۂ قضا کی وجہ سے جس پر وہ اکبر آباد (آگرہ) جیسے مرکزی شہر میں فائز تھے، ان کو زیادہ درس و تدریس و اشاعت علم حدیث کا موقع نہیں مل سکا، ان کے نبیرہ مولانا شیخ الاسلام دہلویؒ بھی بڑے محدث تھے، جن کی صحیح بخاری پر فارسی میں مبسوط شرح ہے۔

لیکن بعض معلوم اور بعض نامعلوم اسباب کی بناء پر ان حضرات کی انفرادی مساعی سے ہندوستان میں حدیث کی طرف وہ رجوع عام اور اس کی اشاعت و درس و تدریس میں وہ جوش و سرگرمی نہیں پیدا ہوئی جس کی توقع تھی، شاید اس وجہ سے بھی کہ ان حضرات پر حدیث کے ذریعہ مذہب حنفی کی تائید کا جذبہ و رجحان غالب تھا، دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ بارہویں صدی کے وسط ہی میں تعلیم و تعلّم کا مرکزِ ثقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو رہا تھا، اور وہاں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱ھ) کے بابرکت اور طاقتور ہاتھوں سے نئے نصاب کی تشکیل ہو رہی تھی، اس نصاب کے واضعین و مصنفین کا علمی رابطہ حرمین شریفین اور ان مقامات سے قائم نہیں ہو سکا تھا، جو حدیث کے درس و تدریس و خدمت و اشاعت کے مرکز تھے، اور ان پر (جیسا کہ درس نظامی کی تاریخ اور کتب سوانح و تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے) علوم حکمت اور علوم دینیہ میں سے اصول فقہ کا غلبہ تھا۔

بہر حال ہندوستان کا علمی و دینی حلقہ ایک ایسی شخصیت کا منتظر اور محتاج تھا، جو حدیث سے عشق و فریفتگی کا تعلق رکھتی ہو اور اس کے نشر و اشاعت کو اس نے اپنی زندگی کا مقصدِ اوّلیں قرار دیا ہو ہندوستان کو یہ شخصیت بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات میں حاصل ہوئی جنھوں نے صحیح معنی میں اس شعر پر عمل کیا۔ ع

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الّا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

مصنف "الثقافة الاسلامية فی الھند" نے ان حضرات کا تذکرہ کرنے کے بعد جنھوں نے گیارہویں اور بارہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں علم حدیث کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا، اور اپنے درس و تصنیف سے بڑے حلقہ کو فیض پہونچایا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت حدیث کا ذکر کیا ہے، جو اس ملک ہی میں نہیں اس دور آخر میں تجدیدی و اجتہادی شان اور احیاء کا رنگ رکھتی ہے، اور جس سے اس ملک میں حدیث کا سکہ رائج الوقت کی طرح چلن ہوگیا، وہ نصاب درس کا ضروری جزء اور معیار فضیلت قرار پائی، درس حدیث کے مستقل حلقے قائم ہوئے، مدارس میں صحاح ستہ کے درس بالخصوص کتب اربعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی کو تحقیق کے ساتھ پڑھنے کا رواج ہوا، (جو اب عرب ممالک میں بھی مفقود ہے) شروح حدیث کا دور شروع ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر ایک وسیع و عظیم کتب خانہ تیار ہوگیا، جس کی مثال ممالک عربیہ میں بھی نظر نہیں آتی،[1] کتب حدیث کے تراجم ہوئے، جن سے عامۃ المسلمین اور غیر عربی دانوں کو نیز مسلمان خواتین کو بیش بہا فائدہ پہونچا، اور عمل کی تحریک اور اتباع سنت کا شوق ہوا، اجازت حدیث اور سند کا شوق ہوا، اور ہندوستان اس فن شریف کا ایسا مرکز بن گیا کہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ سید رشید رضا مدیر "المنار" کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے:۔

ولولا عناية إخواننا علماء الهند　　　اگر ہمارے بھائیوں علمائے ہندوستان نے

---

[1] شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور دعوت و تحریک کے اثر سے ہندوستان میں حدیث کے اساتذہ، شارحین و مصنفین کی جو جماعت کثیر پیدا ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں حدیث اور علوم حدیث پر جو عظیم کتب خانہ وجود میں آیا، اس کی وسعت اور تنوع کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافة الاسلامية فی الھند" باب ثانی کی فصل رابع "مصنفات أهل الهند فی الحديث" صفحہ ۱۴۳-۱۶۰، یا اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" از مولانا ابوالعرفان ندوی شائع کردہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔

بعلوم الحديث فى هذا العصر	اس زمانہ میں علوم حدیث کے ساتھ
لقضى عليها بالزوال من امصار	اعتناء نہ کیا ہوتا تو مشرقی ممالک میں
الشرق، فقد ضعفت فى مصر	مکمل طور پر ان کا زوال ہو چکا ہوتا،
والشام والعراق والحجاز منذ القرن	اس لئے کہ مصر، شام، عراق و حجاز
العاشر للهجرة، حتى بلغت	میں دسویں صدی ہجری ہی سے ان میں
منتهى الضعف فى أوائل هذا	ضعف پیدا ہو گیا تھا، جو اس چودھویں
القرن الرابع عشر[1]	صدی ہجری کے اوائل میں اپنی انتہا کو
	پہونچ گیا۔

حدیث کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے خیالات و جذبات

شاہ صاحبؒ کے لئے کون سا جذبہ اس علم کے ساتھ اشتغال، پھر اس کی نشر و اشاعت کی سرگرمی، اور اس کے لئے اپنی زندگی اور صلاحیتیں وقف کر دینے کا محرک ہوا، اس کو معلوم کرنے کے لئے خود شاہ صاحبؒ ہی کی تحریرات کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ یہ ان کے خیالات کا صحیح آئینہ ہے "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقدمہ کے پہلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں:۔

إن عمدة العلوم اليقينية	علوم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ و سرتاج
ورأسها، ومبنى الفنون الدينية	اور فنونِ دینیہ کی اصل و اساس
وأساسها، هو علم الحديث	علمِ حدیث ہے جس میں افضل المرسلین
الذى يذكر فيه ما صدر من	صلے اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل

---

[1] مقدمہ "مفتاح کنوز السنۃ"

أفضل المرسلين صلى الله عليه
وآله وسلم وأصحابه أجمعين
من قول أو فعل أو تقرير، فهي
مصابيح الدجى ومعالم الهدى
وبمنزلة البدر المنير، من
انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى
وأوتي الخير الكثير، ومن أعرض
وتولّى فقد غوى وهوى،
وما زاد نفسه إلا التخسير، فإنه
صلى الله عليه وآله وسلم نهى
وأمر، وأنذر وبشّر، وضرب
الأمثال وذكّر، وإنها لمثل
القرآن أو أكثر[1]

یا کسی بات پر آپ کے سکوت و رضامندی
کا ذکر خیر ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیثیں
تاریکی میں روشن چراغ، رشد وہدایت
کا سنگِ میل، اور بدر کامل کا حکم رکھتی
ہیں، جو شخص ان پر عمل پیرا ہوتا اور
ان کی نگہداشت کرتا ہے تو وہ
ہدایت یاب اور خیر کثیر سے فیض یاب
ہوتا ہے اور جو بدبخت اس سے
اعراض و روگردانی کرتا ہے، وہ گمراہ
اور ہلاک ہوتا ہے، اور اپنا ہی نقصان
کرتا ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم کی زندگی امر و نہی، انذار و تبشیر
اور نصیحت و تذکیر سے معمور ہے، اور
آپ کی حدیثوں میں یہ چیزیں قرآن ہی
کی طرح یا اس سے (مقدار میں) کچھ
زیادہ ہی ہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

اول چیزے کہ عقل آنرا بر خودش

پہلی چیز جس کو عقل اپنے اوپر

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغۃ صـ۲

واجب میگردد آنست کہ تتبع اخبار
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم در بیان
احکام الٰہی و پیروی آن اخبار
بدل و جوارح باید نمود، زیرا کہ کلام
در شخصے است کہ تصدیق کردہ
است بتکلیف اللہ تعالےٰ عباد خود
را باحکام، و قصد خروج از عہدۂ تکلیف
مصمم ساختہ۔[1]

واجب قرار دیتی ہے یہ ہے کہ
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے
حالات و ارشادات کا تتبع کیا
جائے کہ آپؐ نے احکام الٰہی کے
بارے میں کیا ارشاد فرمایا اور کس طرح
ان پر عمل کیا، پھر قلب و جوارح سے
ان اقوال و احوال کی پیروی کی جائے
اس لئے کہ ہماری گفتگو اس شخص کے
بارے میں ہے جس نے یہ حقیقت تسلیم
کر لی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں
کو اپنے احکام کا مکلّف بنایا ہے
اور اس شخص نے تکلیف شرعی کی
اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا
عزم مصمم کر لیا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ

شاہ صاحبؒ کے لئے ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء اور اشاعت و ترویج کا دوسرا محرک ہندوستان کی وہ صورت حال تھی جس کا ذکر کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے

۱؎ کلمات طیبات ص ۱۷۲

گزرچکا ہے، دینی حلقوں پر بدعات، رسوم جاہلیت، غیر مسلموں کی تقلید اور غیر اسلامی شعائر اختیار کرنے کا دھواں چھایا ہوا تھا جس کے اندر سے اصل اسلام کی صورتِ زیبا دیکھنی مشکل تھی، علمی و درسی حلقوں پر یونان سے آئے ہوئے یونانی علوم جن کو وہ "فنون دانشمندی" کہتے تھے، اور علوم آلیہ اور فنون بلاغت اور علم کلام کا غلبہ تھا، اور دونوں حلقوں میں علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث بار نہیں پانے پاتا تھا، اگر علوم دینیہ کی طرف توجہ بھی ہوتی تھی تو معاملہ فقہ اور اصول فقہ اور اس کی موشگافیوں سے آگے نہیں بڑھنے پاتا تھا، اس صورت حال کو دیکھ کر شاہ صاحب فرط تاثر اور شدت تأسف میں لکھتے ہیں:۔

"میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کے علوم کے طلسم اور صرف و نحو و معانی کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے، تم نے سمجھ لیا کہ علم اسی کا نام ہے، حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ثابتہ، تمہیں چاہیئے تھا کہ تمہیں یہ یاد رہتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے نماز پڑھی، آپ کیسے وضو فرماتے تھے، قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے، کیسے روزہ رکھتے تھے، کیسے حج کرتے تھے، کیسے جہاد کرتے تھے، آپ کا انداز گفتگو کیا تھا، حفظِ لسان کا طریقہ کیا تھا، آپ کے اخلاق عالیہ کیا تھے؟ تم آپ کے اسوہ پر چلو اور آپ کی سنت پر عمل کرو، اس بناء پر کہ وہ آپ کا طریق زندگی اور سنت نبوی ہے، اس بناء پر نہیں کہ وہ فرض و واجب ہے، تمہیں چاہیئے تھا کہ تم دین کے احکام و مسائل سیکھو، باقی سیر و سوانح اور صحابہؓ اور تابعین کی وہ حکایات جو آخرت کا شوق پیدا کریں تو وہ ایک تکمیلی چیز اور امر زائد ہے، اس کے مقابلہ میں

تمہارے مشاغل اور جن باتوں پر تم پوری توجہ صرف کرتے ہو، وہ آخرت کے علوم نہیں ہیں، دنیاوی علوم ہیں۔

تم اپنے سے پہلے کے فقہاء کے استحسانات اور ان کی تفریعات میں غوطہ لگاتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ حکم وہ ہے جو اللہ اور اس کا رسولؐ دے، تم میں کتنے آدمی ہیں، جب ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث پہونچتی ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے حدیث پر نہیں ہے، پھر تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ کاملین اور ماہرین کا کام ہے، حضرات ائمہ سے یہ حدیث مخفی نہیں ہوسکتی، پھر انھوں نے جو اس کو چھوڑا تو کسی وجہ سے جو ان پر منکشف ہوئی، مثلاً نسخ یا مرجوحیت۔

یاد رکھو کہ اس کا دین سے کچھ تعلق نہیں، اگر تمہارا اپنے نبیؐ پر ایمان ہے تو اس کی پیروی کرو، وہ تمہارے مذہب کے موافق ہو یا مخالف، خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے ساتھ شروع سے اشتغال کرتے، اگر ان دونوں پر عمل کرنا تمہارے لئے آسان ہو تو کیا کہنا، اور اگر تمہارے فہم اس سے قاصر ہوں تو پھر کسی سابق عالم کے اجتہاد سے مدد لو، اور جس کو زیادہ صحیح، صریح اور سنت کے موافق پاؤ اس کو اختیار کرو، علوم آلیہ سے س ذہن کے ساتھ اشتغال کرو کہ وہ آلات و وسائل ہیں، ان کی مستقل حیثیت اور مقصود کا درجہ نہیں کیا خدا نے تمہارے اوپر یہ واجب نہیں کیا کہ تم علم کی اشاعت کرو، یہاں تک کہ مسلمانوں کے ملک میں شعائر اسلام

ظاہر وغالب ہوں، تم نے شعائر کا تو اظہار نہیں کیا، اور لوگوں کو زوائد میں مشغول کر دیا۔[1]

شاہ صاحبؒ کو حدیث کے ذکر میں جو سرشاری کی کیفیت اور ائمہ حدیث کی ذات کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی اس کا کچھ نمونہ اس مکتوب میں دیکھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے امام بخاریؒ کے مناقب میں اپنے ایک مسترشد کو لکھا ہے۔[2]

خدمت واشاعتِ حدیث کی سرگرمی

اوپر گزر چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب اپنے استاد و شیخ ابوطاہر مدنی سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کل طریق کنت أعرفہ   إلا طریقاً یؤدینی لربعکم

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

شاہ صاحب نے بھی چلتے وقت فرمایا کہ "میں نے جو کچھ پڑھا تھا، سب بھلا دیا سوائے علم دین حدیث کے"۔

شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ حدیث شریف ہی کی تشریح وتفہیم، تدریس وتعلیم اور اشاعت وتعمیم میں مصروف رہے، بقول شاعر ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل ۱۹۳۶ء حصہ اول ص ۲۱۴-۲۱۵

[2] ملاحظہ ہو "کلمات طیبات" ص ۱۶۸-۱۷۱

ہندوستان واپس آتے ہی انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت کے لئے گویا کمر کس لی؛ بہت جلد ان کا مدرسہ رحیمیہ ہندوستان کے طول و عرض میں حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی، جہاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم حدیث نے پروانہ وار ہجوم کیا، ان مقامات میں سندھ[۱] اور کشمیر[۲] جیسے دور دراز مقامات بھی تھے، دہلی اور اس کے اطراف اور شمالی ہند کا تو کچھ کہنا نہیں، مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ماسوا کہ وہ فرزند ارجمند اور شاہ صاحبؒ کے کاموں کی توسیع و تکمیل کرنے والے تھے، اسی درسِ حدیث سے فائدہ اٹھانے والے فخرِ ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی مشہور بہ زبیدی (۱۱۴۵ھ - ۱۲۰۵ھ) صاحب "تاج العروس شرح قاموس" اور "اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین" تھے، جن کے تبحر و تحدیث کی عالم عربی میں دھوم مچ گئی، اور جن کی مجلس قاہرہ میں سلاطین کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، انھیں تلامذہ میں بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) خلیفۂ ارشد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ، و مصنف تفسیر مظہری و مالا بدّ منہ بھی تھے[۳]۔

---

[۱] سندھ کے مولانا محمد معین دہلی آئے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حدیث کا درس لیا اور استفادہ کیا، ان کی مشہور تصنیف "دراسات اللبیب فی الأسوۃ الحسنۃ بالحبیب" ہے، جس میں شاہ صاحب کی تحقیقات اور ذوق کا عکس صاف نظر آتا ہے، ۱۱۶۱ھ میں وفات ہوئی (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶)

[۲] شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاص تلامذہ اور ان کی تحقیقات و اذواق کے حامل و مبلغ خواجہ محمد امین کشمیری (م ۱۱۸۷ھ) تھے، جو محمد امین الولی اللّٰہی کے نام سے مشہور ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان کے شاگرد تھے، شاہ صاحب نے ان کے لئے اپنے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے (ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶)

[۳] ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷ -

اس طرح ہندوستان میں صدیوں کے بعد (غالباً پہلی مرتبہ) علم حدیث کا ایسا چرچا اور اس کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ ہندوستان، یمن کا ہمسر بن گیا، اور اس کے جانفزا جھونکے خود سرزمین حجاز تک پہونچنے لگے[1]، نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم نے شاہ صاحبؒ کی خدمت واشاعت حدیث کی سرگرمیوں کو ذکر کرتے ہوئے، عربی کے دو بلیغ شعر لکھے ہیں، جو حقیقت حال کی صحیح تصویر ہیں ؎

من زار بابك لم تبرح جوارحه ، تروی أحاديث ما أوليت من منن

فالعين عن قرة ، والكف عن صلة ، والقلب عن جابر ، والسمع عن حسن

(جو تمہارے دروازہ پر آیا اس کے اعضاء وجوارح تمہارے احسانات کی روایتِ حدیث میں مشغول ہو گئے)

(آنکھ کہتی ہے کہ (قرۃ) سے مجھے ٹھنڈک ملی، ہاتھ کہتے ہیں کہ ہم (صلہ) سے مالا مال ہوئے، دل راوی ہے کہ اس کو (جابر کے ذریعہ) سکون کی دولت حاصل ہوئی، کانوں کی روایت ہے کہ وہ (حسن کی بدولت) اچھی اچھی باتوں سے معمور ہوئے۔)

لطف یہ ہے کہ ان اعضاء نے جن احسانات کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے سلسلہ میں جن محسنین کے نام لئے ہیں، وہ سب راویان حدیث اور شیوخ کاملین ہیں، مثلاً قرۃ بن خالد السدوسی، صلۃ بن اشیم العدوی، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور امام حسن بصریؒ۔

---

[1] اسی مدرسہ ولی اللّٰہی کے فضلاء اور شاہ صاحب کے تلامذہ کے تلامذہ شاہ اسحٰق صاحب دہلوی، اور شاہ عبد الغنی صاحب مجددی نے حرمین شریفین میں خدمت ودرس حدیث کی بساط بچھائی [illegible] عرب وعجم کو فیض پہونچایا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷۔

شاہ صاحبؒ کی تصنیفی خدمات

شاہ صاحب نے حدیث اور علوم حدیث پر جو تصنیفات کیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ مصفّٰی (مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح)

۲۔ مسوّٰی (مؤطا کی عربی شرح)

شاہ صاحبؒ فقہ حدیث اور درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے، یہ دونوں کتابیں اس کا نمونہ ہیں، اور ان سے شاہ صاحبؒ کی علوم حدیث اور فقہ حدیث میں محققانہ اور مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے، وہ مؤطا کو صحاح ستہ میں پہلے درجہ پر رکھتے تھے، اور اس کو ان میں ابن ماجہ کی جگہ پر شمار کرتے تھے[۱]، وہ مؤطا کے بے حد قائل اور اس کے ساتھ اعتناء کرنے اور اس کو درس حدیث میں اوّلیت دینے کے پرجوش داعی اور مبلغ ہیں[۲]

شاہ صاحبؒ اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

چوں قدرت بزبان عربی یافت	جب عربی زبان پر قدرت حاصل
مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ المصمودی	ہو جائے مؤطا کے اس نسخہ کو جو
بخوانانند و ہرگز آں را معطل	یحییٰ بن یحییٰ المصمودی کی روایت
نگذارند کہ اصل علم حدیث	سے ہے پڑھائیں، ہرگز اس سے
ہست و خواندن آں فیضہا دارد مارا	پہلوتہی نہ کریں کہ وہ علم حدیث کی

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا عبید اللہ سندھی کا مقالہ "الفرقان" شاہ ولی اللہؒ نمبر ص ۲۹۲-۲۹۸

۲؎ ملاحظہ ہو مقدمہ مصفّٰی نیز "الفائدة الثانية فی درجة المؤطا من بين كتب الحديث" مقدمہ اوجز المسالک از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ص ۳۲-۳۳ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۹۳ھ

سماع جمیع آں مسلسل است[1] — اصل ہے اور اس کا پڑھنا بڑے فیوض کا حامل ہے، ہم کو مکمل مؤطا کی سماعت مسلسل طریقہ پر حاصل ہے۔

۳۔ شرح تراجم ابواب صحیح بخاری، صحیح بخاری کے تراجم والواب کی جو ہر زمانہ میں درس بخاری کے سلسلہ کی دقیق ترین چیز سمجھی گئی ہے اور ہر زمانہ میں بخاری کے شُرّاح اور اساتذہ نے اس میں اپنی ذہانت اور دقیقہ سنجی کے نمونے پیش کئے ہیں، یہ رسالہ عربی میں ہے، پہلے ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہوا، پھر اصح المطابع، دہلی کے صحیح بخاری کے نسخے کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا۔[2]

۴۔ مجموعہ رسائل اربعہ، چار مختصر رسائل کا مجموعہ ہے جن میں "ارشاد الیٰ مہمات الاسناد" اور تراجم البخاری (یہ شرح تراجم ابواب بخاری کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے) شاہ صاحبؒ کی تصنیف ہیں۔

۵۔ "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین" "النوادر من حدیث سید الأوائل والأواخر" اربعین، شاہ صاحبؒ نے اس فضیلت کے حصول کے لئے جو چالیس احادیث جمع کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اور مختلف زمانوں میں علماء نے اس پر عمل کیا ہے، یہ رسالہ تصنیف کیا، یہ احادیث عام طور پر بہت مختصر قلیلۃ المبنی کثیرۃ المعنی ہیں، اور رسالہ اس قابل ہے کہ زبانی یاد کیا جائے، اور نصاب میں داخل کیا جائے۔

---

[1] وصیت نامہ فارسی ص۱۱

[2] شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری (م ۱۴۰۲ھ) کے رسالہ "تراجم ابواب بخاری" میں بھی وہ شامل ہے۔

۶۔ مسلسلات۔

وہ کتابیں جو براہ راست فن حدیث پر نہیں ہیں، مگر ان کا بالواسطہ حدیث سے تعلق ہے اور وہ مقدمات علم حدیث کے طور پر پڑھی جانی چاہئیں اور ان سے شاہ صاحب کی علم حدیث پر گہری نظر، فقہ و حدیث میں تطبیق اور مذاہب کے محاکمہ میں انصاف و وسعتِ قلب طبقات محدثین اور طبقات کتب حدیث کے بارے میں ان کی وسیع نظر اور عمومی طور پر ان کے اس توازن و اعتدال کا اندازہ ہوتا ہے جس سے اللہ تعالٰی نے ان کو نوازا تھا، یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف"

"حجۃ اللہ البالغۃ" میں "تتمہ" کے عنوان سے چند عناوین و مضامین ہیں جو صفحہ ص۱۴۰ - ۱۶۲ تک پھیلے ہوئے ہیں[1]، یہ تتمہ چار ابواب پر منقسم ہے، ناشر کی تحقیق ہے کہ یہ تتمہ صرف ایک ہی نسخہ میں پایا گیا، اس باب کے آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے ایک مستقل کتاب کی تالیف کا عزم کیا جس کا نام "غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" رکھوں گا، اور اس میں تفصیل سے اسباب اختلاف پر بحث، اور اس کے شواہد و امثال بھی پیش کروں گا، لیکن اس وقت تک اس کام کے لئے فرصت نہیں ملی، جب اس کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) میں اس مقام تک بحث پہونچی تو میں نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ اس وقت ذہن میں ہے اور اس کا قلم بند کرنا آسان ہے، اس کو پیش کر دوں[2]۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں شاہ صاحبؒ کو اس کا موقعہ ملا اور حجۃ اللہ کے

---

[1] نسخہ، مکتبۂ سلفیہ لاہور [2] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۶۱ (سلفیہ)

اس مضمون کو لے کر کچھ اضافوں کے ساتھ علیحدہ رسالہ میں "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" کے نام سے مکمل کر دیا، اس لئے اس رسالہ اور حجۃ اللہ کے تتمہ دوم میں کہیں کہیں اختلاف اور خفیف حذف و اضافہ نظر آتا ہے۔

یہ رسالہ الانصاف (جو اپنے موضوع پر منفرد ہے) ہندوستان اور بیرون ہند میں کئی مرتبہ شائع ہوا، جن میں کہیں کہیں الفاظ کا اختلاف پایا جاتا تھا، ۱۳۲۷ھ میں "شرکۃ المطبوعات العلمیہ" مصر کی طرف سے پہلی مرتبہ، اور "مکتبۃ المنصورۃ" مصر کی طرف سے دوسری مرتبہ رسالہ عربی ٹائپ میں شائع ہوا، اس وقت ہمارے سامنے "دار النفائس" بیروت کا عمدہ ٹائپ کا چھپا ہوا نسخہ ہے، جو چھوٹے سائز کے ایک سو گیارہ صفحات میں آیا ہے، عصر حاضر کے محدث جلیل شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ نے اس کے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت انجام دی اور اس پر حواشی کا اضافہ کیا۔

۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔

۳۔ حجۃ اللہ البالغۃ کا المبحث السابع۔[1]

درحقیقت حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے حصہ کے القسم الثانی فی بیان اسرار ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تفصیلاً سے لے کر دوسرے جز کے آخری حصہ "الفتن والمناقب" تک حدیث ہی کی حکیمانہ اور متکلمانہ شرح اور اس کے اسرار و حکم، اور اس کی عملی تطبیق کی وہ مجتہدانہ کوشش ہے جو شاہ صاحب ہی کا حصہ تھا، اور جس میں ان کو سبقت و اولیت حاصل ہے، افسوس ہے کہ حجۃ اللہ البالغۃ کا مطالعہ کرنے والے اور اس کا درس دینے والے بھی (علی أنهم أقل قليل) اس حصہ کو غیر اہم سمجھ کر

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ از ص ۱۲۸ تا ۱۵۴

نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تطبیق بین الفقہ والحدیث

عرصہ سے عالم اسلام کے بہت سے علمی، تدریسی اور تصنیفی حلقوں میں فقہ و حدیث کے دو متوازی سلسلے چلے آرہے تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر (جب سے اس کا اجرا ہوا تھا) دوسرے سے مستغنی و بے نیاز ہو کر اپنا سفر طے کر رہا تھا، اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے جدا ہو کر پھر وہ کسی نقطہ پر جا کر ہمکنار نہیں ہوتے تھے، بہت سے فقہی مسلکوں میں حدیث اسی وقت زیر بحث آتی، جب مسئلہ کی تائید اور دوسرے مذہب فقہی کے نمائندوں کے اس اعتراض کو دفع کرنا ہوتا کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے، یا دوسرے مذہب پر اس کی ترجیح ثابت کرنی ہوتی، صحاح کے درس میں یا تو ان احادیث کی تاویل کی جاتی جو اپنے مذہب کے خلاف پڑتیں یا دوسری کتابوں کی ان احادیث کو پیش کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تائید میں ہیں، اگر کسی مذہب فقہی کی کسی مستند و معیاری کتاب میں احادیث سے استدلال کیا گیا ہے تو بعض اوقات اس مذہب کے ان علماء نے جن کی فن حدیث پر وسیع نظر تھی اور محدثانہ ذوق رکھتے تھے، ان احادیث کی تخریج کی کوشش کی ہے اور ان پر محدثانہ کلام کیا ہے، جن سے اس کتاب میں استدلال کیا گیا ہے،[1] تو یہ سعی محمود بھی اس مذہب فقہی کی تائید و نصرت اور اس کو مطابق حدیث ثابت کرنے کا ایک طریقہ اور اس مذہب کی ایک عالمانہ اور محققانہ خدمت تھی، جو قابل قدر اور مستحق شکر ہے، نفس مسائل پر نظر ثانی کرنے اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش نہیں تھی۔

---

[1] اس کی ایک روشن مثال علامہ زیلعی کی کتاب "نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الهدایۃ" ہے۔

مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے آہنی سانچے بن گئے تھے، جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا، [1] پھیلنا ممکن نہیں تھا، ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے متعلق یہ خیال قائم کئے ہوئے تھے کہ ان کے مذہب کا سو فیصدی صحیح ہونا تو اصل حقیقت ہے باقی بشریت کی بناء پر غلطی کا امکان ضرور ہے، کسی نے اس طرز فکر کو بڑے بلیغ انداز میں اس جملہ سے ادا کیا ہے، "مذهبنا صوابٌ يحتمل الخطاء ومذهب غيرنا خطاءٌ يحتمل الصواب" (ہمارا مذہب اصل میں تو درست اور حق ہے خطا کا احتمال ہے، اور دوسرے کا مذہب (فقہی) اصلاً ناصواب ہے، صحت کا احتمال ہے) اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے درمیان (جن کو امت نے عام طور پر سند قبول عطا کی اور جن کے متعلق اہل حق و اہل علم کے درمیان شروع سے یہ اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ حق ان میں دائر ہے، ان کے بانی اور مؤسس ائمۃ الہدیٰ اور امت کے پیشوا تھے، اور یہ مذاہب حقانی ہیں) خلیج روز بروز عمیق اور وسیع ہوتی چلی جا رہی تھی، ان پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف منافرت تک، اور بحث و مناظرہ بعض اوقات مجادلہ اور مقاتلہ تک پہونچ جاتا تھا، اس سے زیادہ سخت معاملہ ان اہل علم کے ساتھ ہوتا تھا،

---

[1] یعنی اس مذہب کو ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کر لینے، حنفیت سے شافعیت یا بالعکس، یا عمل بالحدیث کا مسلک اختیار کر لینے کی مثالیں ہر زمانہ میں ملیں گی، لیکن ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر بعض مسائل سے جزئی طور پر عدول اور کسی دوسرے مذہب کے مسئلہ کو اختیار کر لینے، یا کسی مسئلہ میں حدیث پر عمل کرنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی، اس لئے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک "تجزیٔ تقلید" صحیح نہیں، یعنی کسی مذہب و امام کا مقلد کسی مسئلہ میں بھی اگر دوسرے مذہب و امام کی تقلید اور اس کے مسئلہ پر عمل کرے تو وہ اپنے امام کی تقلید کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔

جو کلّی یا جزئی طور پر عبادات میں حدیث پر عمل شروع کر دیتے تھے، اس کی ایک مثال اسی بارہویں صدی کے ایک سلفی عالم و محدّث مولانا شیخ محمد فاخر زائرالٰہ آبادی (۱۱۲۰ھ۔۱۱۶۴ھ) ہیں، جو (بعض مصنفین کی روایت کے مطابق) اپنے اتباعِ حدیث و سلفیت کی وجہ سے عوام کی ناراضگی کا نشانہ بنے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمتِ حدیث اور انتصار للسنۃ ہی کے سلسلہ زرّیں کی ایک اہم کڑی ان کی فقہ و حدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش تھی، اس سے اس بشارت نبویؐ کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا"۔[2]

جہاں تک ہندوستان کے تحتی برّاعظم کا تعلق ہے، اس میں اس طرز فکر اور جمع و تطبیق کی اس کوشش کا سراغ نہیں ملتا اور اس کے تاریخی و علمی اسباب ہیں، یہ تحتی برّاعظم شروع سے ان فاتحین اور بانیانِ سلطنت کے زیر نگین رہا جو یا ترکی النسل تھے یا افغانی النسل، اور یہ دونوں قومیں تقریباً اپنے اسلام قبول کرنے کے زمانہ سے مذہب حنفی کی حلقہ بگوش بلکہ اس کی حمایت اور نشر و اشاعت میں سرگرم اور پرجوش رہیں، یہاں اسلام کی تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ میں مذہب مالکی اور مذہب حنبلی کو تو قدم بھی رکھنے کا موقعہ نہیں ملا، شافعی مذہب سواحل تک محدود رہا، یا جنوبی ہند مدراس اور شمالی کنارے (موجودہ کرناٹک کے) بعض حصوں بھٹکل وغیرہ اور کیرالا میں محدود رہا، ان میں بھی مالابار (قدیم بلاد المعبر) کو مستثنیٰ کر کے جہاں زیادہ تر شافعی مسلک کے داعیانِ اسلام، تجّار، مشائخ اور فقیہ و عالم آئے، شیخ مخدوم

---

[1] شیخ فاخر الٰہ آبادی کے تذکرہ کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶ [2] فیوض الحرمین ص ۶۲

فقیہ علی مہایمی (م ۸۳۵ھ) صاحب تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنّان، اور مالابار کے شیخ مخدوم اسماعیل فقیہ السکّری الصدیقی (م ۹۴۹ھ) نیز مخدوم شیخ زین الدین ملیباری (م ۹۲۸ھ) صاحب فتح المعین کے علاوہ ہمارے محدودِ علم میں اس پایہ کے شافعی فقیہ و محدث نہیں پیدا ہوئے[1] جو ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند کے) علمی حلقوں پر گہرا اثر ڈالتے، اور علماءِ حنفیہ کو فقہ شافعی پر عمیق نظر ڈالنے اور اس سے استفادہ پر آمادہ کرتے، ہندوستان سے جو علماء اور طالبانِ علم حدیث وفقہ حجاز جاتے (جو ترکی سلطنت کے زیرِ انتظام تھا، اور ترک ہر دور میں سو فیصدی سنّی اور حنفی رہے ہیں) وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی مذہب کے علماء اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ہم وطن اساتذۂ فقہ و حدیث سے رابطہ رکھتے، جو وہاں ہندوستان یا افغانستان سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے، اور ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا۔[2]

شاہ ولی اللہ صاحبؒ پہلے شخص تھے، جن کا حرمین شریفین میں اصل تلمذ اور استفادہ ایک جلیل القدر شافعی محدث شیخ ابوطاہر کردی مدنی سے تھا، وہ ان کے علم، ان کی شخصیت اور ان کے باطنی کمالات، وسعت نظر اور وسعت قلب سے بھی متاثر ہوئے، شاہ صاحب نے "انسان العین" میں اپنے جن مشائخ حرمین کا تعارف کرایا، ان میں صرف ایک شیخ تاج الدین قلعی حنفی عالم و محدث تھے، ان مشائخ میں شیخ محمد وفد اللہ بن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مالکی المذہب تھے، جس دور میں شاہ صاحب نے حرمین میں قیام کیا ہے، اس دور میں حجاز کی علمی قیادت اور تعلیم و تدریس کے میدان (بالخصوص فنِ حدیث کی تعلیم) میں سربراہی اور پیشوائی علماء و محدثین یمن یا کردی النسل علماء

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "عرب و دیارِ ہند" تالیف مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی بھٹکلی۔

[2] مثلاً علامہ شیخ علی متقی برہانپوری، صاحب کنز العمال، علامہ قطب الدین نہروالی، ملا علی قاری ہروی مکی، شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ محمد حیاۃ سندی وغیرہ۔

کے ہاتھ میں تھی، اور وہ بالعموم شافعی تھے، ان تمام اسباب کی بناء پر شاہ صاحب کو فقہ شافعی کے اصول و قواعد، اس کی خصوصیات اور بعض مابہ الامتیاز چیزوں سے واقف ہونے کا پورا موقعہ ملا، اور اسی طرح فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے بھی باخبر ہونے کا وہ موقعہ ملا جو علمائے ہندوستان کو طویل عرصہ سے (تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، اور تمدنی اسباب کی بناء پر) میسر نہیں آیا تھا، اور اس طرح مذاہب اربعہ کا تقابلی مطالعہ (الفقہ المقارن) ان کے لئے ممکن اور آسان ہوا، جو ان علماء کے لئے دشوار تھا، جن کو یہ مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔

شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ میں تیس[۳۰] سال کی عمر میں جب وہ تقریباً بارہ[۱۲] سال ہندوستان میں درس دے چکے تھے عازم حجاز ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت میں فطری طور پر جو جامعیت نظر و قلب میں وسعت، اور فطرتاً تطبیقی ذوق، اور عارف رومیؒ کی اس وصیت پر عمل کرنے کا فطری رجحان پیدا کیا تھا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اس کی بناء پر سفر حجاز سے پہلے ہی ان کے اندر تطبیق بین الفقہ والحدیث کا جذبہ اور فقہائے محدثین کے مسلک کو ترجیح دینے اور اس کو اپنی زندگی کا وتیرہ بنانے کا عزم پیدا کر دیا گیا تھا۔ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں خود تحریر فرماتے ہیں:-

بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ	مذاہب اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ
واصول فقہ ایشاں واحادیثے کہ	کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث
متمسک ایشاں است قرار داد	سے وہ استدلال کرتے ہیں، ان پر غور
خاطر بمدد نور غیبی روش فقہائے محدثین	وفکر کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین

افتاد، بعد ازاں شوق زیارت حرمین محترمین در سرافتاد۔[1]

کی روش کی پسندیدگی قرار پذیر ہوئی، اس میں نورِ غیبی کی مدد بھی شامل تھی، اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔

شاہ صاحب نے غالی فقہاء (جو اپنے مذہب سے سر مو انحراف کرنے کے لئے تیار نہیں) اور فرقۂ ظاہریہ (جو مطلقاً فقہ کا منکر اور ان فقہاء کی شان میں لب کشائی کرتا ہے جو حاملین علم کے سرتاج اور اہل دین کے امام و پیشوا ہیں) کی روش پر سخت تنقید کی ہے، اور دونوں کے غلو و انتہا پسندی کو ناپسند کیا ہے، اور صاف لکھا ہے کہ "إنَّ الحقَّ أمرٌ بين بين" معاملہ بین بین ہے، نہ پہلا فریق سو فیصدی حق پر ہے، نہ دوسرا فریق۔

شاہ صاحبؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج، دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع، دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے، اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہے، اور بعض اس کے برعکس، ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراطِ مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے، اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے، اور یہی امام حسن بصریؒ کا قول ہے"۔[2]

---

[1] الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف مشمولہ انفاس العارفین مطبع مجتبائی ص ۲۰۳-۲۰۴ [2] حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۵۲ جزء اول تفصیل کے لئے پوری بحث "حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدھا" میں دیکھی جائے۔

اپنے فارسی وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ وحدیث کردن ودائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن۔	مسائل فروعی میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہیئے جو فقہ وحدیث دونوں کے عالم ہوں، مسائل فقہیہ کو کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاتے رہنا چاہیئے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست[1]۔	امت کے لئے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہو سکتی۔

شاہ صاحب کا سارا علمی نشوونما فقہ حنفی واصول فقہ حنفی کے ماحول میں ہوا تھا، اور وہ مذہب حنفی کی خصوصیات سے اتنا ہی واقف اور ان کے اتنا ہی قائل تھے، جتنا کہ کوئی بڑے سے بڑا حنفی عالم ہو سکتا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف تھے اور جا بجا اس کا اظہار کرتے ہیں کہ مختلف تاریخی، علمی، سیاسی وتمدنی اسباب کی بناء پر جتنی فقہ حنفی (نیز فقہ شافعی) کی خدمت ہوئی ہے اور ان کی نوک پلک درست کی گئی ہے ان کے متون کی شرح اور اصول کی تفریع کی گئی ہے

---

[1] وصیت نامہ فارسی ص ۲-۳

ا کسی دوسرے مذہب کے سلسلہ میں پیش نہیں آیا، وہ امام ابوحنیفہؒ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

کان عظیم الشان فی التخریج علی مذھب ابراھیم واقرانہ دقیق النظر فی وجوہ التخریجات مقبلا علی الفروع اتم إقبال[1]۔	امام ابوحنیفہ کا مرتبہ ابراہیم نخعی اور ان کے ہم مرتبہ علماء کے مذہب پر اجتہاد و استنباط کے سلسلہ میں بہت بلند تھا، ان تخریجات کے وجوہ واشکال میں وہ بڑی دقت نظر رکھتے تھے، مسائل جزئیہ اور فروع کے استخراج میں ان کا انہماک بہت بڑھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ وہ امام مالکؒ کی عظمت اور خاص طور پر مؤطا کی صحت، اس کے رتبہ ومقام، اور اس کی برکت کے نہ صرف قائل بلکہ داعی ہیں، اور اس کو حدیث کی اساسی کتابوں مانتے ہیں[2]، دوسری طرف مذہب شافعی کے منقحؒ ومصفےٰ اور حدیث سے اقرب ہونے کا ذکر بلند الفاظ میں کرتے ہیں، اور امام شافعی کی دقیق النظری کے بڑے قائل ہیں[3]۔

پھر اس کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

وکان اعظمھم شأنا وأوسعھم روایۃً، وأعرفھم للحدیث مرتبۃً وأعمقھم فقھـــا احمد بن حنبلؒ ثم اسحاق بن راھویہ[4]۔	ان فقہاء و محدثین میں سب سے عالی مرتبہ وسیع الروایۃ، حدیث سے باخبر، اور تفقہ میں عمیق النظر امام احمد بن حنبلؒ پھر اسحاق بن راہویہ ہیں۔

---

[1] "الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف" طبع دار النفائس، بیروت ص۳۹ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ مصفّٰی۔

[3] ملاحظہ ہو الخیر الکثیر ص۱۲۴ وکتاب قرۃ العینین ص۲۴۲ [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص۱۵۰

ان ائمہ اربعہ کے علوّ شان، وسعت علم، دقّت نظر اور امت پر احسان سے (ان کتابوں اور تاریخ وتراجم کے ذریعہ) براہ راست واقفیت اور ان سے دلی عقیدت کی بناء پر شاہ صاحب میں وہ جامعیت اور فقہ وحدیث کے تقابلی مطالعہ میں وہ توازن واعتدال پیدا ہو گیا، جس کی قدرۃً ان علماء ومصنفین سے توقع نہیں کی جا سکتی، جن کا مطالعہ اور ذہنی وابستگی ایک ہی مذہب فقہی اور اس کے بانی ومؤسس سے تھی، اور ان کو اس دائرہ سے باہر نکلنے کی (بہت سے طبعی وشخصی اسباب کی بناء پر) نوبت نہیں آتی۔

اجتہاد وتقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال

حضرت شاہ صاحبؒ کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا، وہ متوازن ومعتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے، جو انھوں نے اجتہاد وتقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کی طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ عامی ہو یا خاص براہ راست کتاب وسنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلّف قرار دیتے تھے، اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علّامہ ابن حزمؒ پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے، اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا، اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام "فاسق" اور "ضال" سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین

اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا تھا کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خودرائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار اور فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے، اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقعہ دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے، لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دے دیا، اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلۂ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا، اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں، عبادات و معاملات میں جو نئے مسائل و مشکلات پیش آتے تھے، ان کو وہ کس طرح حل کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں وہ کیا راستہ اختیار کرتے تھے، "حجۃ اللہ البالغۃ" کے باب "حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدھا" (چوتھی صدی ہجری سے پیشتر اور اس کے بعد کے لوگوں کا مسائل دینی کی تحقیق و عمل کے بارے میں کیا طرز عمل تھا؟) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا طرز عمل

"معلوم ہونا چاہیئے کہ چوتھی صدی سے قبل کے لوگ کسی ایک معیّن مذہب (فقہی) کی پابندی اور اس کی مکمل تقلید پر اجماع کئے ہوئے نہیں تھے، ابوطالب مکیؒ (اپنی مشہور کتاب) "قوت القلوب" میں لکھتے ہیں: کہ تصنیفی انداز کی کتابیں (اور

فقہی مسائل کے مجموعے) اس زمانہ کے بعد کی باتیں ہیں، لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کا کہنا کسی ایک مذہب پر فتویٰ دینا، اس کے قول کو دستور العمل بنا لینا اور اسی کو نقل کرنا اور اسی مذہب کے اصولوں اور بنیادوں پر تفقّہ کا پہلی اور دوسری صدی میں وجود نہیں تھا۔

میں اس میں اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ دو ابتدائی صدیوں کے بعد تخریج کا کسی قدر سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ چوتھی صدی کے لوگ ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر تقلید خالص کے پابند اور اسی کے مطابق مسائل و احکام میں تفقّہ اور اسی مذہب کے تحقیقات و اجتہادات کی نقل و روایت کے عادی نہیں تھے، جیسا کہ تتبّع سے معلوم ہوتا ہے۔

امت اور (مسلم معاشرہ) میں دو طبقے تھے ایک علماء کا ایک عوام کا۔

عوام کا تو قصہ یہ ہے کہ وہ ان اجماعی مسائل میں جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ صرف صاحب شرع (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تقلید کرتے تھے، وہ وضو، غسل کرنے اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اسی طرح کی عبادات و فرائض، اپنے والدین یا اپنے شہر کے استادوں عالموں سے اخذ کرتے تھے، اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، اور اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے بھی جس تک ان کی رسائی ہوتی تھی، کسی خاص مذہب کے تعین کے بغیر رجوع کر لیتے تھے، اور اس سے مسئلہ پوچھ لیتے تھے۔

جہاں تک خواص کا تعلق ہے ان کا معاملہ یہ تھا کہ جن کا فن حدیث تھا، وہ حدیث سے اشتغال رکھتے تھے، ان کو احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ کا اتنا ذخیرہ

مل جاتا تھا، کہ اس کی موجودگی میں ان کو اس مسئلہ میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ان کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی حدیث جو درجہ شہرت، استفاضہ یا صحت کو پہونچی ہوتی تھی، یا صحیح حدیث ہوتی تھی، موجود تھی، جس پر فقہاء اور علمائے کبار میں کسی نہ کسی نے عمل کیا ہوتا تھا، اور کسی کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوتا تھا، یا جمہور صحابہؓ اور تابعین کے پے در پے ایک دوسرے کی تائید کرنے والے اقوال ان کے پاس ہوتے تھے، جن سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، اگر ان میں سے کسی کو مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے اس کا قلب مطمئن ہوتا، نقول کے تعارض یا ترجیح کے اسباب کے عدم وضاحت کی وجہ سے یا کسی اور معقول سبب سے تو پھر وہ اپنے پیشرو فقہاء اور علماء کے کلام کی طرف رجوع کرتا تھا، اگر اس کے بارے میں اس کو دو قول ملتے، تو ان میں سے وہ اس کو اختیار کر لیتا جو زیادہ قوی اور مُدلّل ہوتا، چاہے یہ قول علمائے مدینہ کا ہوتا، یا علمائے کوفہ کا، جو تخریج (اجتہاد و استنباط) کی اہلیت رکھتے تھے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں ان کو کوئی صراحت نہیں ملتی تھی، تخریج و اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اساتذہ یا اہل گروہ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی، علمائے حدیث میں بھی جو کسی مذہب سے زیادہ اتفاق کرتا تھا، اس کی طرف منسوب ہو جاتا تھا، مثلاً نسائی اور بیہقی کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کی جاتی تھی، اس زمانہ میں قضاء و افتاء پر اسی کا تقرر کیا جاتا تھا جس میں اجتہاد کی صلاحیت ہوتی تھی، فقیہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہوتا، پھر ان صدیوں کے بعد دوسری طرح کے لوگ

پیدا ہوئے جنھوں نے چپ و راست کا راستہ اختیار کیا۔[1]"

تقلید کی جائز اور فطری شکل

شاہ صاحبؒ غایتِ انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معیّن امام کا مقلّد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبوی ہے لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہونچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے وقت و فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلا لے، یا ان سے مسئلہ استنباط کر لے، شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے، تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا، اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (کے اقوال و احوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۵۲-۱۵۳

مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا، اور اس کو سر دشریعت کا مخالف قرار دے گا؟!

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے، یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے، اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری، اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور یہ کہ وہ معصوم ہے تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بناء پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں، یا وہ کتاب و سنت کے صریح حکم پر مبنی ہے، یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے،

اس بناء پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علّت پائی جائے، وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلّیہ میں شامل ہے' اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی جاسکتی ہے لیکن ظنّی طریقہ پر' اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی طاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابلِ وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو' اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنّی طریقہ کی پیروی کریں' تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟[1]"

مذاہب اربعہ کی خصوصیت

اس منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کے بعد شاہ صاحبؒ ان چار فقہی مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے بارے میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جا رہا ہے' اپنے رسالہ "عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد" میں جو "بہ قامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

"یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے، اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۵-۱۵۶

ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر وعلی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشرووں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے، اور نقل جب ہی ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرق اجماع نہ ہو جائے، اس لئے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صرف نحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگ ریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی، مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے، وہاں

یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقیّد کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جا چکی ہو، اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جا چکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ صفات پائے جاتے ہوں، اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے[1]"

اس طرح شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے، جو مقاصدِ شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے، انھوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحبِ شریعت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع اور کتاب و سنت کی پیروی ہے، اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنائے ہیں، وہ کتاب و سنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا عص نمائندہ اور ترجمان ہے، نیز یہ کہ ذہن اس کے لئے تیار رہے (خواہ اس کا موقعہ مدتوں میں آئے) کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائیگا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے، اور سنت سے ثابت حکم دوسرا ہے تو ایک صاحبِ ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کبھی تامّل نہ ہوگا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ	تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ	اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں
اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ	اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں
وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥	تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے
(سورۂ نساء - ۶۵)	مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

---

[1] عقد الجید صـ ۳۶-۳۸

ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اور ان کی عظمت کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اور اس فقہی و حدیثی ذخیرہ کو بیش قیمت اور قابل استفادہ قرار دیتے ہوئے اور اس سے بے نیازی و استغناء کو مضر و محرومی کا سبب مانتے ہوئے شاہ صاحب اس کے قائل ہیں کہ اجتہاد (اپنی شرطوں اور ضروری احتیاطوں کے ساتھ) ہر دور کی ضرورت، حیات انسانی اور تمدن و معاشرت کی تغیر پذیری، اور نمو و ارتقا کی صلاحیت اور انسانی ضروریات، حوادث و تغیرات کے تسلسل کا فطری تقاضا اور شریعت اسلامی کی وسعت، اس کے من جانب اللہ ہونے اور قیامت تک انسانوں کی رہنمائی اور معاشرہ کے جائز تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت ہے، جس کا اظہار اور ثبوت ہر دور میں ضروری اور حاملین شریعت کا فرض ہے۔

مقدمۂ مصفّٰی میں لکھتے ہیں:-

"اجتہاد ہر زمانہ میں فرض بالکفایہ ہے، یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں، جیسا کہ امام شافعیؒ کا اجتہاد تھا، جو جرح و تعدیل، زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے، اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے، مقصود اجتہاد منتسب ہے، اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحبِ مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانہ میں فرض ہے (اور یہ محققین اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصر ممکن نہیں، اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے، اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں، جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں ان میں اکثر میں انقطاع ہے کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کر سکتا، اس لئے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کئے اور تحقیق کئے بغیر معاملہ بنتا نہیں۔[1]

---

[1] مقدمہ مصفّٰی (فارسی) ص۱۲ مطبع فاروقی دہلی۔

باب ہفتم

شریعتِ اسلامی کی مربوط و مدلّل ترجمانی اور اسرار و مقاصدِ شریعت کی نقاب کشائی

حجۃ اللہ البالغۃ کے آئینہ میں

حجۃ اللہ البالغہ کا امتیاز و انفرادیت

شاہ صاحبؒ کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب اور علمی کارنامہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس میں دین و نظامِ شریعت کا ایک ایسا مربوط، جامع اور مدلّل نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع وتمدن، سیاست و "احسان" کو ایک ایسے ربط و تعلق اور صحیح تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور ایک زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں، اور ان میں اصول و فروع، مقاصد و وسائل اور دائمی و موقّت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، جو ان بہت سی تصنیفات و تحقیقات کی قدیم کمزوری ہے جو کسی غلو یا ناانصافی کے ردّ عمل یا کسی جذبہ یا جوش کے ماتحت لکھی گئی ہیں، اس ربط و تناسب کی وجہ (شاہ صاحب کی فطری سلامتِ طبع و اعتدال کے علاوہ) ان کا علمِ حدیث کا گہرا اور وسیع مطالعہ اور وہ مخصوص مزاج ہے جو حدیث اور سیرت کے اشتغال یا مزاجِ نبویؐ سے مناسبت رکھنے والے کسی "عالمِ ربّانی" کی صحبت و تربیت میں پیدا ہوتا ہے، اسلام کی یہ مربوط و جامع ترجمانی جو حجۃ اللہ کے صفحات میں دیکھنے میں آتی ہے،

بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آئیگی[1] اس طرح حجۃ اللہ البالغہ اس دور عقلیت کے لئے ایک نیا علم کلام بن گیا ہے، جس میں ایک حق پسند و سلیم الطبع انسان کے لئے (جس کو علمی استعداد اور دقّت نظر کا بھی کچھ حصہ ملا ہو) تشفی کا وافر سامان ہے، ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید اور اس کی حکیمانہ توجیہ و تشریح میں (ان زبانوں میں جن سے ہم واقف ہیں) اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی، اور اگر لکھی گئی تو اس وقت علمی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔

بارہویں صدی کے کچھ بعد ہی ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں (مختلف تعلیمی، تمدنی، علمی و عقلی اسباب کی بناء پر) ایک خاص طرح کی "عقلیت" کا جو دور شروع ہونے والا تھا، اور احکام شریعت کے اسرار و مصالح کی جستجو کا جو عام ذوق پیدا ہونے والا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے ذہن بھٹکنے اور بہت سے قلم بہکنے کے لئے تیار تھے، خاص طور پر حدیث اور سنت (خاص اسباب کی بناء پر) اعتراضات و شبہات کا سب سے زیادہ نشانہ بننے والی تھی[2] ان نئے تقاضوں سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو کتاب و سنت علوم حکمت، علم کلام، علم الاخلاق، علم النفس (اور اپنے زمانہ کے حدود کے اندر) علم الاقتصاد علم المعیشت اور علم السیاست سے واقف ہو، پھر ان سب کے ساتھ احسان اور تزکیہ کے

---

[1] معاصر عرب فضلاء و اہل نظر میں راقم سطور نے زعیم مغرب علامہ علال الفاسی مراکشی مصنف "مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ و مکارمها" اور معالی الاستاد محمد المبارک سابق عمید کلیۃ الشریعۃ و وزیر شام کو شاہ صاحب کی طرح اور حجۃ اللہ البالغہ کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا، وہ خاص طور پر اسی پہلو سے متاثر تھے کہ اس کتاب میں دین کے تمام شعبوں یہاں تک کہ اخلاق اور تزکیۂ نفس و احسان تک کی نمائندگی و ترجمانی ہے۔

[2] اس کی تفصیل مصنف کے رسالہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" میں دیکھی جا سکتی ہے ملاحظہ ہو ص ۴۱-۴۵

فن کے جوہر و حقیقت سے نہ صرف آگاہ بلکہ اس میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو۔

اس سب کا اقتضاء تھا کہ اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بارہویں صدی کے امام کے قلم سے ایسی کتاب لکھوادی جائے، جو اس ضرورت کو اس بڑی حد تک پورا کرے، جو کسی ایسے انسان کے قلم سے ممکن ہے، جو بہرحال انسان ہے، وہ نہ معصوم ہے، نہ اس کا علم سارے زمانوں، مقامات، اور معلومات پر محیط ہے، اس پر اپنے زمانہ کی (کم سے کم درجہ میں) چھاپ اور اس نظام تعلیم و تربیت کا اثر بھی ہے، جس میں اس نے نشوونما پایا ہے، پھر بھی وہ اصلاً دانش کدۂ قرآنی اور درس گاہ حدیث و سنت کا فیض یافتہ اور ان کا ترجمان نظر آتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تصنیف کے محرّکات و دواعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علومِ حدیث میں سب سے باریک، دقیق و عمیق، رفیع و بدیع علم، اسرارِ دین کا وہ علم ہے جس میں احکام کی حکمتیں اور ان کے لِمّیات اور خواص اعمال کے اسرار و نکات بیان کئے جائیں، جن کے ذریعہ انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحبِ بصیرت بن جاتا اور خلط و خبط سے محفوظ رہتا ہے۔"[1]

موضوع کی نزاکت

لیکن حقائقِ دینی اور احکامِ شرعی کی حکمتوں، مصالح اور اسباب و علل کے بیان کرنے کا موضوع بڑا نازک ہے، ذرا سی بے اعتدالی، کسی خاص رُجحان کے غلبہ یا زمانہ کے اثر سے پڑھنے والے کا ذہن شرائع سماوی اور تعلیمات نبویؐ کی پٹری سے اتر کر جس میں اصل مقصود رضائے الٰہی، قربِ خداوندی اور نجاتِ اخروی کو قرار دیا گیا ہے، مادّی منافع زندگی

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳

بہتر تنظیم اور تمدنی فوائد یا سیاسی مقاصد کے حصول کی پٹری پر پڑجاتا ہے، اور سعی وجہد کے پورے سلسلہ سے ایمان واحتساب[1] کی روح یا تو بالکل نکل جاتی ہے یا بہت کمزور ومجروح ہو کر رہ جاتی ہے، مثال کے طور پر نماز کی حکمت ومصلحت یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک فوجی پریڈ ہے اور اس سے نظم واطاعتِ امیر اور حکومت اسلامی کے قیام میں مدد ملتی ہے، روزہ صحت کے لئے مفید ترین طریقہ ہے، زکوٰۃ اہل دولت پر غریبوں کا ٹیکس ہے، حج ایک سالانہ بین الاقوامی اسلامی مؤتمر (کانفرنس) ہے، جس میں ملت کے مفاد میں مسائل پر غور ومشورہ کیا جاتا ہے۔

ان خطرات کے پیش نظر (جنھوں نے امکانات واحتمالات سے بڑھ کر واقعات اور عملی مثالوں کی جگہ لے لی ہے) اس موضوع سے صحیح طور پر وہی عالم عہدہ برآ ہو سکتا تھا، جس کے ہاتھ میں دین وشریعت کا اصل سررشتہ ہو، جو شرائع الٰہی کے نزول اور انبیاء کی بعثت کے مقصد سے آگاہ ہو، اور جس کے رگ وپے میں ایمان واحتساب کی روح سرایت کر چکی ہو اور جس کا ذہنی وعلمی نشوونما کتاب وسنت اور ایمان واحتساب کے ماحول میں اور ان کے زیر سایہ ہوا ہو، اور شاہ صاحب (جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہو چکا ہے) اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے موزوں ترین شخصیت تھے۔

---

[1] حدیث وسنت کی اصطلاح میں کسی عمل کو اجر وثواب کی لالچ اور شوق اور اس پر اللہ کی طرف سے جو وعدے ہیں، ان کے یقین کے ساتھ کرنے کو "احتساب" کہتے ہیں، صحیح حدیث میں آتا ہے "من صام رمضان ایماناً واحتساباً غُفِرلہ ما تقدم من ذنبہ" (بخاری) (جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کے شوق وطمع میں رکھے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے) قیام لیلۃ القدر کے بارے میں بھی ایسی ہی حدیث وارد ہوئی ہے۔

مستقل تالیف کی ضرورت اور علمائے متقدمین کی ابتدائی کوششیں

شاہ صاحبؒ اس موضوع پر متقدمین کی مختصر کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"متقدمین نے ان مصالح کی نقاب کشائی کی ہے جن کی ابواب شرعی میں رعایت کی گئی ہے، بعد کے محققین نے بعض بڑے قیمتی نکتے بھی بیان کئے ہیں لیکن اس کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اب اس موضوع پر کلام کرنا خرق اجماع نہیں رہا، کسی نے اس موضوع پر مستقل تصنیف نہیں کی، اور اس کے اصول و فروع کو پورے طور پر مرتب نہیں کیا۔"[۱]

اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے امام غزالیؒ، علامہ خطابیؒ، اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ کا حوالہ دیا ہے، جن کی کتابوں اور تحریروں میں جستہ جستہ ایسے مضامین اور اشارے ملتے ہیں،[۲] شاہ صاحبؒ نے اس دعوے کی تردید کے سلسلہ میں کہ احکام شرعی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں، اور اعمال و جزا میں مناسبت کا ہونا کچھ ضروری نہیں ہے' ان آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں اعمال اور ان کے نتیجہ میں ربط بتایا گیا ہے' بعض احکام کی علت و مصلحت بھی بیان کی گئی ہے' نیز ان احادیث کا بھی ذکر کیا ہے جن میں کسی عبادت یا عمل کی مشروعیت کا سبب یا تعیینات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں' نیز بعض ممانعتوں کے ان اسباب اور حکمتوں کی مثالیں بھی دی ہیں، جو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے منقول ہیں،[۳] اور ان خیالات و ظنون کی تردید فرمائی ہے' اور ان کا جواب دیا ہے، جو اس نازک عمل کی تدوین کو ناممکن یا غیر مفید یا "فعل جدید" بتاتے ہیں' اور اس کی وضاحت کی ہے کہ اس موضوع کی طرف اس وقت پوری توجہ نہ ہونے کے

---

[۱] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳ [۲] ایضاً ص۶ [۳] ایضاً ص۵-۶

کیا اسباب تھے[1]

اس فن کی تدوین کی ضرورت و حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ایسی احادیث کو جو بظاہر ہر طرح سے مخالفِ قیاس معلوم ہوتی ہیں، بعض فقہاء نے مخالف عقل بتا کر ان کو رد کرنا جائز سمجھا، اس لئے بھی احادیث کے مطابق عقل و قیاس ہونے کو ثابت کرنا ضروری ہو گیا[2]، امت کے مختلف طبقات کا متعارض طرزِ عمل بعض کا عقل و قیاس سے بالکل آنکھیں بند کر لینا بعض کا تاویل اور ایسے موقعہ پر "صرف عن الظاهر" کا بے تکلف عمل کرنا جہاں احادیث اصول عقلیہ کے مخالف نظر آئیں اور اس بارے میں بہت سی جماعتوں کی بے اعتدالی، شاہ صاحب کے نزدیک اس فن کی تدوین جدید کو نہ صرف جائز و مفید قرار دیتی ہے، بلکہ اس کو دین کی عظیم ترین خدمت اور وقت کی اہم ضرورت ثابت کرتی ہے[3]۔

ضرورت کے اس احساس، عملی تجربے اور وقت کے تقاضے کے ماسوا شاہ صاحب کو اس کام کی تکمیل کے لئے بعض بشارات غیبی اور بارگاہِ رسالت سے ایک ایسا اشارہ بھی معلوم ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ دین کی ایک نئی نوعیت کی شرح مطلوب ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے سینہ میں ایک ایسی روشنی پائی جو برابر بڑھتی رہی، مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے مجھے قلم عطا کیا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلم ہے[4]"۔

شاہ صاحب کے تلامذہ اور اصحاب میں سب سے زیادہ ان کے ماموں زاد بھائی، برادر نسبتی، سفر حضر کے رفیق اور تلمیذ رشید شیخ محمد عاشق پھلتی کا اس کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ تقاضا و اصرار تھا، جو شاہ صاحب کے سب سے بڑے مزاج داں اور ان کے علوم و کمالات سے سب سے زیادہ واقف تھے[5]۔

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۷ [2] ایضاً ص ۹ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۳ [5] ایضاً ص ۲

بہرحال اللہ تعالےٰ نے شاہ صاحب کو اس اہم کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی اور ان کے قلم سے یہ جلیل القدر کتاب نکل کر اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہونچی۔[1]

تمہیدی و بنیادی مضامین تکلیف و مجازات

کتاب کے ابتدائی حصہ میں شاہ صاحب نے ان تمہیدی مباحث کو شامل کیا ہے جن سے ہدایتِ ربّانی، تعلیماتِ آسمانی اور انبیاء کی بعثت اور ان کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ثابت ہو، اس میں بڑی اصولی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ سب سے پہلے بھوپال کے عالم و باخدا وزیر و منتظم ریاست مدار المہام مولانا جمال الدین (م ۱۲۹۹ھ) کے ایماء و ہدایت پر انھیں کے مصارف سے مولانا محمد احسن صدیقی (م ۱۳۱۲ھ) کے اہتمام میں مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی، دوسری مرتبہ امیر الملک و الاجاہ نواب سید صدیق حسن خان بہادر (م ۱۳۰۷ھ) کے حکم سے ۱۲۹۶ھ میں مطبع بولاق مصر سے اس کی اشاعت ہوئی، مصر سے اس کے دو ایڈیشن اور نکلے ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۸ء) میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے اہتمام میں المکتبۃ السلفیہ لاہور نے اس کا ایک ایڈیشن نکالا جو مصری ایڈیشن کا آفسٹ ہے مصر سے حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن نکلا ہے جو مشہور مصری عالم اور اخوانی رہنما سید سابق کی تحقیق و مراجعت، مفصل مقدمہ اور مصنف علام کے تعارف اور سوانح کے ساتھ دار الکتب الحدیثہ قاہرہ اور مکتبۃ المثنیٰ بغداد کی طرف سے شائع ہوا ہے، لیکن کتاب کی تصحیح و تحشیہ، تخریج احادیث اور اشارات کی توضیح کے ذریعہ جو خدمت ہونی چاہیے تھی وہ ابھی تک نہیں ہوئی۔

اردو میں اس کے دو ترجمے شائع ہوئے، پہلا ترجمہ اپنے عہد کے فاضل جلیل و عالم متبحر مولانا عبد الحق حقانی کے قلم سے "نعمۃ اللہ السابغۃ" کے نام سے دو حصوں میں مکمل ہوا، یہ ترجمہ ۱۳۰۲ھ میں مکمل ہوا تھا اور ۱۳۱۲ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا، بعد میں نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی سے دوبارہ شائع ہوا، دوسرا ترجمہ مولانا خلیل احمد صاحب اسرائیلی کے قلم سے آیات اللہ الکاملہ کے نام سے مطبع اسلامی کی طرف سے شائع ہوا۔

لیکن یہ کتاب ان کتابوں میں نہیں ہے جن کا محض کسی زبان میں منتقل کر دینا اور لفظی ترجمہ کر دینا کافی ہو، اس لئے اردو خواں اصحاب ان ترجموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے، اور ان کو اس کتاب کے مضامین کی بلندی اور افادیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔

اور بنیادی بحث وہ ہے جو انھوں نے "باب سرّ التکلیف" کے عنوان کے ماتحت پیش کی ہے اور جس میں ثابت کیا ہے کہ "تکلیف[1]" نوع انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، انسان اپنی زبانِ استعداد سے سوال کرتا ہے کہ خدا اس پر ایسی چیز واجب کرے جو قوت ملکیہ کے مناسب ہو، پھر اس پر ثواب دے، اور اس پر قوت بہیمیہ میں انہماک کو (جو اس کے اندر ودیعت ہے) حرام کرے اور اس کو سزا دے[2]، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے حیوانات، نباتات اور نوع انسانی کے وسیع اور دقیق مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے، نیز طبیعیات وطب اور نباتات سے واقفیت بھی ظاہر ہوتی ہے، شاہ صاحب نے عقلی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسانوں کو حیوانات ونباتات سے جو امتیاز حاصل ہے، اور ان میں جو استعدادیں اور فطری طلب رکھی گئی ہے، وہ زبانِ حال سے تکلیفِ شرعی اور ہدایتِ ربانی کا سوال کرتی ہے، شاہ صاحب اس کو "التکفّف الحالی" (زبان حال سے بھیک مانگنا اور ہاتھ پھیلانا) کے بلیغ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے ساتھ التکفّف العلمی (علمی دریوزہ گری) کا اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر (عقل ونطق کے علاوہ) دو چیزیں اور ہیں "زیادۃ القوۃ العقلیۃ" اور "براعۃ القوۃ العملیۃ" اس میں انسان کے اندر صرف قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کا وجود ہی نہیں، بلکہ ان کی ترقی، بلند ہمتی، طلب کمال، ناآسودگی بھی اس کی فطرت میں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک خلقِ ملائکہ، حوادثِ عظیمہ اور ارسالِ رسل اسی کا نتیجہ ہے، وہ یہ سب (عنایۃ بالنوع) اس اعتنا واہتمام کا کرشمہ ہے جو پوری نوعِ انسانی کے شامل حال ہے، اور یہ سب ربوبیت ورحمت الٰہی کی تجلّیات ہیں، ان کے نزدیک

---

[1] خدا کا اپنے بندوں کو مخاطب کرنا اور اوامر واحکام پر عمل کرنے اور مناہی سے بچنے کا مکلّف بنانا جس کو قرآن مجید میں "الأمانۃ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ" (الأحزاب۔۷۲) کی تفسیر ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۹

[2] ایضاً ص ۲۰

عبادات اور عمل بالشرائع نوعِ انسان کا ایسا ہی نوعی تقاضا ہے، جیسا درندوں کا گوشت کھانا، بہائم کا گھاس چرنا، اور شہد کی مکھیوں کا اپنے سردار (یعسوب) کی فرماں برداری کرنا، البتہ حیوانات کے علوم الہامِ جبلّی سے تعلق رکھتے ہیں، اور انسان کے علوم، اعمال، کسب، نظر یا وحی یا اتباع سے تعلق رکھتے ہیں۔[1]

اس کے بعد پھر شاہ صاحب مجازات (جزا و سزا) کو تکلیف شرعی کا قدرتی تقاضا بتاتے ہیں، ان کے نزدیک اس کے چار اسباب ہیں، (۱) صورت نوعیہ کا تقاضا (۲) ملأ اعلیٰ کے اثرات[2] (۳) شریعت کا مقتضیٰ (۴) نبی کی بعثت کا نتیجہ و تقاضا، اور اللہ تعالیٰ کے اس کی قبولیت و نصرت کے فیصلہ کا لازمہ،[3] پھر انسانوں میں اپنی جبلّت میں اختلاف کی وجہ سے اخلاق و اعمال اور مراتب کمال میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اس موقعہ پر شاہ صاحب نے "ملکیت" اور "بہیمیت" کے اجتماع، ان کے غلبہ و ضعف کے تناسب اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کی (جن کو وہ "تجاذب" و "اصطلاح" کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں) آٹھ شکلیں اور ان کے خواص بیان کئے ہیں، اور ان میں جن کو ترجیح حاصل ہے اس کا ذکر کیا ہے، یہ بحث اور تفریع شاہ صاحب کی قوتِ استقراء اور ذہانت کا نمونہ اور کتاب کی خصوصیات میں ہے،[4] اور ان سے انسانوں کے احوال و فطرت کا دقیق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔

اعمال کی اہمیت اور ان کے اثرات

شاہ صاحبؒ اعمال کی اہمیت، ان کا ملکاتِ انسانی پر اثر، ان اعمال کے دنیا اور

---

[1] باب انشقاق التکلیف من التقدیر ص ۲۰-۲۴ [2] شاہ صاحب نے کتاب کے شروع ہی میں عالم مثال اور ملأ اعلیٰ کو ثابت کیا ہے کہ ان دونوں کے حوالہ کی بار بار ضرورت پیش آئیگی، اور بہت سی احادیث و آیات کا ان دونوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۳-۱۵ [3] ایضاً ص ۲۵ [4] ایضاً

آخرت میں اثرات مرتب ہونے کی تشکیلیں بیان کرتے ہیں[1]، وہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اعمال میں (ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی وجہ سے) وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے، جو ان تعویذوں اور نقوش میں ہوتا ہے، جو ایسی ہیئت خاصہ اور شرائط کے ساتھ سلف سے منقول ہیں[2]

اس طرح یہ ابتدائی مباحث کتاب کے مطالعہ کرنے والے کے ذہن کو آگے کے ان مباحث کے لئے تیار کر دیتے ہیں، جن کی بنیاد ہی انسان کے نوعی تقاضوں کے سمجھنے، تکلیفات شرعی کے اسباب اور ان پر مرتب ہونے والی مجازات، ربوبیت و رحمت کے تقاضوں اعمال کی اہمیت اور ان کے انسانوں کی ہیئتِ اجتماعی اور حیاتِ انسانی سے ربط و تعلق اور ان غیبی حقائق اور غیر مرئی عوالم و اشیاء کے وجود کے تسلیم کرنے پر منحصر ہے۔

ارتفاقات

حجۃ اللہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دوربین نگاہ اور بدلتے ہوئے حالات کے عمیق اور حقیقت پسندانہ مطالعہ نے (تائید الٰہی کی مدد سے) یہ دیکھ لیا تھا کہ جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ایک طرف لوگ احکام شریعت بالخصوص حدیث و سنت کی تعلیمات اور ارشادات نبویؐ کے حکم و اسرار کے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کے تمدنی، اجتماعی، معاشرتی اور عملی فوائد معلوم کرنا چاہیں گے، دوسری طرف وہ دین و زندگی میں ربط معلوم کرنا چاہیں گے، اور دینی تعلیمات اور آسمانی ہدایات کو زندگی کے وسیع دائرہ (CANVAS) اور انسانوں کے باہمی روابط اور اسباب و نتائج کے باہمی تعلق کے سیاق و سباق (CONTEXT) میں سمجھنے اور ان کی افادیت معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۹-۳۲ [2] ایضاً ص ۳۰

اس لئے شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" کو جو اصلاً شریعت کے اسرار و حکم اور حدیث وسنت کی عقلی تشریح کے لئے لکھی گئی، نظام تشریعی سے شروع کرنے سے پہلے جو ان اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتا ہے جن کا اصلاً تعلق ثواب وعقاب، نجات وفلاح اخروی اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں "مبحث البرّ والاثم" سے ہے، کتاب کو ان مباحث سے شروع کیا ہے جن کا تعلق دنیا کے نظامِ تکوینی اور حیاتِ انسانی سے ہے، اور جن کی پابندی سے ایک صحت مند ہیئتِ اجتماعی، اور ایک صالح تمدّن وجود میں آتا ہے، شاہ صاحب نے اس کے لئے "ارتفاقات"[1] کی اصطلاح استعمال کی ہے، جو ہمارے علم میں اس سے پہلے مسلمان متکلمین، فلاسفہ اور علمائے اجتماع نے (کم سے کم اس وضاحت اور تسلسل سے) استعمال نہیں کی۔

ارتفاق کی اہمیت

ارتفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراکِ عمل، اور معتدل ومتوازن شہری زندگی کے قیام کے لئے "تدبیرات نافعہ" ہیں[2]۔

اس طرح شاہ صاحب نے انسانی سعادت کے انفرادی واجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی واخروی دونوں زندگیوں سے بحث کی ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ نظامِ تکوینی انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے نظامِ تشریعی کے نہ صرف مطابق ہونا چاہئے، بلکہ اس کے لئے

---

[1] عربی زبان کے سب سے بڑے لغت "لسان العرب" میں رفق کے مادہ میں ہے "یقال للمتطبّب مترفّق ورفیق، والرِّفق والمِرفق والمَرفِقُ والمَرفَقُ ما استُعین بہ، وقد ترفّق بہ وارتفق، وفی التنزیل "وَیُہَیِّئْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا" وھو ما ارتفقت وانتفعت بہ، وقد ترفّق علیہ وارتفق توکّأ، وقال عزّوجلّ "نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا" وترافق القوم وارتفقوا صاروا رفقاء۔ (لسان العرب باختصار)

[2] مولانا عبدالحق حقانیؒ نے ارتفاقات کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے۔

ممد ومعاون اور ان کے مقاصد کا خادم بن کر رہنا چاہئے، انھوں نے (علمائے اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں) پہلی مرتبہ اقتصادیات وعلم المعیشت کا علم الاخلاق سے گہرا ربط ثابت کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ ربط جب ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے، جس کا اثر مذہب و اخلاق، پُرسکون زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تمدن وتہذیب سب پر پڑتا ہے، ان کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے، اس وقت انسان (جن کے اندر اللہ نے اعلیٰ روحانی ملکات اور ترقی کے امکانات ودلیعت فرمائے ہیں) گدھے اور بیل کی طرح سے روٹی حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہنے لگتے ہیں اور ہر طرح کی سعادتوں اور ترقیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شہری واجتماعی زندگی کی اہمیت اور ان کی تشکیل

شاہ صاحب شہری اور اجتماعی زندگی کی (جس کے مرکز کو وہ "المدینۃ" سے تعبیر کرتے ہیں) تعریف ایسے علمی انداز میں کرتے ہیں، جس سے بہتر اور جامع تعریف اس زمانہ تک (مصنفین وحکماء کے یہاں) نہیں کی گئی تھی "باب سیاسۃ المدینۃ" میں لکھتے ہیں:۔

وأعني بالمدينة جماعة متقاربة تجري بينهم المعاملات ويكونون أهل منازل شتى۔[1]	المدینہ (شہر) سے ہماری مراد انسانوں کی وہ جماعت ہے جس میں کسی نوع کی قربت ہو اور ان کے درمیان معاملات میں اشتراک ہو اور وہ مختلف ٹھکانوں میں رہتی ہو

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۴۴

وہ سیاستہ المدینہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

هي الحكمة الباحثة عن كيفية حفظ الربط الواقع بين أهل المدينة۔[1]

سیاست مُدُن سے ہماری مراد وہ حکمت ہے جو اس شہری زندگی کے افراد کے درمیان اس ربط و تعلق کی حفاظت کے طریقوں سے بحث کرے جو ان کے درمیان موجود ہے۔

پھر اس تمدنی زندگی یا المدینہ کی مزید تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

المدينة شخص واحد من جهة ذلك الربط مُركّبٌ من اجزاء وهيئة اجتماعية۔[2]

شہر کو اس ربط کی وجہ سے جو اس کے افراد کے درمیان پایا جاتا ہے، شخص واحد تصور کرنا چاہیئے، جو مختلف اجزاء اور ایک ہیئت اجتماعیہ سے مرکّب ہے۔

ان کے نزدیک "ارتفاق" کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ ابتدائی اور ضروری، جو اہل بادیہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اجتماعی یا ترقی یافتہ، جو اہل مصر (شہریت وتمدن والوں کو) حاصل ہوتا ہے۔

ان دو کے بعد تیسری قسم آتی ہے، وہ سیاست وانتظام کی ہے، پھر اس کے نتیجہ میں چوتھی قسم خلافتِ عامہ کی ہے، ارتفاق رابع میں شاہ صاحب اہل اقالیم (ملک کے متفرق اور دور دراز علاقوں) کے باہمی ربط کی حفاظت پر زور دیتے ہیں، یہ ربط (مختلف علاقوں کے درمیان)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ۴۴ [2] ایضاً

اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ ایک شہر کے افراد کے درمیان ابتدائی اور محدود حالت میں ضروری تھا۔[1]

مکاسب اور وجوہ معاش کی محمود و مذموم شکلیں

ارتفاقات کے سلسلہ میں حصولِ مکاسب اور وجوہِ معاش بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ غیر طبعی اور غیر اخلاقی ذرائع معاش کا ذکر فراموش نہیں کرتے، فرماتے ہیں:۔

وبقيت نفوسٌ أعيت بهم	بہت سی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو
المذاهب الصالحة فالحدروا	جائز اور صحت مند راستوں سے
إلى أكساب ضارّة بالمدينة	کسبِ معیشت مشکل معلوم ہوتا ہے تو وہ
كالسرقة والقمار والتكدّي۔[2]	ایسے ذرائع معاش کی پستی کی طرف
	اتر آتی ہیں جو شہری و اجتماعی زندگی
	کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں، مثلاً
	چوری، جُوا، دریوزہ گری (بھیک مانگنا)
	اور غیر قانونی و اخلاقی طریقۂ مبادلہ۔

اس موضوعِ ارتفاقات کے باب میں شاہ صاحبؒ کے قلم سے بعض ایسے حقائق نکل گئے ہیں، جن سے تمدن و معاشرہ اور انسانیت کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

كلما رقّت النفوس وأمعنت	جب طبیعتوں میں غیر طبعی نزاکت،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۷ [2] ایضاً ص۴۳

فی حُبّ اللذّۃ الرفاھیۃ تفرّعت	حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی لذت پسندی
حواشی المکاسب واختصّ	اور غلو کی حد تک پہونچی ہوئی خوشحالی
کُلُّ رجل بکسب[۱] ۔	اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے تو
	کسبِ معیشت کی باریکیاں اور ذیلی
	قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہر شخص
	ایک خاص ذریعۂ معاش کا اجارہ دار
	بن جاتا ہے ۔

شاہ صاحب شہری زندگی کو نقصان پہونچانے والی چیزوں میں اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ سب اہل شہر ایک ہی ذریعۂ معاش اختیار کرلیں، مثلاً سب تجارت شروع کر دیں زراعت چھوڑ دیں، یا جنگ کے ذریعہ کسب معاش حاصل کریں، ان کے نزدیک زراعت بمنزلہ طعام کے ہے، اور صنعت و تجارت اور نظم و نسق بمنزلۂ نمک کے ہے، اسی سلسلہ میں شاہ صاحبؒ ایک بڑے نکتہ کی بات لکھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ملک کی تباہی کے اس زمانہ میں دو بڑے سبب ہیں ۔

۱۔ بیت المال پر بغیر کسی محنت کے بار بننا[۲] ۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۳ [۲] ان بار بننے والوں میں بطور مثال کے شاہ صاحبؒ نے ان سپاہیوں، عالموں، زہد پیشہ صوفیوں اور شعراء اور ان دوسرے گروہوں کو شامل کیا ہے، جو ملک میں سلطنت کی کسی خدمت کے بغیر جاگیروں کے مالک اور مفت کی کمائی اور انعامات و اکرامات کے عادی ہو جاتے ہیں، اس میں وہ نظام جاگیرداری بھی آ گیا جس نے سلطنت کے مالیہ کو سخت نقصان پہونچایا تھا اور مفت خوروں اور تن آسانوں کا ایک لشکر پیدا کر دیا تھا، اس سے شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت اور زوال سلطنت مغلیہ کے اسباب کے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

۲۔ اہل زراعت وتجارت اور اہل حرفہ واہل ہنر پر بھاری ٹیکس لگانا، آخر میں فرماتے ہیں:

فلینتبہ أھل الزمان لھذہ النکتۃ۔[1] — ہمارے زمانہ کے لوگوں کو اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے اور ہوشیار ہوجانا چاہئے۔

تمدن و معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والے اسباب میں شاہ صاحب تفریحات کی کثرت کو بھی شمار کرتے ہیں، جس سے معاش و معاد دونوں تغافل کا شکار ہوتے ہیں، ان میں شطرنج میں انہماک، شکار کی کثرت اور کبوتر پالنے کو شامل کرتے ہیں[2]، اسی طرح سے اخلاقی جرائم اور ایسے اعمال کو برداشت کرنا جن کو عام طور پر سلیم الفطرت لوگ اپنی ذات کے لئے برداشت نہیں کرسکتے ہیں، اوران کو تمدن کے لئے مضر سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے حکومتوں کا زوال ظہور میں آتا ہے[3]۔

سعادت اور اس کے اصول چہارگانہ

کتاب کا مبحثِ رابع مبحث السعادۃ ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ سعادت کا حصول انسان کے لئے سب سے اہم ہے، اور وہ تہذیب نفس اور قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کے تابع بنانے سے حاصل ہوتی ہے[4]۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک سعادت کے اصل اصول چار ہیں[5]، جن کے لئے انبیاء کی بعثت ہوئی اور ان کی تفصیل شرائع سماوی ہیں، یہ درحقیقت ادیان و شرائع کی بنیادی شعبوں کے جامع عنوانات اور مقاصد بعثت کی تکمیل کے موثر ذرائع ہیں۔

---

[1] ایضاً ص۴۵ [2] ایضاً ص۴۹ [3] ایضاً ص۵۰ [4] ملاحظہ ہو ص۵۱

۱۔ طہارت (جسمانی پاکیزگی جو انسان کو توجہ الی اللہ و تعلق باللہ کے لئے تیار کر دیتی ہے)

۲۔ اخبات الی اللہ تعالےٰ (انابت و توجہ الی اللہ اور عجز و تواضع)

۳۔ سماحت، مکارم اخلاق و معالی امور۔

۴۔ عدالت[1] (ایسا نفسانی ملکہ جس کے افعال کی وجہ سے شہر و قوم کا انتظام بسہولت قائم ہو جاتا ہے۔)

اس طرح شاہ صاحب نے انسان کی شخصیت کی تکمیل تعلق مع اللہ کی تحصیل اور ایک صحت مند اور متعاون معاشرہ کی تشکیل کی بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے، جو شریعت آسمانی اور بعثتِ انبیاء کے مقاصد میں ہے۔

اس کے بعد ان خِصال اربعہ کے اکتساب کا طریقہ بتایا ہے[2]، پھر ان حجابات کا ذکر کیا ہے، جو فطرت کے ظہور سے مانع ہیں، ان میں تین[3] قسموں کو لیا ہے، (۱) حجاب الطبع (بشری و نفسانی تقاضوں کا غلبہ) (۲) حجاب الرسم (خارجی حالات و ماحول کا مضر اثر) (۳) حجاب سوء المعرفۃ (غلط تعلیم و تربیت اور پھیلے ہوئے فاسد عقائد کا اثر)، پھر ان کے رفع کرنے کے طریقے بتائے ہیں[4]۔

عقائد و عبادات

کتاب کا اصل مضمون المبحث الخامس "مبحث البر والاثم" سے شروع ہوتا ہے، حقیقت میں کتاب کا یہی موضوع و مقصد ہے[5]۔

اصولِ بر میں شاہ صاحب نے سب سے پہلے توحید کو لیا ہے، اس لئے کہ اسی پر اخبات و انابت کا

---

[1] ان اصول کی تعریف ص۵۴ پر دیکھی جائے، [2] ص۵۵-۵۶ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص۵۶

[4] ص۵۷-۵۸ پر ان کی تشریح ملاحظہ کی جائے۔ [5] ص۵۸

انحصار ہے، جو سعادت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے توحید کے چار[۴] مراتب بیان کئے ہیں، اور مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت واضح کی ہے[۱]، توحید کے بعد صفات خداوندی پر ایمان، ایمان بالقدر اور شعائر اللہ کی تعظیم کے (جن میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآن، کعبہ، نبی اور صلوٰۃ سب سے واضح اور اہم شعائر ہیں) ذکر کے بعد شاہ صاحبؒ عبادات و فرائض پر آجاتے ہیں، اور وضو و غسل کے اسرار، اسرار الصلاۃ، اسرار الزکاۃ، اسرار الصوم اور اسرار الحج پر اجمالی طور پر بحث کرتے ہیں[۲]، یہ مباحث اگرچہ اصولی اور اجمالی ہیں، پھر بھی ان میں بعض ایسے نکتے آگئے ہیں، جن کا دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

مثلاً اسرار الصلاۃ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ عبادت کا یہ طریقہ اوضاع ثلاثہ، قیام رکوع، سجود کا جامع ہے، اس میں بجائے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف (قیام سے رکوع، رکوع سے سجود کی طرف) ترقی رکھی گئی ہے، اور یہی عقل و فطرت کے مطابق ہے، پھر شاہ صاحب نے عبادت کے سلسلہ میں اللہ کی عظمت میں تفکّر و مراقبہ اور دوامِ ذکر پر اقتصار نہ کرنے کی (جو اشراقیین، حکماء اور ہندوستانیوں کا طریقہ رہا ہے، اور بعض بے قید صوفیوں نے بھی اس کو اختیار کیا) وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تفکّر و مراقبہ انھیں لوگوں کے لئے ممکن و مفید تھا جن کی طبیعتیں ان سے مناسبت رکھتی تھیں، اور وہ ان کے ذریعہ سے ترقی کر سکتے تھے، نماز فکر و عمل، ذہنی توجہ اور جسمانی مشغولیت کا معجون مرکّب ہے، وہ ہر طبقہ کے لئے مفید اور تریاق قوی الاثر ہے، غوائل رسم (ماحول کے خراب اثرات) سے نفع دینے اور طبیعت کے عقل کے تابع ہونے کی مشق کے لئے نماز سے زیادہ کوئی مفید و مؤثر طریقہ نہیں[۳]۔

---

[۱] یہ بحث اس کتاب کے باب پنجم میں گذر چکی ہے۔ [۲] تفصیل کتاب کے حصۂ دوم میں آئی ہے جس میں احادیث کو سامنے رکھ کر ان پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ [۳] ص ۳۰

جہاں تک روزہ و حج کا تعلق ہے، ان کے بارہ میں اگرچہ اس مبحث میں بھی اشارے کئے گئے ہیں، لیکن کتاب کے حصۂ دوم میں ان کے مقاصد اور اسرار و حکمتوں پر جو لکھا گیا ہے، اس کی نظیر اس سے پہلے کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئی، اس کا ذکر آئندہ صفحات میں اپنی جگہ آئیگا۔

سیاسیاتِ ملّی اور انبیاء کی ضرورت

المبحث السادس کا عنوان "مبحث السّیاسات الملّیۃ" ہے، یہ کتاب کا بہت اہم مبحث ہے[1] اس کے پہلے باب میں شاہ صاحب نے بڑی نکتہ سنجی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بتایا ہے کہ انسانی نسلوں کو ہادیانِ طریق اور مقیمینِ ملل (انبیاء) کی ضرورت کیوں پیش آتی رہی ہے، اس کے لئے ان کی فطرت سلیم اور عقل عام کیوں کافی نہیں تھی؟ پھر اس گروہ کے صفات اور ضروری شرائط سے بحث کی ہے، اور یہ کہ وہ کب اور کس طرح اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتا اور اس میں کامیاب ہو سکتا ہے، یہ باب علم الکلام کی کتابوں میں اثباتِ نبوت کی عام بحثوں سے بالکل الگ نظر آتا ہے، اور اس میں عقلِ عام اور عقل سلیم کو مطمئن کرنے کا وہ سامان ہے جو علمِ کلام اور عقائد کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا، اس مبحث میں منصبِ نبوت اور اس کے خواص پر جو باب ہے، وہ شاہ صاحب کی روحِ شریعت اور حقیقت مزاج نبوت سے واقفیت نفسِ انسانی کے گہرے مطالعہ اور اخلاق کے اندرونی سرچشموں سے باخبری پر دلالت کرتا ہے، اس باب میں بعثت انبیاء کے اسباب سے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

---

[1] ص ۸۳-۸۴

بعثت مقرونہ

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ سب سے کامل بعثت اس نبی کی ہوتی ہے جس کی بعثت "مقرون" ہوتی ہے، یعنی اس کی بعثت کے ساتھ ایک پوری قوم تبلیغ و دعوت پر مامور اور اس کے فیضِ صحبت سے تیار ہو کر دوسرے انسانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، نبی کی بعثت بالاصالت ہوتی ہے (اور اس کو نبوت کہتے ہیں) امت کی ماموریت اور تفویض خدمت کی نوعیت بالواسطہ و بالنیابۃ ہوتی ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایسی ہی جامع بعثت تھی جس کے ساتھ ایک پوری امت کو آپ کے منصب نبوت کی خدمت و اشاعت کے لئے "جارحہ" اور آلہ کار بنایا گیا، اور اس کے لئے بعثت اور بعثت کے ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	جتنی امتیں پیدا ہوئیں تم ان میں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	سب سے بہتر ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو
عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۔۔ ۱۱۰)	کہتے ہو اور برُے کاموں سے منع کرتے ہو۔

اور حدیث میں بعثت ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین[1]۔	تم تیسیر (آسانی پیدا کرنے کے لئے) پیدا کئے گئے ہو تعسیر (مشکلات پیدا کرنے کے لئے) نہیں مبعوث کئے گئے ہو۔

اس باب کا خاص مضمون وہ ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور ان کے

---

[1] ص۸۴

مذاق و مزاج اور ان کے طریق دعوت اور طرز خطاب و تفہیم کو بیان کیا گیا ہے، اس سے شاہ صاحبؒ کی دقیق النظری اور خصائص نبوت اور انبیاء کے گہرے مطالعہ اور قرآن مجید کے عمیق تدبّر کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

ایرانی و رومی تمدن میں اخلاقی و ایمانی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی زبوں حالی

عہد جاہلیت اگرچہ عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، وہ ایک عالمگیر اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی و سیاسی بحران تھا جو ساری دنیا پر محیط تھا، لیکن ایرانی اور رومی اس کے قائد اور اصل ذمہ دار تھے کہ انھیں کا تمدن اس وقت دنیا میں معیاری سمجھا جاتا تھا، اور اسی کی تقلید ہر جگہ کی جاتی تھی، اور انھیں کے ممالک مرکزی شہر اور معاشرہ سب سے زیادہ اس کی زد میں تھا۔

اس صورت حال کا جو نقشہ شاہ صاحب نے کھینچا ہے، اور اس کے جو اسباب بیان کئے ہیں، اس سے بہتر نقشہ سیرت و تاریخ کی کسی کتاب میں جو دور ماضی میں لکھی گئی اور فلسفۂ تاریخ اور علوم عمرانیہ کے کسی فاضل کے قلم سے دیکھنے میں نہیں آیا، یہاں پر آکر شاہ صاحب کا قلم اپنے پورے جوہر دکھاتا ہے، اور ان کی قوتِ تحریر اور حُسنِ انشا اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔[2]

یہ مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی تاریخ پر گہری نظر، حقیقت تک پہونچنے کی صلاحیت، اور صورت حال کے صحیح تجزیہ کی خداداد قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] ص ۸۶ [2] یہ حصہ سلاست، زور بیان، حسن انشاء کا ایک نمونہ ہے، اسی بناء پر مصنف نے اس کو عربی ادب کے منتخبات کے مجموعہ "مختارات" میں ایک نمونہ کے طور پر شامل کیا ہے۔

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامانِ راحت میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کرلی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے صنّاع، اہلِ ہنر اور اہلِ کمال جمع ہوگئے تھے، جو اس سامان آرائش وراحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہوجاتا تھا، اور اس میں برابر اضافے اور جدّتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہوگیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمّام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رُو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلّفات اور لباس وپوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کرسکتے ہو۔[1]

یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزء بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہوگیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا، یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص
اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا، ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ
زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا، اور اس کے
سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔

بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے،
اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں
پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، اگر
وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو
سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح
بنا لیتے، جن سے آبپاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا، اور صرف خدمت
کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا ہے، اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت
چھٹی نہیں ملتی۔

اس پُر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ
اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقعہ اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک
میں ایک فردِ بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔"[1]

بعض دوسری مفید بحثیں

اس کے بعد یہ بحث آتی ہے کہ دین کی اصل ایک ہے اور شرائع مناہج میں کسی خاص

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷

عصر و قوم کی رعایت سے اختلاف ہوتا ہے، پھر اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ دین کی ایک اصل ہونے کے باوجود ان مناہج پر مؤاخذہ کیوں ہوتا ہے؟

تیسیر، ترغیب و ترہیب کے اسرار وغیرہ کی ذیلی بحثوں کے بعد شاہ صاحب ایسے دین کی ضرورت ثابت فرماتے ہیں، جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، اور یہ کہ دین کو تحریف سے کیسے بچایا جا سکتا ہے، تحریف کن کن دروازوں، اور ناکوں سے دین میں داخل ہوتی ہے، وہ کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور کیسے کیسے قالب اختیار کرتی ہے؟ اور شریعت نے اس کے سدِّ باب کے لئے کیا راستے اختیار کئے ہیں، اور کیا انتظامات کئے ہیں؟ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ عہد بعثت میں عہد جاہلیت کا کیا حال تھا جس کی آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اصلاح فرمائی۔؟

حدیث و سنّت کا مقام اور ان کے بارہ میں امت کا طرز عمل

مبحث سابع کا عنوان ہے "مبحث الشرائع من حدیث النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم" یہاں پر وہ مباحث آتے ہیں، جن کا براہ راست حدیث و سنت کے فہم، اس سے استنباط مسائل، علوم نبوی کے اقسام، نبی سے شریعت کے اخذ کی کیفیات اور طریقوں، کتب حدیث کے طبقات، کتاب و سنت سے شرعی مطالب کے اخذ کے طریقوں اور مختلف احادیث میں جمع و تطبیق یا ترجیح سے تعلق ہے، اس سلسلہ میں غایت نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فروع میں صحابہؓ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب بیان کرتے ہیں، ان کی مثالیں دینے کے بعد فقہاء کے مذاہب میں اختلاف اور اہل حدیث و اصحاب الرائے کے اختلاف کے فرق کو بیان کرتے ہیں، چوتھی صدی سے پہلے

اور اس کے بعد لوگوں کے مسائل دریافت کرنے اور ان پر عمل کرنے اور اس بارے میں عوام و خواص کا رویہ اور طرز کیا تھا؟ اس کی تفصیل سے وضاحت فرماتے ہیں جو بڑی دقیق و عمیق بحثوں پر مشتمل ہے اور جن کا علم کلام یا اصول فقہ کی کسی کتاب میں ملنا بہت مشکل ہے۔

فرائض و ارکان کے اسرار و حِکَم

شاہ صاحب نے عقائد سے لے کر عبادات، معاملات، احسان و تزکیہ، مقامات، و احوال، کسب معیشت کے طرق، تبرع و تعاون، تدبیر منزل، خلافت، قضا، جہاد، آداب طعام، آداب صحبت، معاشرت اور آخر میں فتن، حوادث ما بعد اور علامات قیامت تک کی احادیث سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں سیرت نبوی کا خلاصہ بھی پیش کر دیا ہے، اور ان مختلف ابواب کے اسرار و مقاصد اس طرح بیان فرمائے ہیں کہ ان مسائل کا ربط زندگی، تمدن اور اخلاقیات سے کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا، اور حقیقت میں کتاب کا یہی مرکزی مضمون ہے، شاہ صاحب کا منشا تھا کہ حدیث کی تدریس انھیں حِکَم و اسرار کی روشنی میں عمل و اخلاق، تمدن و معاشرت، انسانی سعادت اور باہمی روابط کے تعلق کے ساتھ ہو تاکہ ان کا زندگی، عمل و اخلاق، تمدن و معاشرت پر پورا اثر پڑے، عقل و نقل کا تطابق ثابت ہو اور معترضین کو ان پر اعتراض کرنے اور حدیث و سنت کی قیمت و افادیت اور ان کی اہمیت و ضرورت کو کم کرنے (جس کو شاہ صاحبؒ کی دور بین اور حقیقت رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا) اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے، عملی ارکان اور فرائض چہارگانہ پر شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انھیں کا حصہ اور "حجۃ اللہ" کے خصائص میں سے ہے، یہاں بطور نمونہ کے صرف روزہ (صیام) اور حج کے مقاصد و اسرار اور ان کی اسلامی و شرعی شکل کی حکمت پر

شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

صوم پر کلام کرتے ہوئے اور اس کی مقدار اور روزوں کی تعداد کے تعیّن کی حکمت (جو شریعت اسلامی کے ساتھ مخصوص ہے) اور اس کے شرعی احکام پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"روزہ میں (وقت اور تعداد و مقدار کا) اختیار دے دینے سے تاویل اور فرار کا دروازہ کھل جائیگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اسلام کی یہ سب سے بڑی اطاعت غفلت کا شکار ہو جائیگی"[1]

اس کے بعد اس کی مقدار و تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی (مدت کی) تعیین بھی ضروری تھی تاکہ اس میں افراط و تفریط کا موقعہ نہ ہو، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی اس پر اتنا عمل کرتا کہ جس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچتا اور کوئی اثر مرتّب نہ ہوتا، اور کوئی اتنے غلو سے کام لیتا اور اتنی کثرت کرتا کہ اس کی ناطاقتی اور کمزوری حد کو پہونچ جاتی، اور وہ نیم مردہ ہو کر رہ جاتا، اصل میں روزہ تریاق ہے جو نفس کے زہر کو مارنے کے لئے مہیا کیا جاتا ہے اس لئے اس میں ضرورت کی رعایت ضروری ہے"[2]

پھر روزہ کی دونوں قسموں (یعنی ایک وہ روزہ جس میں کھانے پینے اور ان تمام چیزوں سے جو روزہ کے منافی ہیں، مکمل پرہیز کیا جاتا ہے اور دوسرے وہ روزہ جس میں بعض چیزوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور بعض سے نہیں) کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اوّل الذکر کو ترجیح دیتے ہیں اور تجربہ، تحلیل علمی اور علم النفس کی روشنی میں اس کی افضلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً

"تقلیلِ غذا کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ خوراک کی مقدار کو کم کر دیا جائے، دوسرا یہ کہ کھانوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل کر دیا جائے کہ یہ مقصد پورا ہو سکے، شریعت میں یہی آخر الذکر صورت اختیار کی گئی ہے، اس لئے کہ اس سے بھوک اور پیاس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، حیوانی خواہشات پر چوٹ پڑتی ہے اور محسوس طور پر نظر آتا ہے کہ اس میں کمی آئی ہے، اس کے برخلاف اول الذکر صورت میں ... اس کے کہ آدمی پر کوئی خاص اثر مترتب ہو، غذا کے تسلسل کی وجہ سے یہ بات پیدا نہیں ہو پاتی، دوسرے یہ کہ اول الذکر کے لئے کوئی عمومی قانون بنانا بہت مشکل بات ہے، اس لئے کہ لوگ مختلف حالات رکھتے ہیں، ایک آدمی ایک پاؤ کھاتا ہے، دوسرا آدھ سیر کھاتا ہے، چنانچہ اس قسم کے تعین سے اگر ایک کا بھلا ہوگا تو دوسرے کا نقصان بھی ہوگا۔"[1]

وہ کہتے ہیں کہ اس تعین اور اوقات کی پابندی میں اعتدال ضروری ہے، لکھتے ہیں:-

"یہ بھی ضروری تھا کہ یہ مدت تکلیف مالا یطاق میں مبتلا کرنے والی نہ ہو، مثلاً تین دن تین راتیں، اس لئے کہ یہ شریعت کے موضوع سے خارج اور اس کے مقصد کے خلاف ہے، اور عام طور پر اس پر عمل بھی ناممکن ہے۔"[2]

حج کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل منفرد اور یگانہ بحث ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

"(حج کے مقاصد میں) اس میراث کی حفاظت بھی ہے، جو سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسمٰعیلؑ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے، اس لئے کہ یہ دونوں ملتِ حنیفی کے امام اور عرب میں اس کے مؤسس اور بانی کہے جا سکتے ہیں، حضور صلے اللہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۱

علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بھی اسی لئے ہوئی تھی کہ ملت حنیفی آپ کے ذریعہ دنیا میں غالب آئے، اور اس کا پرچم بلند ہو۔

اللہ تعالے کا ارشاد ہے "مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِيْمَ"[1] (ملت ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کی) اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس ملت کے امام سے جو چیزیں ہم کو ورثہ میں ملی ہیں مثلاً خصائلِ فطرت[2]، اور مناسک حج، اس کی ہم حفاظت کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قفوا على مشاعركم فانكم على	اپنے مشاعر (مقامات حج) پر ٹھہرو
إرث من إرث أبيكم۔	اس لئے کہ تم اپنے باپ کی ایک وراثت کے وارث ہو۔[3]

نیز اس کی ایک دوسری حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جس طرح حکومت کو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ایک عام جائزہ اور معائنہ کی ضرورت ہوتی ہے، تا کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ کون وفادار ہے، کون باغی، کون فرض شناس ہے کون کام چور؟ نیز اس کے ذریعہ اس کی ایمانداری کی شہرت ہو اور اس کا نام اونچا رہے، اس کے کارندے اور باشندے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں، اسی طرح ملت کو حج کی ضرورت ہے، تاکہ منافق و غیر منافق

---

[1] سورہ حج - ۷۸ [2] ان خصائلِ فطرت سے مراد یہ دس چیزیں ہیں، مونچھیں ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، پانی سے ناک صاف کرنا، ناخن کاٹنا، انگلی کے پوروں کا دھونا، بغل کے بال اکھاڑنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرنا، ابوداؤد بروایت حضرت عائشہؓ (دسویں چیز کے بارے میں راوی کہتے ہیں، میں بھول گیا شاید وہ کُلّی ہے لیکن قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ نے دسویں چیز ختنہ بتائی ہے) [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صلا

میں تمیز ہو سکے، اللہ تعالیٰ کے دین میں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں جوق جوق جماعتیں حاضر ہوں، لوگ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں اور ہر شخص اس چیز میں جو اس کے پاس نہیں ہے دوسرے سے استفادہ کرے، اس لئے کہ بہترین و مرغوب اشیاء بالعموم صحبت ورفاقت سے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔"[1]

نیز وہ فرماتے ہیں:۔

"حج چونکہ ایک ایسا موقعہ ہے جس میں سبھی جمع ہوتے ہیں، اس لئے وہ غلط قسم کے رسوم[2] سے حفاظت کے لئے بہت مفید ہے، ملت کے اپنے اماموں اور پیشواؤں کے حالات یاد کرنے اور ان کی اتباع کا جذبہ دل میں پیدا کرنے کے لئے کوئی چیز اس درجہ کی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔"[3]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"(حج کے) مقاصد میں وہ بات بھی ہے جس کے لئے حکومتیں نمائش یا سرکاری جشن کیا کرتی ہیں، جس کو دیکھنے کے لئے قریب و دور ہر جگہ کے آدمی جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اپنی حکومت اور اپنی ملت کی تعلیمات سے آشنا ہوتے ہیں، اور اس کے مقدس مقامات کی تعظیم بجالاتے ہیں، اسی طرح حج مسلمانوں کی نمائش یا سرکاری جشن ہے جس میں ان کی شوکت ظاہر ہوتی ہے، ان کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں، ان کی ملت کا نام روشن ہوتا ہے۔"

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۵۹-۶۰ [2] اس میں دینی تحریف، بدعات، اور مقامی اضافے اور جدتیں سب شامل ہیں۔ [3] ایضاً ص ۵۹-۶۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا[1] — اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لئے ایک مقامِ رجوع اور مقامِ امن مقرر کیا۔[2]

کتاب کی جامعیت

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فقہ، حدیث، عقائد، عبادات و معاملات سے تعلق رکھنے والے ابواب و مباحث کے ماسوا اس میں تدبیر منزل، خلافت و قضا، ابوابِ معیشت اور آدابِ صحبت کے مباحث بھی ہیں، جو اخلاق و معاشرت اور تمدن و معیشت سے تعلق رکھتے ہیں، اور عام طور پر کسی فقہی یا کلامی کتاب میں ان کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

احسان و تزکیۂ نفس

پھر اس پر مستزاد شاہ صاحب نے اس میں حدیث و سیرت کی روشنی میں احسان و تزکیہ کا ایسا نظام مرتب کر کے پیش کر دیا ہے جس پر چل کر انسان قربِ خداوندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج، مراتب ولایت اور مقامات و احوال تک پہونچ سکتا ہے، احسان کا یہ باب کتاب کے ص۶۶ سے ص۱۰۱ تک پھیلا ہوا ہے، اس باب میں شاہ صاحب نے انھیں وسائل سے بحث کی ہے جو احادیث صحیحہ میں آئے ہیں، صرف ان میں استحضار، عزم و نیت اور کیفیات باطنی اور قالب کے ساتھ روح کی طرف توجہ کرنے پر زور دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ان عوارض

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۱۲۵ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۴۲

وامراض کا جو پیش آتے رہتے ہیں، علاج انھیں طُرقِ مشروعہ اور انھیں فرائض وعبادات واذکار سے تجویز کیا ہے، اس کے ساتھ اخلاق رذیلہ کے علاج اور اخلاق فاضلہ کے حصول کا طریقہ بھی شریعت وسنت کے منصوص طریقوں سے بتایا ہے۔

اس مبحث میں اذکار ماثورہ، ادعیہ مشروعہ، اور استغفار کے اہم صیغے بھی جمع کر دیئے ہیں، اور مؤثر اور مقبول دعا کا طریقہ اور اس کے شرائط بھی بتائے ہیں، اس سلسلہ میں طبعی تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں اور دینی اعمال کو نیت کے استحضار کے ساتھ ادا کرنے پر زور دیا ہے، اور ان کے اثر وکیفیت کے جُدا ہونے کو واضح کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

اعلم ان النیّۃ روح والعبادۃ جسد، ولاحیاۃ للجسد بدون الروح، والروح لھا حیاۃ بعد مفارقۃ البدن، ولکن لایظھر اٰثار الحیاۃ کاملۃ بدونہ	یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ نیت روح ہے، اور عبادت جسد، جسد کی حیات روح کے بغیر ممکن نہیں، روح بدن کی مفارقت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے، لیکن آثار حیات کا کامل طور پر بدن کے بغیر ظہور نہیں ہوتا۔
ولذلک قال اللہ تعالیٰ "لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَادِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ" (الحج۔۳۷)	اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تک ان قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہونچیں گے، وہاں پہونچنے والی چیز تمہارا تقویٰ ہے۔
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ"	اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔

پھر نیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

واعني بالنية المعنى الباعث على	نیت سے ہماری مراد تصدیق کی وہ
العمل من التصديق بما أخبر به	ذہنی کیفیت ہے جو اس عمل پر آمادہ
الله على ألسنة الرسل من ثواب	کرے، تصدیق اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ
المطيع وعقاب العاصي أوحب	نے اپنے انبیاء کے ذریعہ اطاعت
امتثال حكم الله فيما أمر ونهى۔[1]	کرنے والے کو ثواب اور نافرمانی
	کرنے والے کو سزا کا جو وعدہ کیا ہے
	وہ اس حکم کی تعمیل اور اس معصیت
	سے احتراز کا سبب ہے۔

اس باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اخلاق فاضلہ کے حصول، حقوق العباد کی ادائیگی اور حسن معاشرت کے سلسلہ میں کچھ حدیثوں کا انتخاب فرما کر نقل کر دیا ہے، جن پر عمل کرنے سے انسان احسان و تزکیہ کے اعلیٰ درجہ پر پہونچ سکتا ہے، پھر ان مقامات و احوال کا ذکر کیا ہے جو احسان و تزکیہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں، اور نور باطنی، قلب کی بیداری اور نفس کی صفائی، رضائے خداوندی اور ملأ اعلیٰ کی تائید و مسرت کا نتیجہ ہیں۔

جہاد

اس کتاب میں جہاد پر بھی پورا ایک باب ہے[2]، اور اس کو شاہ صاحب نے ان فکر انگیز اور چونکا دینے والے الفاظ سے شروع کیا ہے، جو ادیان و ملل کی پوری تاریخ، مقاصد خلق انسانی

---

[1] ایضاً جلد دوم ص ۸۳-۸۴   [2] ایضاً ص ۱۷۰-۱۷۸

اور خالق کائنات کے نظام مطلوب پر گہری نظر رکھنے والا عارف ہی لکھ سکتا ہے:۔

اعلم ان أتم الشرائع وأكمل	یاد رکھو کہ مکمل ترین شریعت اور
النواميس هو الشرع الذى	کامل ترین قانون وہ شریعت ہے'
يؤمر فيه بالجهاد۔[1]	جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔

اس کے بعد اس کی تشریح کی ہے' اس کو عقلاً نقلاً ثابت کیا ہے' پھر فضائل جہاد کے اصول واسباب بیان کئے ہیں۔[2]

غرض یہ کتاب اپنی جامعیت، عمق، دین وشریعت کی وسیع لیکن مربوط ترجمانی اور ان صدہا بیش قیمت نکات وتحقیقات کی بناء پر جو کتاب کے صفحات پر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں' اسلامی کتاب خانہ میں متعدد حیثیتوں سے بالکل ایک انفرادی شان رکھتی ہے، اور اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "كم ترك الأول للآخر" مولانا شبلیؒ نے اپنی مشہور کتاب علم الکلام میں صحیح لکھا ہے:۔

"ابن تیمیہؒ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزّل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل ودماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا، کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزّالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"شاہ صاحبؒ نے علم الکلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بناء پر

---

[1] ایضاً ص ۱۷۰ [2] ایضاً

ان کو متکلمین کے زمرہ میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کئے ہیں، درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے[1]۔"

فاضل عصر مولانا عبدالحق صاحب حقّانی (صاحب تفسیر حقانی، وعقائدالاسلام) حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"جس فن میں یہ کتاب ہے، آپ سے پہلے کسی نے اس کو ایک جگہ جمع نہ کیا تھا، اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی "من حیث المصلحۃ المفیدۃ" ہے، اور غایت اس کی یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام میں نہ کچھ تنگی ہے، نہ وہ خلاف فطرت سلیمہ ہیں، تاکہ ان پر انسان کو پورا وثوق ہو جائے اور ان کو فطرت پر مبنی باتیں سمجھ کر دل ان کی طرف کھنچ آئے اور کسی متشکک کے بہکانے سے دل میں شبہ نہ پڑ جائے اور حد اس کی یہ ہے کہ وہ علم جس میں قوانین دینیہ اور احکام شرعیہ کی حکمت معلوم ہوتی ہے، اور مبادی اس کے تمام علوم ہیں[2]۔"

---

[1] علم الکلام ص ۱۰۹-۱۱۱ [2] مقدمہ نعمۃ اللہ السابغہ۔

باب ہشتم

نظامِ خلافت کی ضرورت و افادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت، اور ان کے احسانات

کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے آئینہ میں

کتاب "ازالۃ الخفا" کی اہمیت و انفرادیت

"ازالۃ الخفا" شاہ صاحبؒ کی (حجۃ اللہ البالغہ کے بعد) دوسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے، اور اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر اپنے موضوع پر منفرد اور یگانہ کتاب ہے، پوری کتاب وجد آفریں اور ولولہ انگیز علمی اور ذوقی نکات سے لبریز ہے، خاص طور پر شاہ صاحبؒ کے قرآن مجید میں طویل تدبّر، وہبی مناسبت، اس کے دقیق و عمیق فہم، آیات کے اشارات و مضمرات کی طرف انتقالِ ذہنی، اور دقّتِ استنباط اور وفورِ ذکاوت کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ ایک انصاف پسند اور سلیم الطبع انسان خود بخود اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ یہ علم محض کتابی اور اکتسابی نہیں ہے، اس کتاب کا مصنف اپنے زمانہ کے مروّجہ نصاب درس، کتب تفسیر، اصول فقہ و علم کلام کا ساختہ پرداختہ اور ان کا خوشہ چین اور زلّہ ربا نہیں ہے، اس علم کا تعلق موہبتِ خداوندی اور افاضۂ ربّانی سے ہے، خود شاہ صاحبؒ کے قلم سے بے اختیار کتاب کے آغاز ہی میں یہ الفاظ نکل گئے ہیں:۔

لاجرم نورِ توفیق الٰہی در دل ایں   واقعہ یہ ہے کہ توفیق الٰہی کے نور نے

بندۂ ضعیف علمے را مشروح و مبسوط گردانید، تا آنکہ بعلم الیقین دانستہ شد کہ اثبات خلافت ایں بزرگوار اں اصلیست از اصول دین تا وقتیکہ ایں اصل را محکم نہ گیرند، ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نہ شود۔[1]

اس بندۂ ضعیف کے دل میں (ایک مستقل علم کو) اس شرح و بسط کے ساتھ القا کیا کہ اس کو علم الیقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ ان حضرات (خلفائے راشدین) کی خلافت کا اثبات اصول دین میں سے ایک اصل عظیم ہے، جب تک اس اصل کو پوری مضبوطی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جائیگا، شریعت کے مسائل میں سے کسی مسئلہ کو استحکام حاصل نہیں ہوگا۔

اُن صاحبِ کمال علماء کی بھی جو بہت سے مسائل میں شاہ صاحبؒ سے اختلاف رکھتے تھے، اور جن کو علوم عقلیہ میں توغّل، بلکہ درجۂ امامت حاصل تھا، جب اس کتاب پر نظر پڑی تو وہ مصنف کے تبحّر علمی اور ژرف نگاہی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے، مولانا محسن بن یحییٰ ترہتی صاحبؒ "الیانع الجنی" کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد مولانا فضل حق خیر آبادی (م ۱۲۷۸ھ) کو دیکھا کہ جو وقت خالی ہوتا تھا اس میں کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک و مستغرق ہیں، ہم لوگ خلاف معمول ان کے اس استغراق کو دیکھ کر متعجب ہوئے، اور تجسّس پیدا ہوا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ اور کس کی تصنیف ہے؟ انھوں نے خود ہی فرمایا کہ "اس کتاب کا مصنف ایسا بحر زخّار ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں" معلوم ہوا کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" ہے جس کا ایک نسخہ

---

[1] ازالۃ الخفا (مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور) ص۱

مولانا کے ہاتھ آگیا ہے"۔[1]

فخر المتاخرین ابوالحسنات مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) جن کا تبحرِ علمی نادرۂ روزگار جامعیت اور وسعتِ نظر مشہور و مسلّم ہے، اپنی مشہور کتاب "التعلیق الممجّد علی مؤطّا الامام محمد" میں "ازالۃ الخفا" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کتاب عدیم النظیر فی بابہ"[2] (کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔)

"حجۃ اللہ" اور "ازالۃ الخفا" کا باہمی تعلق

حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کے بعد جس میں اسلام کا جامع و مربوط نظام اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ زندگی اور معاشرہ و تمدن سے اس کا ربط و تعلق ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کے پیش کئے ہوئے عقائد و عبادات اور اجتماعی زندگی کے احکام پر عمل کئے بغیر کسی صحت مند معاشرہ، صالح تمدن اور معتدل و متوازن اجتماعیت کے وجود کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس مقصد کی توضیح و تکمیل اور اس مرحلہ کو عالمانہ و محققانہ شان کے ساتھ (جس میں قریبی زمانہ میں آنے والے دور انقلاب کی عقلیت پسند طبیعتوں اور دماغوں کی تسکین و تشفی کا سامان تھا) اس کی ضرورت تھی کہ خود اسلام کے نظامِ اجتماعی کے مزاج و خصوصیات اور مقاصد و دائرۂ عمل پر، نیز اس کے عالمگیر و دائمی، اور صریح و منصوص ادارۂ "خلافت" پر اسی شرح و بسط، نقل و عقل کی مدد، تاریخ کی شہادت؛ اور سب سے بڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں قلم اٹھایا جائے، نیز ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا

---

[1] "الیانع الجنی" ص۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحاوی، و نزہۃ الخواطر ج ۶ ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

[2] التعلیق الممجّد مطبع یوسفی ص۲۵

پردہ چاک کیا جائے، جو اس سلسلہ میں زمانۂ قدیم سے رونما ہوئی ہیں، اور ان کی بنیاد پر ایک بڑے فرقہ کا وجود عمل میں آیا ہے، جس نے خاص طور پر شاہ صاحب کے دور میں ایرانی عنصر کے غلبہ کی بناء پر ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، جس کا اثر عقائد و اعمال کے حدود سے آگے بڑھ کر نظامِ حکومت اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ پر بھی پڑا تھا، اور اس نے اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا تھا۔

اس کی حیثیت (ان لوگوں کی نظر میں جو اس مذہب کی تاریخ اس کے بنیادی عقائد اور اس کے دین کے تصور و فہم سے واقف تھے، اور جنھوں نے براہ راست اس کی مستند کتابوں اور اصلی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا) محض ایک اجتہادی اختلاف یا دائرۂ شریعت کے اندر ایک ذیلی فرقہ کی نہیں تھی، بلکہ وہ اس فہم دین کے متوازی جس کی بنیاد کتاب و سنت، منصبِ نبوت کی عظمت اور ختم نبوت کے عقیدہ پر تھی ایک مستقل فکر اور دینی تصور تھا، اس کا کسی قدر اندازہ فرقہ اثنا عشریہ کے عقیدۂ امامت سے ہو سکتا ہے، جس کے نزدیک امامت نبوت کے ہم پلّہ ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بھی فائق ہے۔[1]

---

[1] حال میں انقلاب ایران کے قائد روح اللہ خمینی صاحب جو "آیت اللہ العظمیٰ الامام الخمینی" کے نام سے مشہور ہیں، کی کتاب "الحکومۃ الإسلامیۃ" مطالعہ میں آئی، اس میں ص۵۲ پر "الولایۃ التکوینیۃ" کے عنوان سے یہ لکھنے کے بعد کہ ائمہ کو خلافت تکوینی حاصل ہوتی ہے، اور اس عالم کے تمام ذرات ان کی حکومت و اقتدار کے تابع اور فرماں بردار ہوتے ہیں، حسب ذیل عبارت آئی ہے:-

وإنّ من ضروریات مذہبنا أن لأئمتنا مقاماً لا یبلغہ ملک مقرب ولا نبیّ مرسل، وبموجب ما لدینا من الروایات والأحادیث فإن الرسول الأعظم (ص) والأئمۃ (ع) کانوا قبل ہذا العالم أنواراً فجعلہم اللہ بعرشہ محدقین، وجعل لہم من المنزلۃ والزلفیٰ ما لا یعلمہ إلا اللہ۔ (الحکومۃ الإسلامیۃ۔ کتابخانۂ بزرگ اسلامی۔ ایران)	ہمارے دین کے قطعی الثبوت مسائل میں سے یہ ہے کہ ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے جس کو نہ کوئی مقرب فرشتہ پہونچ سکتا ہے، نہ نبی جس کی بعثت ہوئی، اور ہماری روایات اور احادیث کے بموجب رسول اعظم (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ (علیہم السلام) اس عالم سے پہلے انوار (روشنیاں) تھے، اللہ نے ان کو اپنے عرش کا احاطہ کرنے والا بنا دیا اور ان کو ایسا مرتبہ اور قرب عطا فرمایا جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تالیف کی اولین غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

می گوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ دریں زمان بدعت تشیّع آشکار شد ونفوس عوام بشبہات ایشان متشرب گشت، واکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافتِ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند۔[1]	فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ اس زمانہ میں تشیّع کی بدعت کا شیوع ہوا، عوام کی طبیعتیں ان کے پیدا کئے ہوئے شبہات سے گہرے طریقہ پر متاثر ہوئیں، اس علاقہ کے اکثر باشندوں کے دل میں خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ثبوت خلافت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک واعتراضات پیدا ہو گئے۔

شاہ صاحبؒ کی نظر اس تشکیکی فتنہ کی ظاہری سطح ہی پر نہیں تھی، اس کی تہہ میں جو گہری سازش کام کر رہی تھی، اور اس کے جو دور رس نتائج ظاہر ہونے والے تھے، (مثلاً اسلام کا اپنے اولین وبہترین دور میں ناکام ثابت ہونا اور صحبت وتربیت نبوی کی بے اثری صحابۂ کرام کے ذریعہ خیر القرون میں قرآن کی حفاظت، سنّت کی اشاعت اور جن امور پر اتفاق ہوا اس سب پر بے اعتمادی) ان کو بھی دیکھ رہی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ہر کہ در شکستن ایں اصل سعی می کند بحقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ	جو شخص بھی خلافت راشدہ کی صحت کے اصول کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے

[1] ازالۃ الخفا ص۱

می خواہد[1]۔ اور دین کے اس اصل کا انکار کرتا
ہے، وہ حقیقت میں تمام فنون دینیہ
کو منہدم کر دینا چاہتا ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"خلفائے راشدین آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے
درمیان قرآن مجید کے اخذ و تلقی میں واسطہ ہیں[2]۔"

اس کے بعد وہ اس دائرہ میں ان علوم اور شعبوں کو بھی شامل کرتے ہیں جن کی دولت خلفائے راشدین ہی کے ذریعہ امت کو حاصل ہوئی، مثلاً علم حدیث، علم فقہ اور اس سے بڑھ کر مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک خاص شکل پر اجماع کا انعقاد اور اختلاف امت کا خاتمہ نیز علم احسان (جس کا نام بعد کے زمانہ میں علم سلوک پڑ گیا) اس کے بعد مراتب علم حکمت، اخلاق فاضلہ اور اخلاق رذیلہ کی وضاحت اور ان کا فرق، تدبیر منزل اور سیاست مدن شاہ صاحب کے نزدیک یہ سب علوم و کمالات امت کو خلفائے راشدین ہی کی تعلیم اور طریق عمل سے حاصل ہوئے، اور امت اس بارے میں ان کی رہین منت ہے[3]۔

اس لئے یہ عین مناسب تھا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے بعد جو گویا اسلام کی علمی و نظری تفہیم و تشریح ہے یہ دکھایا جائے کہ واقعات کی دنیا میں نبوت کے بعد کے متصل دور میں کس طرح کامیابی کے ساتھ ان اصول و تعلیمات کو عملی شکل دی گئی، زندگی پر کس خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا انطباق ہوا، معاشرۂ انسانی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، دو قدیم باجبروت اور صاحب اقتدار تمدن (جنھوں نے متمدن دنیا آپس میں تقسیم کر رکھی تھی اور جن کی

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۱ [2] ایضاً ص ۲ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۲

تاریخ صدیوں کی پرانی تھی) جن سلطنتوں (دولت ساسانیہ اور دولت روما) کے سایہ میں اوران کی رہنمائی اور سرپرستی میں پھل پھول رہے تھے، اور حیات انسانی پر اثر انداز ہو رہے تھے، وہ کس طرح نیست و نابود ہوئیں[1]۔

چند قدیم تصنیفات

اسلام کے نظام اجتماعی، سلطنت اور اس کے دائرۂ عمل پر (مرتبہ اور کیفیت سے قطع نظر تعداد و کمیّت کے لحاظ سے بھی) ہمیں قدیم ذخیرۂ کتب میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں، اس موضوع پر امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ھ-۱۸۲ھ) جو امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید اور خلافت عباسیہ کے قاضی القضاۃ تھے، کی "کتاب الخراج" بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کا دائرۂ بحث سلطنت اسلامیہ کے ذرائع آمدنی، مالیات اور نظام محاصل تک محدود ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابل ذکر کتاب قاضی القضاۃ علامہ ابوالحسن علی ابن محمد بن حبیب الماوردی (۳۶۴ھ-۴۵۰ھ) کی تالیف "الأحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ" ہے، یہ متوسط سائز کے ۲۵۹ صفحات میں آئی ہے، اس کا مرکزی موضوع امامت اور اس کا حکم شرعی، شرائط، کیفیتِ انعقاد، اس کے تفویض کئے ہوئے مناصب اور امام کے فرائض و واجبات، قضاۃ کے تقرر کے احکام، امامت، ولایت صدقات، اور جزیہ و خراج وغیرہ کے احکام ہیں، اور حدود، نیز احتساب وغیرہ کا بیان ہے، خلافتِ راشدہ کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ازالۃ الخفا" عنوان "برہم شدنِ دولت ساسانیہ ص ۵۴/۲ - ص ۵۹/۲ و عنوان "برہم شدن دولت رومیہ" ص ۵۹/۲ - ص ۶۳/۲

صحت وثبوت، اور خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب اور کارناموں سے کوئی بحث نہیں۔

اس موضوع پر سب سے بڑی کتاب "الغیاثی" ہے، اس کا پورا نام "غیاث الامم فی التیاث الظلم" ہے کتاب کے مصنف امام غزالیؒ کے نامور استاد اور اپنے زمانہ کے استاذ الاساتذہ امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک الجوینی، (۴۱۹ھ ۔ ۴۷۸ھ)[1] ہیں، یہ کتاب اصلاً دولت سلجوقیہ کے نامور وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی (۴۰۸ھ ۔ ۴۸۵ھ) (بانی مدرسہ نظامیہ بغداد و نیشاپور) کے مشورہ و ملاحظہ کے لئے تصنیف کی گئی ہے، جو ضابطہ سے ملک الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اور مدار المہام سلطنت تھے، لیکن حقیقتاً اس عظیم سلطنت بلکہ شہنشاہی کے کرتا دھرتا تھے[2]، کتاب درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات اور فرائض پر ہے، قسم اول میں ائمہ، ولاۃ رعیت اور قضاۃ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں کوئی امام نہ ہو تو کیا کرنا چاہئے، نیز مفتیوں و والیوں کے اوصاف و فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان کی غیر موجودگی میں امت کے فرائض کیا ہو جاتے ہیں، اگر منصب امامت پر کوئی نااہل بزور شمشیر مسلط ہو جائے، تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اگر زمانہ مفتیوں سے خالی ہو تو امت کا کیا فرض ہے؟ خلع امام کے کیا اسباب ہیں؟ پھر تفصیل سے وہ فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں جو مفتیوں کے نہ ہونے کی صورت میں امت کو جاننے چاہئیں، اور ان پر عمل کرنا چاہئے، یہاں پہونچکر

---

[1] یہ کتاب ڈاکٹر عبد العظیم الدیب کی تحقیق سے شیخ عبد اللہ ابن ابراہیم الانصاری کی توجہ اور اہتمام سے حکومت قطر کے "الشئون الدینیۃ" کے مصارف پر ۱۴۰۰ھ میں طبع ہوئی، کتاب کی ضخامت بڑی تختی پر ۶۱۱ صفحات ہیں۔ [2] ابن خلکان، طبقات الشافعیہ وغیرہ، نظام الملک کے حالات و کمالات کے لئے (اردو میں) ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" از مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری مرحوم۔

یہ کتاب فقہ (شافعی) کی کتاب بن جاتی ہے، کتاب میں خلفائے راشدین کی خلافت کی صحت و اہمیت سے بحث نہیں، وہ درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات و فرائض پر ہے، کتاب میں جا بجا ماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" پر تعریض اور مولف پر اعتراضات بھی ہیں۔

تیسری قابل ذکر کتاب شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ - ۷۲۸ھ) کی کتاب "السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ" ہے، مصنفِ علّام نے کتاب کے خطبہ میں صراحت سے کہدیا ہے کہ یہ مختصر رسالہ ہے جس میں سیاست الٰہیہ اور نیابت نبویہ کے وہ چند اصول و احکام بیان کئے جائیں گے جن سے راعی اور رعیت کوئی بھی مستغنی نہیں، کتاب درحقیقت آیت قرآنی :-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ	والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا
بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ	کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے
(الیٰ قولہ تعالیٰ) ذٰلِكَ خَيْرٌ	لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔
وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۞	یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا
(سورۃ النساء - ۵۸ - ۵۹)	مآل بھی اچھا ہے

کی تفسیر و تفصیل ہے۔

قسم اول میں باب اول کا عنوان "الولایات" ہے، باب دوم کا "الأموال" ہے، اور قسم ثانی میں پہلے حدود اللہ اور حقوق اللہ سے بحث کی گئی ہے، پھر حقوق العباد سے کتاب متوسط سائز کے ۱۶۸ صفحات پر آئی ہے [1]۔

---

[1] ہمارے سامنے اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو ۱۹۶۹ء میں دار الکتاب العربی مصر کی طرف سے شائع ہوا۔

اس کتاب میں بھی خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کے سلسلہ کی اصولی، کلامی اور تاریخی بحثوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، جس کے بارہ میں کتاب کے جلیل القدر مصنف سند اور امام کا درجہ رکھتے تھے، اور اگر وہ اس کی طرف توجہ فرماتے تو وہ اسلام کے تحقیقی ذخیرۂ کتب اور مباحث میں گرانقدر اضافہ ہوتا، اس موضوع پر ان کے وسیع علم اور رواں قلم نے "منہاج السنۃ" کے صفحات پر اپنا اصلی جوہر دکھایا ہے، اور اس میں ان کے دریائے علم کی طغیانی اور رہوار قلم کی جولانی کا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔[1]

اسلام میں خلافت کی حیثیت و مقام

قرآن مجید اور حدیث نبوی ؐ میں دعوت اسلامی اور دین محمدی ؐ کے قبول کرنے، اور ان پر ایمان لانے والوں کا تصور ایک منظم اور مربوط جماعت ہی کی تشکل میں کیا گیا ہے، ان کے لئے "امت"، "ملت"، "جماعت" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، وہ سب اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ الفاظ کتاب و سنت کی لغت و اصطلاح میں محض تعداد کی کثرت، اور انسانوں کے انبوہ کے جیسے سطحی مفہوم اور معنی کے لئے استعمال نہیں کئے گئے، جن کا ادیان و ملل کی تاریخ میں بھی، اور قوموں اور تہذیبوں کی تقدیر میں بھی کوئی وزن اور اثر نہیں ہے، بلکہ سارا قرآن مجید کہیں امم سابقہ کے واقعات کے سلسلہ میں اور کہیں قوت و ضعف اور غلبہ و ہزیمت کے اسباب کے تذکرے میں، تعداد کی کثرت کی بے اثری، انسانی انبوہ کی بے وزنی اور صالح ترین افراد کی موجودگی میں فساد کے غلبہ، انسانوں کی مظلومیت اور دین حق کی مغلوبیت کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ" پر تبصرہ "تاریخ دعوت و عزیمت" حصۂ دوم ص ۲۸۴-۳۱۲

میزان عدل اور میزان عقل دونوں میں منتشر افراد کی (جن کی تعداد خواہ کتنی ہی زائد ہو) کوئی بڑی اہمیت وافادیت نہیں۔

اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں، ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تنظیم، پھر اس کی ترویج و توسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے، ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب پُرسکون اور پُرامن زندگی کے لئے فضا ہموار کرنا بھی ہے، جس میں خالق کے فرائض، مخلوق کے حقوق، دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقعہ، اور ان کمالات وارتقائی منازل تک پہونچنے کا پورا امکان پایا جائے، جن کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت، ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو، جو کبھی غیر منظّم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں، کبھی خود ساختہ قوانین سے، کبھی مطلق العنانی اور جاہ واقتدار کی ہوس سے، اس کے لئے ایک منزّل من اللہ قانون، آسمانی شریعت، اور خدا کی الوہیت وحاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظامِ خلافت وامارت ضروری ہے، جہاں تک شریعت الٰہی کا تعلق ہے، اس کے منزّل من اللہ، معصوم عن الخطاء، اغراض ومفادات، تعصّبات اور جنبہ داریوں سے بلند وبالاتر ہونے کا عقیدہ ضروری ہے اور جہاں تک خلافت وامارت کا تعلق ہے، اس کا اس شریعت کے صحیح ترجمان ونمائندہ، اور انسانی طاقت وارادہ کی حد تک بے جا حمایت وعصبیت، مداہنت اور عدم مساوات سے دور رہنا ضروری ہے۔

ان مقاصد کی تکمیل اور ان نتائج کے ظہور کے لئے ابتداء ہی سے صاحبِ شریعت (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے احکام وہدایات صادر فرمائیں جن کی موجودگی میں مسلمان

ایک ایسی منظم اور مربوط جماعت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو ایک ایسے صناامرفرد کے حکم وانتظام کی تابع ہے، جو بہت سی خصوصیات میں ان سے امتیاز رکھتا ہے، ان کے مصالح، مفادات اور ضروریات کا نگراں ہے، اور انھوں نے اس کو شریعت کے وسیع و لچکدار رہنما اصولوں کی روشنی میں انتخاب کیا ہے، اگر وہ امامت کبریٰ کے منصب پر فائز ہے تو اس کو خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین، یا امام کہیں گے، اور اگر وہ اس کا نائب اس کا نامزد کیا ہوا ہے، یا شریعت کے احکام کے نفاذ، فصل خصومات، اور منظم دینی زندگی گذارنے کے لئے مسلمانوں نے اس کو (جزئی اور مقامی طور پر) انتخاب کیا ہے، تو اس کو امیر کہیں گے۔

خلیفہ کا انتخاب ایسے دینی فرائض میں سے تھا کہ سب سے بڑے عاشق رسول اور جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سب سے بڑے عشاق وجاں نثاروں کے گروہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (مع اہل بیت عظام کے) اس مسئلہ کا تصفیہ، اور خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کو جسد اطہر وانور کی تدفین پر مقدم رکھا، اور تقریباً یہی معمول ہر خلیفہ کے انتقال پر رہا، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب ۱۱ھ سے لے کر خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کی شہادت ۶۵۶ھ تک عالم اسلام خلیفۂ اسلام سے کبھی محروم نہیں رہا، صرف خلیفۂ مسترشد باللہ جو سلطان مسعود سلجوقی کے ہاتھوں ۱۰ رمضان ۵۲۹ھ میں گرفتار ہوا تھا، کی غیبت واسیری کے قلیل وقفہ میں جو تین مہینے سات دن سے متجاوز نہیں تھا، عالم اسلام خلیفۂ اسلام کے بغیر رہا، لیکن یہ عالم اسلام کے لئے ایک ایسا انوکھا تجربہ، اور المناک واقعہ تھا جس کی وجہ سے وہ سیاہ پوش اور سوگوار، اور بغداد زیروزبر ہو گیا، ابن کثیرؒ کے الفاظ میں:۔

"بغداد کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں

سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں، اور خلیفہ کے قید اور اس کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا، اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی۔[1]

خلیفہ مستعصم باللہ کی شہادت پر شیخ سعدیؒ نے جو مرکز خلافت سے بہت دور شیراز میں رہتے تھے، جو دل دوز و جگر سوز مرثیہ کہا ہے، اور جس کا مطلع ہے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

بر زوالِ امرِ مستعصم امیر المؤمنیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خلافت اور خلیفہ کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور عالم اسلام کی ان سے محرومی پر کن جذبات کا اظہار کرتے تھے۔

خلافت کی جامع و مانع تعریف

شاہ صاحبؒ نے جن کی نظر کتاب و سنت، فقہ، عقائد اور علم کلام اور سیرت و تاریخ پر نہایت وسیع اور گہری تھی، اور وہ مقاصد شریعت کے رمز آشنا تھے، خلافت کی ایسی جامع و مانع تعریف کی ہے جس سے بہتر پیش کرنی مشکل ہے، اس تعریف کا ہر لفظ اپنے ساتھ معانی و مطالب اور مثالوں کا ایک دفتر رکھتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

الخلافۃ ھی الریاسۃ العامۃ   خلافت اس عمومی سربراہی اور

---

[1] ابن کثیر جلد ۱۲ ص ۲۰۸

في التصدي لإقامة الدين بإحياء العلوم الدينية وإقامة أركان الإسلام والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش والفرض للمقاتلة وإعطائهم من الفيء، والقيام بالقضاء، وإقامة الحدود، ورفع المظالم، والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، نيابةً عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم۔[1]

ریاست عامہ کا نام ہے جو "اقامتِ دین" کے کام کی تکمیل کے لئے وجود میں آئے، اس "اقامتِ دین" کے دائرۂ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام، مثلاً لشکروں کی ترتیب، جنگ میں حصہ لینے والوں کے حِصَص ومال غنیمت میں ان کا حق، نظام قضا کا اجراء، حدود کا قائم کرنا، مظالم وشکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے، اور یہ سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیئے۔

پھر اقامت دین کی مزید تشریح وتعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"ہم جب معاملات کو استقرائی نظر سے دیکھتے ہیں، جزئیات سے کُلّیات اور کُلّیات سے ایک ہی کُلّیہ کی طرف جو سب پر حاوی ہو منتقل ہوتے ہیں، تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان معاملات، جزئیاتِ مُشتتّہ اور کلّیات کثیرہ کی جنس اعلیٰ اور

---

[1] ازالۃ الخفا ص۲ ج۱

(گویا کلیۃ الکلیات) وہ حقیقت ہے جس کا عنوان "اقامت دین" ہے، جس کے ماتحت دوسری انواع و اجناس آتی ہیں، جن میں سے ایک احیاء علوم دین ہے، جس میں قرآن وسنت کی تعلیم اور تذکیر و موعظت شامل ہے، اللہ تعالے کا ارشاد ہے :۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ[1] (سورۃ الجمعۃ ـ ۲)	وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انھیں میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انھیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

خلفائے راشدین کی خلافت پر قرآن سے استدلال

کتاب کا سب سے وجد انگیز حصہ وہ ہے جس میں شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کی متعدد آیات سے خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد اور ان کے خلیفۂ راشد ہونے اور ان کے ذریعہ سے منشائے الٰہی کی تکمیل، اور امر تکوینی کے تحقّق پر استدلال کیا ہے، اور آیات کے ایسے اشارات بلکہ تصریحات کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے بدیہی طور پر (بلکہ بعض مقامات پر ریاضی کے نتائج کے رنگ میں) یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کے سوا ان آیات کا کوئی اور مصداق اور مراد

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲-۳ / ۱

نہیں ہوسکتا، اوران پیشین گوئیوں کا انطباق ان کی ذات کے سوا کسی پر، اوران وعدوں کا تحقق ان کے دور خلافت کے سوا کسی دور میں وقوع پذیر نہیں ہوا، اگر ان کی شخصیتوں اور ان کے عہد کو بیچ میں سے نکال لیا جائے تو یہ صفات بغیر کسی مصداق کے اور یہ وعدے تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں۔

ان آیات میں جو شاہ صاحبؒ نے پیش کی ہیں، ہم بطور نمونہ کے صرف دو آیتیں انتخاب کرتے ہیں، ان میں سے ایک سورۂ نور کی آیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے
مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم وپائیدار
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ	بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے،
الْفٰسِقُوْنَ ۝	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(سورۃ النور۔ ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر
	کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ (استخلاف وتمکین فی الارض، اور خوف کے بعد امن کا) ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا ہے، جو سورۂ نور کے نزول کے وقت موجود،

اسلام اور صحبت نبوی سے مشرف، اور دین کی نصرت وتائید میں شریک تھے، شاہ صاحبؒ صفائی سے لکھتے ہیں کہ اس وعدہ کا اطلاق حضرت معاویہ، بنو امیہ اور بنو عباس پر نہیں ہوتا، جو اس وقت یا تو اسلام نہیں لائے تھے، یا مدینہ میں موجود نہیں تھے۔

پھر لکھتے ہیں کہ یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ معقول کہ اس پوری جماعت مسلمین کو خلافت فی الارض سے سرفراز کیا جائے، اور وہ سب بیک وقت منصب خلافت پر فائز ہوں، اس لئے اس سے کچھ خاص افراد ہی مراد لئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں :-

"لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ یعنی لیستخلفن جمعًا منهم، و"انقیاد" لوازم اوست" یعنی ان میں سے ایک جماعت کو خلیفہ بنایا جائیگا، اور انقیاد وطاعت اس کے لئے شرط ہے، پھر یہ کہ جب اس وعدہ کا تحقق ہوگا، تو دین علی اکمل الوجوہ ظہور میں آئیگا، اور اس کو پورا اقتدار اور اختیار حاصل ہوگا، ایسا نہیں، جیسے اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ خدا کو جو دین پسند ہے وہ ہمیشہ مستور و مختفی رہا ہے، اور اسی بناء پر ائمۂ اہل بیت نے ہمیشہ تقیہ سے کام لیا، اور ان کو اپنے دین کے کھلم کھلا اعلان کی کبھی قدرت حاصل نہیں ہوئی "وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ" (ان کے لئے اللہ تعالیٰ اس دین کو قوت وغلبہ عطا فرمائیگا، جس کو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین خدا کا پسندیدہ اور منتخب دین نہیں جس کا اس زمانۂ خلافت میں اعلان واظہار نہ کیا جا سکے[1]

اسی طرح فرماتا ہے "وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" اس زمانۂ استخلاف

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲۰ ج ۱

میں اللہ تعالےٰ خوف وہراس کی فضا کے بجائے امن واطمینان کی فضا پیدا کر دے گا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مستخلفین اور بقیہ مسلمان اس وعدہ کی تکمیل کے وقت امن واطمینان کے ساتھ ہوں گے، نہ ان کو مختلف الادیان کفار کا کوئی ڈر ہوگا، اور نہ کسی اور جماعت یا طاقت کا اندیشہ، برخلاف اس کے فرقۂ امامیہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ائمۂ اہل بیت ہمیشہ ترساں وہراساں رہے، انھوں نے تقیہ سے کام لیا، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ مسلمانوں سے اذیت اور تکلیف پیش آئی اور وہ اہانت وذلت کا سامنا کرتے رہے، اور کبھی مؤید ومنصور نہیں رہے[1]، استخلاف اور تمکین فی الارض کے وعدہ کا ظہور انھیں مہاجرین اولین اور نزول آیت استخلاف کے وقت موجود رہنے والے حضرات کے ذریعہ ہوا، اور اگر یہ لوگ خلیفہ نہیں تھے، تو اس وعدہ کا ظہور ہی نہیں ہوا، اور نہ قیامت تک ہونے والا ہے" تعالی اللہ عن ذٰلک علواً کبیراً۔[2]

دوسری آیت "قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ" الخ سورۃ الفتح (آیت ۱۶) کی ہے، شاہ صاحبؒ نے اس آیت پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ اس خواب کی بناء پر جو آپ نے دیکھا تھا، عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ کی طرف کوچ فرمایا، واقعہ کی اہمیت، مکہ معظمہ کے حالات اور قریش کی مخالفت کے خطرہ کی بناء پر صحابہ کرامؓ بڑی تعداد میں ہمرکاب ہوئے، لیکن اعراب (بادیہ کے ساکنین) خوف ونفاق کی بناء پر ساتھ نہیں ہوئے،

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲۱   [2] ایضاً ص ۲۳

حُدَیبیہ میں فسخ عزیمت اور قریش کے ساتھ صلح کا وہ تاریخ ساز واقعہ پیش آیا جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، وہیں وہ بیعت رضوان ہوئی، جس میں شریک ہونے والوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی خوشنودی کا خاص پروانہ عطا فرمایا، اور قریبی زمانہ کی فتح کا مژدہ سنایا[1]، پھر اسی سورہ فتح میں یہ بھی اعلان فرمادیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں (جو محرم ۷ھ کا واقعہ ہے) ان اعراب کو ساتھ نہیں لیا جائیگا، جو حدیبیہ کے موقعہ پر موجود نہیں تھے، اور جنھوں نے اس عظیم وخطرناک مہم میں رفاقت سے پہلوتہی کی تھی، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ	جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلوگے تو
إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا	جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے
نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا	ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ آپ کے
كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ	ساتھ چلیں یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے
قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ	قول کو بدل دیں کہدو کہ تم ہرگز
بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ	ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے اسی طرح
إِلَّا قَلِيلًا ۝	خدا نے پہلے سے فرمادیا ہے پھر کہیں گے،
(سورۃ الفتح ـ ۱۵)	(نہیں) تم تو ہم سے حسد کرتے ہو
	بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں
	مگر بہت کم

لیکن اس کے بعد ہی ان متخلفین سے فرمایا گیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں

[1] سورۂ فتح ـ ۱۸

تو تمہیں شرکت اور اس کے مغانم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے لیکن عنقریب تم کو ایسے لوگوں سے قتال کرنے کے لئے مدعو کیا جائیگا جن کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ بڑی شجاعت اور طاقت کے مالک ہیں، دوسرے ان کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان سے یا تو قتال کیا جائیگا یا وہ اسلام لے آئیں گے، درمیان کی کوئی چیز (جزیہ) نہیں ہے، اور یہ دعوتِ قتال اللہ کو ایسی محبوب اور اس کا داعی ایسا معتبر اور واجب الاطاعت ہوگا کہ اگر تم اس کی دعوت قبول اور اس کے حکم کی بجا آوری کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو اجرِ حسن سے نوازے گا، اور اگر پہلے کی طرح روگردانی کروگے، تو عذابِ الیم میں مبتلا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ	جو گنوار پیچھے رہ گئے تھے ان سے
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ	کہدو کہ تم ایک سخت جنگجو قوم کے
شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ	(ساتھ لڑائی کے) لئے بلائے جاؤگے
فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ	ان سے تم (یا تو) جنگ کرتے رہوگے
وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ	یا وہ اسلام لے آئیں گے اگر تم حکم
يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝	مانو گے تو خدا تم کو اچھا بدلہ دے گا
(سورۃ الفتح ۔ ۱۶)	اور اگر منہ پھیر لوگے جیسے پہلی دفعہ
	پھیرا تھا تو وہ تم کو بڑی تکلیف کی
	سزا دے گا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "سَتُدْعَوْنَ" (عنقریب تم بلائے جاؤگے) سے بطریق اقتضاء ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ مستقبل میں کوئی ایسا داعی (بلانے والا) ہوگا جو اعراب

(بادیہ کے رہنے والوں کو جو صلح حُدیبیہ کے موقعہ پر لشکر اسلام کے ساتھ نہیں گئے تھے) کو ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لئے دعوت دے گا جس کے لئے دو ہی شکلیں ہیں یا قتال، یا اسلام (اور جس کا مصداق عرب کے مرتد قبائل ہی ہو سکتے ہیں، جن سے جزیہ لینا جائز نہ تھا، وہ یا تو جنگ میں مارے جاتے یا اسلام قبول کرتے) اور یہ شکل صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آئی جنھوں نے مرتدین عرب سے قتال کیا، ان کا حکم شرعی یہی تھا، اس سے مراد نہ رومی ہو سکتے ہیں، نہ ایرانی، جن کے لئے تین شکلیں تھیں قتال، اسلام اور جزیہ، اس لئے اس سے بداہۃً حضرت صدیق اکبر رض کی خلافت ثابت ہوتی ہے جنھوں نے مرتدین سے جنگ کرنے کے لئے حضرت خالد رض کی ماتحتی میں فوج بھیجی اور اعراب کو اس کی دعوت دی، پھر اس دعوت کے قبول کرنے پر اجر کا ملنا اور نہ قبول کرنے پر عذاب کا مستحق ہونا ایک خلیفۂ راشد ہی کا مقام و منصب ہے۔[1]

کتاب کے دوسرے قیمتی مضامین

خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات کے دلائل اور خلفائے اربعہ کے مآثر و مناقب،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ازالۃ الخفا ص ۳۸-۳۹ ج ۱ شاہ صاحب کے اس استدلال کی تائید علامہ شہاب الدین محمود الآلوسی (م ۱۲۷۰ھ) کی مشہور تفسیر "روح المعانی" سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"المراد بالمغانم مغانم خیبر کما علیہ عامۃ المفسرین[1]"

"ستدعون الی قوم اولی بأس شدید" وھم علی ما اخرج ابن المنذر والطبرانی عن الزھری بنو حنیفہ مسیلمۃ وقومہ اھل الیمامہ. وعن رافع بن خدیج انا کنا نقرأ ھذہ الآیۃ فیما مضی ولا نعلم من ھم حتی دعا ابوبکر رضی اللہ عنہ الی قتال بنی حنیفۃ فعلمنا انھم أرید وابھا.[2]

وشاع الاستدلال بالآیۃ علی صحۃ امامۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ[3].

---

[1] روح المعانی ص ۱۰۱ [2] ایضاً ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۱۰۴

ان کے زمانہ کے کارناموں اور ان کے بہت سے قیمتی کلمات اور ارشادات کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی بیش بہا فوائد تحقیقات نادرہ، اور وہ قیمتی مواد ہے، جو نہ عقائد وعلم کلام کی کتابوں میں عام طور پر ملتا ہے، نہ تاریخ اور سیر میں، ان میں سے ایک قرون ثلاثہ کی توضیح[1]، خلافت و سلطنت کا فرق اور اس کی تفصیلات[2]، ملک عضوض (مطلق العنان فرمانروائی) کی تشریح اور اس بات کی تصریح ہے کہ بنی اُمیہ کی سلطنت اور مطلق العنان فرمانروائی خلافت نہ تھی، ان کے نزدیک اگرچہ خلافت راشدہ حضرت علی مرتضیٰ پر ختم ہو گئی، لیکن وہ حضرت معاویہ کے بارے میں (ان مناقب کی بناء پر جو ان کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں) سوء ظن اور طعن و تشنیع سے احتراز کی تلقین کرتے ہیں[3]، لیکن ان کے بعد کے خلفاء بنی مروان کے متعلق صاف لکھتے ہیں:۔

چوں عبدالملک تسلط یافت فرقت	جب عبدالملک (بن مروان) نے اقتدار
از میان رفت و احکام خلافت جابرہ	حاصل کر لیا، تو انتشار ختم ہو گیا، اور خلافت
کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم	جابرہ کے احکام جن کی آنحضرت صلے اللہ
در چندیں احادیث تشریح آں فرمودہ	علیہ وآلہ وسلم نے متعدد احادیث میں
بودند، بر منصۂ ظہور آمد[4]۔	تشریح فرمائی تھی منظر عام پر آ گئے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مذہب، ان کے فتاویٰ اور احکام پر وہ مفصل مواد ہے جس کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے[5]، اور جس سے ایک پوری

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۱۲۱-۱۲۲ ۔ [2] ایضاً ص ۱۲۶ ۔ [3] ایضاً ص ۱۴۶

[4] ایضاً ص ۱۴۳ یزید کے متعلق "حجۃ اللہ البالغہ" میں صفائی سے لکھتے ہیں "دعاۃ الضلال یزید بالشام ومختار بالعراق" ترجمہ۔ ضلالت کے داعی دو تھے، یزید شام میں اور مختار عراق میں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۱۳) اسی طرح مناقب کی بحث میں یزید کو منافق یا فاسق لکھا ہے۔ ص ۲۱۵

فقہ فاروقی سامنے آگئی ہے۔[1]

فقہ فاروقی کو یگانہ حیثیت سے پیش کرنے اور حضرت عمرؓ کے اجتہادات اور فتاویٰ کو جمع کرنے کا شاید یہ پہلا مبارک اقدام تھا جس کو شاہ صاحبؒ نے دوسری اولیات کے ساتھ انجام دیا، اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی، حال میں (۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے "موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب" (حضرت عمرؓ کی فقہ کا دائرۃ المعارف، انسائیکلوپیڈیا) کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی، یہ کتاب بڑے سائز کے ۹۸۰ صفحات پر آئی ہے۔

خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی خلافت کے اثبات، اور ان کے فضائل و مناقب، مآثر اور خدمات کے ایسے تفصیلی تذکرہ کے ساتھ جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق و جوش صاف جھلکتا ہے، اور جو اس ضرورت کی تکمیل ہے، جو اس زمانہ کا تقاضا اور کتاب کی تصنیف کا اصل محرک ہے، انھوں نے امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے مآثر و فضائل بیان کرنے میں تأمل و تحفظ سے کام نہیں لیا ہے، ان کو بھی انھوں نے پوری عقیدت، ان کے حقوق کے اعتراف اور اہل بیت کرام کے ساتھ محبت کے جذبہ اور پورے توسع کے ساتھ بیان کیا ہے[2]، مآثر سیدنا علیؓ بن ابی طالب کو حسب ذیل الفاظ سے شروع کرتے ہیں "مآثر امیر المومنین و امام الاشجعین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ" اسی طرح حضرات حسنینؓ بالخصوص سبط اکبر سیدنا حسن مجتبیٰ کا ذکر پوری عظمت و محبت کے ساتھ کرتے ہیں، وفات نبویؐ کے بعد حوادث مہمہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کو

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۸۵-۱۴۲ ج ۲ [2] ایضاً ص ۲۵۱-۲۸۳ ج ۲

فتنۂ اولیٰ شمار کیا ہے[1] اور فتنۂ ثانیہ میں جگر گوشۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو لیا ہے، اور مشکوٰۃ شریف کی ایسی روایت (جو بیہقی سے ماخوذ ہے) نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امامؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی نسبت ہے جو ایک مضغۂ گوشت کو جسم سے ہوتی ہے[2] اور آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ امت ان کو شہید کرے گی[3]، اسی فتنہ میں واقعۂ ہائلہ حرّہ کو بھی شمار کیا ہے جس میں یزید کے زمانہ میں اس کے لشکر کے ہاتھوں مدینہ طیبہ میں قتل ونہب کا شرمناک واقعہ پیش آیا، اور مدینہ واہل مدینہ کی سخت بے حرمتی ہوئی[4]؛ شاہ صاحبؒ نے بنی امیہ کے بارے میں جا بجا کھلی تنقید سے کام لیا ہے[5]، اس طرح کتاب میں وہ توازن اور اعتدال پورے طور پر موجود ہے، جو اہل سنت والجماعت کا شعار وافتخار ہے۔

وفات نبویؐ کے بعد کے تغیرات وفتن کی نشاندہی

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام کی دینی تاریخ، اور ذہنی ومذہبی انقلاب وتغیر کا ایک مختصر ابھرا ہوا خاکہ بھی آگیا ہے، اسلام کی سیاسی وعلمی تاریخیں تو بے شمار ہیں، لیکن ایسی تاریخ کہیں نہیں ملتی جس میں اسلام کے سیاسی وتمدنی تاریخی تسلسل کے درمیان نئی ذہنی، علمی اور اخلاقی تبدیلیوں کے نشان (خواہ وہ ایسے ہلکے اور پھیکے رنگ کے ہوں جو صحیح اسلامی مزاج کی واقفیت کی خوردبین کے بغیر دیکھے نہ جا سکیں) نظر آئیں، کتابوں میں تھوڑا سا منتشر مواد ملتا ہے، لیکن کسی نے اس کو اپنی بحث کا عنوان نہیں بنایا، شاہ صاحبؒ خیر القرون سے متصلاً اس کے بعد کے فتنے[6]، خیر القرون اور شر القرون کے احکام کا اختلاف[7]، اور تغیرات کلیہ کے ضمن میں ان معنوی اور فکری تغیرات کا تذکرہ کرتے ہیں، جو عہد رسالت اور خیر القرون کے بعد پیش آئے، ان کے عنوانات شاہ صاحبؒ

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۵۴ [2] ص ۱۵۴ [3] ص ۱۵۴ [4] ص ۱۵۴-۱۵۵ [5] ص ۱۲۳ [6] ص ۱۳۶

کے یہاں حسب ذیل ہیں۔

ظہور کذب، تجوید قرآن کے سلسلہ میں تعمق و مبالغہ، قراءت اور تلاوت پر اکتفا اور تدبّر فی القرآن اور تفقہ کی کمی، فقہی مسائل میں موشگافی اور مسائل کی فرضی شکلوں پر جو وقوع پذیر نہیں ہوئیں پہلے سے بحث و مباحثہ، متشابہات قرآن کی تاویل اور اس میں دور کی کوڑی لانا، عقائد و الٰہیات میں نئے نئے سوالات کا پیدا کرنا، تقرب الی اللہ کی نیت سے نئے نئے اوراد و احزاب کی ایجاد، جو سنت ماثورہ پر اضافہ کرتے ہیں، مستحبات کی ایسی پابندی اور التزام جیسی واجبات کی ہونی چاہیئے، فتوے دینے کے بارے میں اجتماعی مشورہ اور علمائے صالحین سے رجوع کے سلسلہ کا ختم ہو جانا، نئے نئے فرقوں قدریہ اور مرجیۂ وغیرہ کا پیدا ہونا، مسلمانوں کے باہمی اعتماد و امن کا اٹھ جانا، ایسے لوگوں کا حکومت پر متمکن ہو جانا جو یا تو سرے سے حکومت کا استحقاق نہیں رکھتے، یا درجہ دوم سوم کے لوگ ہیں، ارکان اسلام کے قیام میں سستی اور فتور کا واقع ہونا[1]۔

کتاب کی طباعت واشاعت

کتاب ازالۃ الخفا پہلی مرتبہ مولوی محمد احسن صدیقی کے اہتمام میں منشی جمال الدین خاں صاحب مدار المہام ریاست بھوپال کے حکم و ہدایت پر ۱۲۸۶ھ بریلی میں مطبع صدیقی میں چھپی، اس وقت تین[۳] نسخے فراہم ہو سکے، جن سے تصحیح و مقابلہ کا کام کیا گیا، ایک منشی صاحب کا بھوپال کا نسخہ، دوسرا مولوی احمد حسن صاحب امروہی کا نسخہ، تیسرا مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کا۔ قرینہ ہے کہ مصنف علام کتاب پر نظر ثانی نہیں فرما سکے۔

---

[1] ص ۱۳۳/۱

کتاب کا دوسرا ایڈیشن سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان سے ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء کو شائع ہوا، جو پہلے ایڈیشن کا آفسٹ ہے[1]، کتاب کا عربی ترجمہ المجلس العلمی ڈابھیل کے اہتمام میں تیار ہوا، لیکن اس کی کماحقہ ممالک عربیہ میں اشاعت نہیں ہو سکی، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے کتاب کا اردو ترجمہ کیا، جو کتاب کی فصل اول سے فصل پنجم (ص۱۵۵) تک پر مشتمل ہے، اس کا نام کشف الغطاء عن السنة البيضاء رکھا، اس مطبوعہ حصہ کی ضخامت ۳۳۶ صفحات ہے، ۱۳۲۹ھ میں عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔

[1] یہی ایڈیشن اس باب کی تحریک، نت پیش نظر رہا ہے اور اسی کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

باب نہم

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار

تین نوخیز جنگجو طاقتیں

کتاب کے باب دوم[1] میں گزر چکا ہے کہ بارہویں صدی (ہجری) کا ہندوستان سیاسی انتظامی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط وپستی، بدنظمی وطوائف الملوکی، اور انتشار واضطراب کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا جس کو کسی معاشرہ ونظام کا دم واپسیں یا حالتِ احتضار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مغلیہ سلطنت ایک حکمراں مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت (SYMBOL) بن کر رہ گئی تھی جس کے پیچھے نہ کوئی طاقت تھی، نہ سلیقہ، نہ حوصلہ۔

بظاہر اس وقت سلطنت مغلیہ ہی نہیں پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین نوخیز جنگجو طاقتیں تھیں، علی الترتیب مرہٹہ، سکھ، جاٹ۔

مرہٹے

مرہٹے جن کی سرگرمیاں پہلے دکن میں محدود تھیں اور جن کی حیثیت ایک منظم قانونی

---

[1] ہندوستان (سیاسی حالت)۔

حکومت کے خلاف ایک احتجاجی گروہ (AGITATORS) اور چھاپہ مار (GUERRILLA) طاقت سے زیادہ نہ تھی، مرکزی حکومت کی روزافزوں کمزوری، طالع آزما سرداروں کی باہمی زور آزمائی، اور امرائے سلطنت کی کوتاہ نظری کی وجہ سے (جو اپنے حریف کو زک دینے یا زچ کرنے کی نیت سے مرہٹوں سے کام لیتے رہتے تھے) ایک ایسی ہندگیر طاقت بن گئے، جو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے اور اس خلا کو پُر کرنے کا خواب دیکھنے لگے جو مغلوں کی فوجی طاقت کی کمزوری اور ان کی انتظامی نااہلی نے پیدا کر دیا تھا۔

سنہ ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء میں[1] ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اور جاٹوں کی مدد سے ۱۱۷۱ھ ۱۷۵۷ء کو دہلی پر حملہ کر دیا، نجیب الدولہ کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، اس کے بعد انھوں نے پنجاب کا رخ کیا جو اس اہم جنگی علاقہ کا دروازہ تھا جس سے فاتح ہندوستان میں داخل ہوتے رہے، اور جو ابھی تک کسی غیر اسلامی طاقت کے زیرنگیں نہیں رہا تھا، انھوں نے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا، اور آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا حاکم مقرر کیا، آدینہ بیگ کے مرنے پر انھوں نے سباجی سندھیا کو پنجاب کا حاکم (گورنر) مقرر کیا۔

صفدر جنگ کے اشارہ اور مدد سے پہلے مرہٹے دوآبہ میں (جو ان علماء و مشائخ کا مرکز تھا، جو خود دہلی کی زیب و زینت تھے) داخل ہوئے، اب داتاجی سیندھیا نے سنہ ۱۱۷۲ھ میں دکن سے آکر سارے ہندوستان کے فتح کر لینے کا بیڑا اٹھایا، پہلے روہیلکھنڈ اور اودھ کا رخ کیا، اور اس ارادہ سے جمنا کو عبور کیا ۱۱۷۲ھ ۱۷۵۹ء میں جب دریا قابلِ عبور ہوئے، اس نے گوبند رائے بندیلہ کو بیس ہزار لشکر کے ساتھ روہیلکھنڈ میں

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات سے ۵-۶ سال پیشتر۔

اتار دیا، اس نے رام گنگا سے اتر کر امروہہ تک (جو دہلی سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے) ملک کو لوٹ لیا۔

۲۴؍جون ۱۷۶۰ئہ (۹؍ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ) کو مرہٹے پایہ تخت دہلی میں داخل ہوئے یعقوب علی خاں قلعہ دار نے قلعہ حوالہ کر دیا، بھاؤ نے قلعہ کی قلعہ داری شنکر راؤ کے سپرد کی اس نے دیوان خاص کی نقرئی و سیمین چھت کو اتار لیا اور ٹکسال میں بھیج دیا، قدم شریف اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں سونے چاندی کا جو سامان تھا لے لیا۔ ۱۰؍نومبر ۱۷۶۰ئہ (۲۹؍صفر ۱۱۷۴ھ) کو شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے مرزا جوان بخت خلف شاہ عالم عالی گہر کو تخت پر بٹھایا، چاہتا تھا کہ خود تیموری تخت پر جلوہ افروز ہو اور وہ ایسا کر سکتا تھا، مگر لشکر کے دانشمندوں نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا کہ اس سے پورے ملک میں شورش برپا ہو جائیگی، اور رعایا تخت بابری پر کسی مرہٹہ سردار کو بیٹھا دیکھ کر آسانی سے برداشت نہیں کر سکے گی، اس وقت مرہٹوں کی عملداری کو جو وسعت حاصل تھی، وہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی، نہ اس کے بعد ہوئی، اس کی شمالی سرحد اٹک اور ہمالیہ کے پہاڑ تھے، جنوب میں جزیرہ نمائے دکن کے پچھلے سرے یعنی سمندر تک پھیلی ہوئی تھی، جو علاقے ان حدود کے اندر آزاد تھے، وہ اس کے باج گزار تھے، ان کے پاس آزمودہ کار سپہ سالار ملازم تھے، دس ہزار سپاہ فرنگستان کی قواعد دان ان کے پاس موجود تھی، پانی پت کی لڑائی میں ان کے پاس پچپن ہزار سوار جرار اور پندرہ ہزار پیادے تھے، دو سو توپیں (علاوہ قلعہ شکن توپوں کے) ساتھ تھیں، راجپوتوں کی فوج بھی ساتھ ہو گئی تھی، اس طرح سب مل کر تین لاکھ لڑنے والے سپاہی ان کے جھنڈے کے نیچے اور زیر قیادت تھے۔

بایں ہمہ مرہٹوں کا مزاج شاہانہ اور ذمہ دارانہ نہ تھا، ہندوستان کے ایک مؤرخ کے بقول " وہ آدھے بادشاہ آدھے راہ زن تھے "[1] رعایا پروری، ہمدردیٔ خلائق اور انسانی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کی قدیمی وموروثی روایات (جو رعونت ونفسانیت کے موقعوں پر بھی خود مختار حاکموں اور بادشاہوں کی کسی حد تک حفاظت کرتی، اور عناں گیر ہوتی رہی ہیں) نیز شاندار تاریخی پس منظر (BACK GROUND) نہ ہونے اور اعلیٰ اور واضح تعمیری وسیاسی مقاصد کے مفقود ہونے کی وجہ سے پھر اس سب کے علاوہ ہندو مذہب وتہذیب کے احیاء کے جذبہ (HINDU REVIVALISM) نے ان میں جارحیت، فیصلوں میں عجلت اور عدم رواداری کی صفت پیدا کر دی تھی، لوٹ کا مال، اور اس کی محبت ان کی قومی کمزوری تھی۔

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے، دیہاتوں کو بے دردی سے لوٹنا، لوگوں کے ہاتھ ناک کان کاٹ لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، حملہ آوروں کی نفسانی ہوس کا شکار بلا تفریق مذہب وملت عورتوں کا پورا طبقہ بنتا تھا، اس میں بھی ہر طرح کے حدود سے تجاوز کرکے بہیمانہ ووحشیانہ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا رہا، بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے بنگال پر ان کے حملوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے۔[2]

پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی اخلاق سوز حرکتوں پر اپنے استعجاب کا اظہار

---

[1] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی ص ۳۰۴ ج ۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جادو ناتھ سرکار کی کتاب FALL OF THE MOGHAL EMPIRE, P. 87

کیا ہے[1]، مرہٹوں کے اقتدار کا عوام پر بڑا اقتصادی اثر پڑا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول "ان کی نیت یہ ہے کہ جہاں تک ان کی دسترس ہو، خلق خدا کے معاشی ذرائع مسدود کرکے اپنے قبضہ میں کرلیں" مرہٹے مغلیہ سلطنت کے ان دور افتادہ علاقوں سے چوتھ[2] وصول کرتے تھے، جو ان کے رحم وکرم پر تھے۔

مرہٹوں کی تاخت صرف فوجی حدود اور عوام کے استحصال ہی کے دائرہ میں محدود نہ تھی، وہ ہندو مذہب وتہذیب کی "احیائیت" (REVIVALISM) پر بھی مبنی تھی، اس تحریک کے قائدِ اول شیواجی کے متعلق ماونٹ رسٹوارٹ الفنسٹن (گورنر بمبئی) اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:-

> "اس کی طبیعت نے ہندوانہ تعصبوں سے تربیت پائی تھی ......
> اس طبیعت پر مجبول ہونے سے وہ مسلمانوں اور ان کے رسم و رواج سے سخت نفرت، اور ہندؤں اور ان کے طور طریقوں سے بڑی رغبت رکھتا تھا، اور یہ ترقی روز افزوں تھی، اس کا یہ مزاج تدبیر ملکی سے ایسا راس آیا تھا کہ اس نے بھگتوں کی صورت بنائی، اور اوتاروں کی کرامتوں، اور دیوتاؤں کی عنایتوں کا دعویٰ کیا"[3]

---

[1] PISSURLEN: PORTUGUESES, II, P. 49

[2] سب سے پہلے شیواجی نے چوتھ وصول کیا جو لگان کا چوتھائی تھا، چوتھ دوسری ریاستوں سے ان کی حفاظت یا حملہ نہ کرنے کے لئے وصول کرتے تھے، جبکہ اپنی مملکت میں کسانوں سے پیداوار کا تیس[۳۰] فی صد لیا کرتے تھے، جو بعد میں بڑھ کر چالیس[۴۰] فی صد ہوگیا تھا۔

[3] تاریخ ہند (اردو ترجمہ) ص ۱۰۴۰ (علی گڑھ ۱۸۶۷ء)

پانی پت کے میدان میں آخری فیصلہ ہونے سے پہلے اور حالات کی نزاکت کا خیال کرکے انھوں نے نواب شجاع الدولہ کی معرفت (جو اس سے پہلے مرہٹوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے) کوشش کی کہ شاہ ابدالی سے صلح ہو جائے، شجاع الدولہ نے ان مسلسل تجربوں اور تلخ حقیقتوں کی بناء پر ان کو جو جواب دیا، اس سے مرہٹوں کے قومی مزاج اور ان کی فتح مندی اور غلبہ کے اثرات ونتائج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہا:-

"دکن کے برہمن ہندوستان پر مدت سے متسلط ہیں، ان کے سر پر وفور طمع وحرص وبدعہدی وبدقولی کے سبب سے یہ بلا شاہ درّانی کی آئی ہے، ایسوں کے ساتھ کیا کوئی صلح کرے جو کسی کی آبرو اور آسائش کے روادار نہ ہوں، سب چیزیں اپنے اور اپنی قوم کے لئے جانتے ہوں، آخر سب ان کے ہاتھوں سے ایسے عاجز ہوئے کہ انھوں نے اپنے پاس ناموس اور حفظ آبرو اور رفاہ خلائق کے لئے شاہ ابدالی کو منتیں کرکے ولایت سے بلایا ہے اور اس کے صدمات کو مرہٹوں کی ایذا رسانی سے سہل سمجھا۔"[1]

بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء (۶ جمادی الآخرہ ۱۱۷۴ھ) کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی افغانی فوجوں، نواب نجیب الدولہ کے روہیلہ سپاہیوں اور نواب شجاع الدولہ کے لشکر کی متحدہ طاقت سے مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی، اور بقول ایک مورخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی"! احمد شاہ ابدالی کی آمد کے محرکات اور پس منظر اور اس فیصلہ کن جنگ کی مزید تفصیلات جس نے تاریخ کے

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۳۰۵

دھارے کو موڑ دیا، شاہ صاحب کے قائدانہ کارنامہ کے سلسلہ میں آئندہ صفحات میں آئیگی۔

سکھ

سکھ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ تھا جس کی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی میں گرو بابا نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء) کے ہاتھوں پڑی، وہ نفس کشی، اخلاقیات اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے "سیر المتاخرین" کے بیان کے مطابق بابا نانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی، اور ان کی بابا نانک پر خصوصی نظر تھی[1]، تیسرے گرو امر داس نے سکھوں کی مذہبی اور معاشرتی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے قدم اٹھایا، اکبر بادشاہ ان کے مکان پر ان سے ملنے گیا، اور انھیں ایک بڑی جاگیر عطا کی، انھوں نے اخلاقیات کی تعلیم میں گرو نانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا، اور ہندوؤں کی اوہام پرستی خصوصاً رسم ستی کی کھلم کھلا مخالفت کی اور نکاح بیوگان کے احکام جاری کئے، اکبر نے ۱۵۷۷ء میں انھیں ایک وسیع قطعہ آراضی عنایت کیا، انھیں کے زمانہ میں امرتسر کے مذہبی مرکز کی بنیاد پڑی، اس طرح سکھوں کی قومی زندگی کے لئے ایک روحانی مرکز تیار ہوگیا۔

۱۵۸۱ء میں گرو ارجن اپنے باپ کے جانشین ہوئے، انھوں نے سکھوں کو

---

[1] بعض روایات کے مطابق بابا گرو نانک متعدد مسلمان درویشوں اور فقیروں کی صحبت میں رہے، ان میں پیر جلال، میاں مٹھا، شاہ شرف الدین، پیر عبد الرحمٰن اور پاک پٹن کے فرید ثانی اور شاہ ابراہیم کے نام خاص طور پر لئے گئے ہیں، بعض روایات کے مطابق بابا نانک نے بغداد، حرمین شریفین کا سفر بھی کیا، شیخ فرید پاک پٹن سے ان کا خاص ارتباط تھا۔

ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کی مزید کوشش کی، اور گرنتھ کی تدوین عمل میں لائے،
گرو ارجن نے اپنے آپ کو "سچا بادشاہ" کے نام سے ملقب کیا جو ان کے سیاسی اقتدار کی
ہوس کا پتہ دیتا ہے، جہانگیر کے حکم سے گرو کو لاہور میں قید کر دیا گیا، اس لئے کہ انھوں نے
اس کے باغی شہزادہ خسرو کی مالی امداد کی تھی، وہاں ان کو قتل کر دیا گیا[1]، ان کے جانشین
ہرگووند نے علانیہ علمِ بغاوت و مزاحمت کا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے سکھوں کی فوجی
زندگی کا آغاز ہوا، انھوں نے جلدی شاہانہ منصب اختیار کر لیا، وہ شہنشاہ جہانگیر
کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتے تھے، اور اپنے باپ کی موت کا اس کو ذمہ دار سمجھتے
تھے، انھوں نے ہرگووند پور کا ایک مضبوط قلعہ بنایا جہاں سے نکل کر وہ میدانی علاقوں
پر تاخت کرتے تھے، جہانگیر نے انھیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد
رہا کر دیا، اور ان کا بڑا اعزاز کیا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد انھوں نے کھلم کھلا
سرکشی اختیار کر لی اور حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اخیر میں وہ پہاڑیوں
کی طرف نکل گئے اور ۱۶۴۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب کے زمانہ میں ہرگووند کے بیٹے تیغ بہادر گرو منتخب
ہوئے، انھوں نے مفروروں اور قانون شکنوں کو پناہ دی، ان کا اقتدار ملک کی ترقی
میں حائل ہوا[2]، شاہی دستوں نے ان پر چڑھائی کی اور انھیں قید کر کے دہلی لے آئے

---

[1] گرو ارجن کو حقیقت میں چندو لال نے ذاتی مخالفت کی بناء پر قتل کرایا تھا، جو جہانگیر کے یہاں
رسوخ رکھتا تھا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان" ج ۹ ص ۵۲

[2] ملاحظہ ہو J.D. CUNNINGHAUM,

A HISTORY OF THE SIKHS GUARD, 1918, P.64

جہاں انھیں اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۷۵ء میں سزائے موت دی گئی[1]، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے گووند رائے کو گرو تسلیم کیا گیا، انھوں نے سکھوں کو جو ابتداء میں محض ایک مذہبی "گن گیان" والی جماعت تھی، ایک جنگجو قوم بنا دیا، انھوں نے سکھوں میں جمہوری مساوات کے جذبات کو ابھارا، اور انھیں ایک قوم کی صورت میں منظم کرنے کا کام کیا، اورنگ زیب کے انتقال تک وہ زندہ رہے، اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے گرو کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی اور انھیں دکن کی فوجی کمان عطا کر دی، لیکن انھوں نے اکتوبر ۱۷۰۸ء میں ایک افغان ملازم کے زخم سے جانبر نہ ہوتے ہوئے انتقال کیا، انھوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا، اور اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ گرنتھ کو وہ اپنا آئندہ گرو، اور خدا کو اپنا واحد محافظ تصور کریں۔

ہرگووند کا جانشین بندہ بیراگی ہوا جس کی اصل حیثیت سکھوں کے فوجی قائد کی تھی، (وہ اصلاً کشمیری راجپوت تھا جس نے سکھ مت اختیار کر لیا تھا) اس نے پنجاب میں وسیع پیمانہ پر رہزنی کی وارداتیں شروع کر دیں، اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ پر بہت سرعت سے زوال آنا شروع ہو گیا، اس کے بیٹوں اور پوتوں کے مابین تخت کے لئے متواتر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، جن کی وجہ سے سکھوں کو کھلم کھلا اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا موقعہ مل گیا، بندہ بیراگی مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں بے رحمی سے قتل کرتا اور قصبہ بقصبہ لوٹتا ہوا دہلی کے عین قرب وجوار میں جا پہونچا، مئی ۱۷۱۰ء میں اس نے سرہند پر دھاوا بول دیا، اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے لئے کھلا چھوڑ دیا، قصبہ کے

---

[1] گرو تیغ بہادر کے قتل کی بھی تنہا اورنگ زیب پر ذمہ داری نہیں، اس میں ان کے مخالفوں کا ہاتھ ہے۔

(نہنگ سنگ سندیس ۲۵ ردسمبر ۱۹۵۱ء)

باشندوں پر (بلا تمیز عمر و صنف) ہیبت ناک مظالم توڑے گئے، بہادر شاہ نے پنجاب کا رخ کیا، شاہی فوجوں نے بندہ کو شکست دی، لیکن بندہ پہاڑیوں کی طرف نکل گیا، فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد سیاسی انتشار اور شاہی خاندان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر بندہ بیراگی نے دوبارہ دہشت انگیزی سے کام لینا شروع کیا، بالآخر ۱۷۱۶ء میں اسے دہلی میں لاکر قتل کر دیا گیا، سکھوں کے نزدیک بھی وہ کوئی محترم و محبوب شخصیت نہیں تھا، اس نے سکھ مذہب کے عقائد و عبادات میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں، اس کی قیادت میں سکھ ایک فوجی طاقت بن گئے، فرخ سیر کے عہد میں پنجاب کے مغل گورنر معین الملک نے (جو میر منّو کے نام سے زیادہ مشہور ہے) فرخ سیر کی تعزیری حکمت عملی کو جاری رکھا، مگر سلطنت مغلیہ کے زوال کی رفتار بہت تیز تھی، پنجاب کی حکومت احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کی وجہ سے زیادہ کمزور ہو گئی تھی، سکھوں کو دوبارہ اٹھنے اور ابھرنے کا موقعہ ملا، وہ نہ صرف احمد شاہ درّانی کے فرزند شاہزادہ تیمور کو جو پنجاب کا حاکم تھا، اور جس نے امرتسر پر حملہ کر کے ہرمندر کو منہدم اور مذہبی تالاب کو ملبہ سے پُر کر دیا تھا، نکالنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ لاہور پر عارضی طور پر قبضہ بھی کر لیا، اور ان کے فوجی سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا، لیکن رگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد (۱۷۵۸ء) پر وہ لاہور سے نکل گئے، احمد شاہ نے پانچویں بار پنجاب کا رخ کیا، پانی پت کی مشہور لڑائی کے بعد جس نے مرہٹہ طاقت کی کمر توڑ دی جونہی اس نے پنجاب چھوڑا، سکھ پھر نکل آئے، اور انھوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی، احمد شاہ پھر واپس آیا، اور لدھیانہ میں (۱۷۶۲ء میں) اس نے سکھوں کو شکست فاش دی، لیکن اس کے جانے کے بعد ۱۷۶۳ء میں سکھوں نے سرہند کو تخت و تاراج کر کے ویران کر دیا، اور ایک بار پھر لاہور پر قبضہ کر کے خالصہ حکومت

کا اعلان کردیا، اس کے بعد سکھ متعدد ریاستوں اور گروہوں میں جس کو مسلین کہتے تھے، منقسم ہوگئے، ان پر کوئی حاکم اعلیٰ متعین نہیں تھا، اور مذہب کے سوا ان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں تھی، تیس ۳۰ سال کی اس غیر مستقل صورتِ حال کے بعد پنجاب میں رنجیت سنگھ کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جنھوں نے ان مخالف گروہوں کو ایک مضبوط سلطنت کی تشکل میں متحد کردیا۔

سکھ مذہب کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی تطہیر تھا، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بابا نانک اسلامی تعلیمات سے متاثر تھے، چنانچہ ان کا عقیدۂ توحید، بنی نوع انسان کی مساوات، اور بت پرستی سے اجتناب وغیرہ اسلام کے اثر کا نتیجہ ہیں[1]۔

سکھوں کے مذہبی ادب کی زبان پر فارسی کے بڑے اثرات ہیں، خصوصاً ادی گرنتھ میں فارسی واسلامی، دینی وصوفیانہ الفاظ کی بڑی آمیزش ہے[2]۔

اس کے پورے قرائن موجود تھے کہ یہ اصلاحی تحریک (اگر اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہتی اور ہندو مذہب و تہذیب میں تحلیل نہ ہوجاتی) ہندوستانی معاشرہ میں کوئی انقلابی خدمت انجام دیتی اور سکھ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل و متمیز فرقہ ہوتا جس کی اساس توحید و مساوات پر ہوتی، اور اس طرح وہ مسلمانوں کے قریب تر مذہبی گروہ ہوتا، لیکن حکومتِ وقت کے ساتھ تصادم، اور سیاسی عمل و ردّ عمل کے بے ضمیر چکر نے جو مذہبی و اخلاقی نتائج سے بے پروا ہو کر وقت کے تقاضوں اور جماعتوں کے مفادات کی تکمیل کرتا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو جپ جی، نیز MACAULFFE ۲: ۳۴۷

[2] تاریخی مواد و معلومات کا بنیادی حصہ "دائرہ معارف اسلامیہ" ج ۱۱ کے مقالہ سکھ سے ماخوذ ہے، جو پروفیسر محمد اقبال کے قلم سے ہے۔

سکھوں کو مسلم حکومتوں ہی نہیں مسلم عوام سے دور و نفور اور ان سے برسر پیکار بنا دیا، اور خصوصیت کے ساتھ بارہویں صدی ہجری اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ان کو ہندوستان کی انتشار انگیز طاقتوں میں ایک اضافہ اور بڑے بڑے شہروں کے پر امن شہریوں کے لئے ایک دہشت انگیز اور زلزلہ خیز طاقت میں تبدیل کر دیا، ان کے دورِ حکومت میں اکثر اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور اقتدار میں خاص طور پر[1] مساجد و مقابر کی بے حرمتی ہوئی، عبادات میں خلل ڈالا گیا، اور وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

خالصہ شمشیر و قرآن را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

اس صورت حال کے خلاف تیرہویں صدی کے تقریباً وسط، اور انیسویں صدی کے ثلث اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) نے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دانش گاہ کے تعلیم یافتہ اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ تھے، رنجیت سنگھ کی فوجی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اس سے اپنے اس وسیع و عمیق منصوبہ اور مہم کا آغاز کیا، جو ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے حکومت شرعی کے قیام اور مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر اور احیائے دین کے لئے شروع کی تھی[2]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول سترہواں باب عنوان "پنجاب میں مسلمانوں کی حالت" ص ۲۱۳-۲۱۹۔

[2] ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" ۱-۲

جاٹ

جاٹ مرہٹوں کی طرح نہ کوئی منظم فرقہ تھے، نہ سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ،
لیکن مغل سلطنت کی کمزوری، سیاسی انتشار اور عام آبادی کے عدم تحفظ کے احساس نے
ان میں ایک طرح کی سلبی و جارحانہ تنظیم پیدا کر دی تھی، اور وہ ایک تخریبی اور انتشار انگیز طاقت بن گئے
تھے، جس کا مقصد قیام سلطنت اور کوئی سیاسی انقلاب نہ تھا محض بگڑے ہوئے حالات
سے عارضی فائدہ اٹھانا، استحصال اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب " شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات"
میں لکھتے ہیں:۔

"جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے، ان کی مشرقی سرحد
چنبل تھی، اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ مرکزی حکومت کا
ناک میں دم آگیا تھا، بقول سرکار، دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت
نہیں کیا جا سکتا تھا (FALL, VOL I.P 369) دہلی سے آگرہ نقل و حرکت
میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو اجمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں،
وہ اسی علاقہ سے گذرتی تھیں۔

بہادر شاہ کے زمانہ میں اس سڑک کی مخدوش حالت کا اندازہ "دستور الانشاء"
کے مطالعہ سے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو دستور الانشاء از یار محمد ص ۱۳) ۱۷۱۲ء میں
جب ڈچ نمائندے اس علاقہ سے گذرے تو انھوں نے بھی ان ہنگاموں کو
دیکھا۔ (.ATER MUGHALS, I.,P. 321)

جان سرمن (JOHN SURMAN) جون ۱۷۱۵ء میں یہاں سے گذرا تھا
اس نے جاٹوں کی امن سوز حرکتوں کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے :۔

(ORME COLLECTIONS, P. 1694)

شاہ جہاں کے عہد میں جاٹوں نے ایک مرتبہ زبردست شورش برپا کی تھی،
۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں متھرا کا فوجدار مرشد قلی خاں ان سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔

سر جدوناتھ سرکار تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم ص ۲۹۶ پر لکھتے ہیں:۔
اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ دو نئے جاٹ
لیڈروں راجہ رام اور رام چہرہ نے اٹھایا........راجہ رام کی قانون شکن
حرکتوں کو آگرہ کا گورنر خانی خاں بھی نہ روک سکا، جاٹوں نے راستے بند کر دیئے،
اور بہت سے علاقوں کو لوٹا، اور اکبر کے مقبرہ کو لوٹنے کے لئے سکندرہ کا رخ کیا
لیکن میر ابوالفضل نے جو وہاں کا فوجدار تھا، بہادری سے مقابلہ کیا، اور باغی
کو آگے نہ بڑھنے دیا، راجہ رام نے مشہور تورانی افسر اصغر خاں کا سامان لوٹا،
......اصغر خاں جاٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔[1]

ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے
پرانی دہلی کو لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر
سے نکل کھڑے ہوئے وہ دربدر، گلی بہ گلی مارے مارے پھرتے تھے، بالکل اس طرح
جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو، پاگلوں کی طرح ہر شخص
پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔" (قلمی نسخہ ص ۱۸۱)[2]

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات، از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۷۵ [2] ایضاً ص ۱۷۷

مولوی ذکاء اللہ صاحب ۱۷۶۵ء کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"آگرہ کے قلعہ میں جاٹوں کا تسلط تھا، دہلی سے ۳۰ میل پر جاٹوں کا عمل دخل تھا، راجہ سورج مل بڑا ہوشیار صف آرائی میں ماہر اور ملک ستانی میں کارداں تھا، اس نے آگرہ سے مرہٹہ سردار کو نکال دیا، اور میوات پر قبضہ کر لیا، چار قلعے نہایت مستحکم بنائے، اس نے دلّی کی سلطنت سے ایسی درخواستیں کرنی شروع کیں، جن سے سلطنت کا نا[illegible] نہ رہے، نجیب الدولہ نے اپنی حسن تدبیر اور بلوچوں کی مدد سے جاٹوں پر فتح حاصل کی، راجہ سورج مل نجیب الدولہ کے مقابلہ میں دہلی کے قریب مارا گیا، اس کے بعد جاٹوں کی ریاست میں بہت سے جھگڑے برپا ہوئے، سورج مل کے دو بیٹے مارے گئے تیسرا بیٹا رنجیت سنگھ راجہ ہوا، اس کے عہد میں جاٹوں کی ریاست کا بڑا عروج ہوا، جس ملک پر وہ فرماں روائی کرتے تھے، اس کے شمال مغرب میں الور اور جنوب مغرب میں آگرہ تھا، اس کی آمدنی دو کروڑ روپے کی تھی، ساٹھ ۶۰ ہزار فوج ان کے پاس تھی۔"[1]

دہلی کی حالت

مرہٹوں، سکھوں، اور جاٹوں کے حملوں سے جو گویا روزانہ کا معمول بن گیا تھا، اور حفاظت و دفاع کی ہر قسم کی طاقت اور اہلیت کے فقدان سے دہلی ایک ایسا پر ثمر اور غیر محفوظ درخت بن گیا تھا جس پر ہر طرف سے غول بیابانی حملہ کرتا اور اس کو برگ و بار سے محروم کر دیتا، دہلی کے باشندے جو ساری سلطنت میں نہ صرف عزت و احترام کی

---

[1] مختصراً از "تاریخ ہندوستان" از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔ جلد نہم ص ۳۱۶-۳۱۸

نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، بلکہ علم، زبان، تہذیب، شرافت اور عادات واطوار میں بھی معیار سمجھے جاتے تھے، حملہ آوروں کے لئے "خوانِ یغما" بن گئے تھے، اس عہد کے علماء ومشائخ کے (جن کا شعار انقطاع الی اللہ اور رضا بالقضاء ہے) خطوط سے بھی جو انھوں نے اپنے معتقدین واحباب کو لکھے ہیں، اس بدامنی، بے اطمینانی اور بے یقینی کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں پر صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نامور معاصر، اور سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کے گلِ سرسبد حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۱ھ - ۱۱۹۵ھ) کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام[1]۔	دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں اور بے اطمینانی سے تنگ آگیا ہوں۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں :-

از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند[2]۔	ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے۔

ایک اور مکتوب میں دار السلطنت کی بدامنی اور اہل شہر کی پریشان حالی کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں :-

احوال مردم شہر از بیماری عام وناایمنی تا کجا نویسد، خدا ازیں بلدہ مورد غضب الٰہی برآرد کہ نسقے در امور سلطنت نماندہ خدا خیر کند[3]۔	عام بیماری اور بدامنی سے اہل شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے، خدا اس شہر سے جو غضب الٰہی کا مورد ہو رہا ہے باہر نکالے کہ امور سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا

۱؎ کلمات طیبات، مکتوب ۴۰ ۲؎ ایضاً ۵۴ ۳؎ ایضاً ۸۶

خدا اپنا فضل فرمائے۔

حملۂ نادری

شاہ صاحب ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے دلّی پہونچے تھے، پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء میں نادرشاہ کا دلی پر وہ حملہ ہوا، جس نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی چولیں ہلا دیں اور دلّی کی خاک اڑا دی۔ حملہ نے دلّی کے غیرت مند شہریوں اور شریف خاندانوں کے دل ودماغ پر وہ اثر ڈالا کہ وہ زندگی سے بیزار و شرمسار اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کے لئے تیار تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قتل عام اور عزت وناموس کی بربادی کے موقعہ پر پرانی دلّی کے شرفاء، پرانے راجپوتوں کے دستور کے مطابق "جوہر[1]" کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے، اس موقعہ پر والد ماجد (شاہ ولی اللہ صاحب نے) مسلمانوں کو واقعۂ کربلا، اور سید نا حسین رضؓ کے مصائب یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھا کہ انھوں نے ان لرزہ خیز اور ناقابل تصور مصائب کے باوجود صبر ورضا کی راہ اختیار کی اور خاکم بدہن، خویش کشی اور خودکشی کا ارادہ نہیں کیا۔

ناساعد وزلزلہ انگیز حالات میں تدریس وتصنیف کی یکسوئی

مرہٹہ گردی، جاٹ گردی، سکھ گردی اور نادر گردی کے ہوش رُبا مصائب اور زلزلوں

---

[1] جب راجپوت شرفاء ہر طرف سے گھِر جاتے تھے اور باعزت زندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا تو اپنے اہل وعیال کو تہہ تیغ کر کے جلتی ہوئی آگ میں پھاند جاتے تھے۔

کے درمیان جو دلی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتے تھے، اور جن میں بعض اوقات نقل مکانی بھی کرنا پڑا،
"القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۳ھ کے درانی فتنہ میں شاہ صاحب خدام کی استدعا پر
وطن مالوف سے معہ اہل خانہ و متعلقین منتقل ہو کر قصبہ بڈھانہ میں تشریف لائے، جب رمضان کا
مہینہ آیا، تو معمول قدیم کے مطابق ایک چلہ کا اعتکاف بھی فرمایا[1]، شاہ صاحبؒ درس، تصنیف،
دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس و تربیتِ طالبین کا کام اس جمعیت خاطر اور اس اہتمام و انصرام
کے ساتھ کرتے رہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی ہی نہیں سارے ہندوستان میں معتدل و پرسکون حالات
ہیں، اور وہ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، فکری رہنمائی اور اخلاقی تربیت اور
احیائے ملت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی خوبی اور بلاغت
کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"ایسے کم مصنف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانہ کی روح نہ ہو، یا اس میں
زمان و مکان کی جھلک نہ ہو، اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدر شناسی اور
اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان و
مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلۂ و شکایت اور حرف و حکایت سے سراپا بے نیاز
ہیں، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا، کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جب امن و اطمینان
اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا، سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی،
سیاسی بدامنی، اور ہر طرح کے شور و شر میں مبتلا تھا، دلی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی
تھی، ہر شمشیر زن اپنی بادشاہی کا خواب دیکھ رہا تھا، سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری
طرف، جاٹ تیسری طرف، اور روہیلے چوتھی طرف، ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے،

---

[1] القول الجلی (قلمی)

اور نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے پرجوش سپہ سالار خیبر کے دروازہ کے پاس کھڑے جب چاہتے تھے، آندھی کی طرح آجاتے، اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے، اس درمیان میں دلّی خدا جانے کتنی دفعہ لٹی اور کتنی دفعہ بنی، مگر اللہ رے دلّی کے تاجدارِ علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانہ کا گلہ، نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر و رضا کے جس لامکان میں تھے، وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہونچتیں، اور زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنا کام نہیں کرتیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سچے اہل علم کی شان کتنی بلند، اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ ہاں اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (الرعد-۲۸)

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اس لئے اگر وہ بھی قلب میں اطمینان، اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجب نہیں، شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے، آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پُرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا، کہ علم و فضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے۔[1]

---

[1] شاہ ولی اللہؒ نمبر "الفرقان" ص۳۴۸-۳۴۹

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

صرف یہی نہیں کہ شاہ صاحب مصائب و حوادث کے اس گرد و غبار، بلکہ ان کی موسلا دھا بارش کے درمیان زیر آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف و تحقیق اور درس و تعلیم میں اس طرح منہمک تھے کہ نہ ہوا کے تیز جھونکے سے زیر تسوید کتاب کا کوئی ورق الٹتا تھا، نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا، بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے، اور ایک فرض شناس، حقیقت پسند، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کی محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی مستحکم و خوش حال سلطنت کے قیام کے لئے بھی ساعی اور سرگرم تھے، اور اس سلسلہ میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے، جو بڑے سے بڑا سیاسی مُبصّر ادا کر سکتا تھا، جس کو تصنیف و تالیف، اور درس و تحقیق سے ادنیٰ مناسبت اور ذرّہ برابر فرصت نہ ہو۔

مجدّدین اور داعیانِ اسلام، اور محققین و مصنّفین میں اگر کسی کی زندگی میں یہ مماثلت نظر آتی ہے تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی زندگی میں، جنھوں نے ۷۰۰ھ میں شام کے مسلمانوں کو خون آشام تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور ان کے اکھڑتے ہوئے قدم جمائے، پھر جب سلطان مصر محمد بن قلاوؤن نے شام آکر تاتاریوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اہل شام میں سخت انتشار اور اضطراب پیدا ہوا، تو وہ خود مصر گئے اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا، اور سلطان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی، اور تاتاریوں کو ایسی شکست فاش ہوئی جس کی مثال ان کی گزشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۲ ص ۴۷-۵۴

شاہ صاحب نے بھی اپنے علمی مشاغل اور احیاء و تجدید کی مساعی کے ساتھ ایسے سیاسی تدبّر، اور ایسی ذہانت اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا امرائے سلطنت میں ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو ہندوستان نہ صرف تنگ نظر اور انتشار پسند ملکی حوصلہ آزماؤں سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ انگریزوں کے اس تسلّط سے بھی محفوظ ہو جاتا جس نے انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کو کمزور اور میدان کو خالی پاکر اپنے قدم جمالئے، اور اس کو برطانوی سلطنت میں نہ صرف شامل کیا، بلکہ اس سے وہ قوت اور وسائل حاصل کئے، جس نے دنیا کی پوری سیاست پر اثر ڈالا، اور مسلم اور عرب ممالک پر اپنا اقتدار جمایا۔

شاہ صاحب کی اس جمعیتِ خاطر، ہمت و استقامت، بلند نگاہی و اولوالعزمی اور اس کے مقابلے میں ملک کی زلزلہ انگیز فضا کو دیکھتے ہوئے (جس میں نہ کسی سنجیدہ اور عمیق و مسلسل مشغولیت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نہ کسی انقلابِ حال اور عروج بعد زوال کی امید) اقبال کا یہ شعر حقیقت حال کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے ؎

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

شاہ صاحبؒ کا احساس و اضطراب

شاہ صاحب جنھوں نے ابتدائے سن شعور میں اورنگ زیب عالمگیر کے دبدبۂ حکومت و اقبال سلطنت کے آثار دیکھے تھے، اور اس سے پہلے کے (جب سلطنت مغلیہ کا ستارۂ اقبال بلند اور جاہ و جلال قائم تھا) قصے دہلی کے بزرگوں اور اہل خاندان سے سُنے تھے، اور جن کے قلم سے خلافتِ راشدہ کے کارنامے اور تاریخ اسلام کے عہد زرّیں کے تابناک نقوش،

اسلامی حکومت کے فرائض و ذمہ داریوں اور اس کے ساتھ خدا کی مدد اور نصرت کی تفصیل ازالۃ الخفا کے صفحات پر ثبت ہوئی تھی، ان کی آنکھوں نے مغلیہ سلطنت کے عہد زوال اور فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ کی بدنظمی، طوائف الملوکی، [illegible] کی بدامنی، [illegible] مذہب و ملت اہل ملک کی جان و مال، عزت و آبرو کا عدم تحفظ اور انسانی خون کی ارزانی، شعائرِ اسلام کی بے حرمتی، اور مسلمانوں کی (جو چھ سو سال سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے) مجبوری اور بے بسی کا نظارہ دیکھا تو ان کا حساس و دردمند دل خون کے آنسو رویا، اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان خطوط کے صفحات پر جو انھوں نے اپنے زمانہ کے بعض اہلِ دُول اور معتمدین کو لکھے ہیں ٹپک پڑے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ایک معاصر بادشاہ کے نام[1] سورج مل جاٹ کے دور دورہ اور اسلام کی غربت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

ازاں باز شوکت سورج مل افزونی	اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت
یافت واز دو کروہ دہلی گرفتہ	ترقی پا گئی دہلی سے دو کوس کے فاصلے
تا اقصیٰ اکبر آباد طولاً واز حدود	سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں
میوات تا فیروز آباد و شکوہ آباد	اور میوات کے حدود سے فیروز آباد
عرضاً متصرف شد و اذان و صلاۃ	اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل
مفقود و کسے نہ کہ برپا دارد۔[2]	قابض ہو گیا کسی کی طاقت نہیں کہ
	وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔

---

[1] جیسا کہ آگے آئیگا اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے نام لکھا گیا ہے۔

[2] مکتوب بہ بعض سلاطین (شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات — پروفیسر خلیق احمد نظامی ص۱۵)

اسی مکتوب میں ایک آباد و مردم خیز شہر بیانہ کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

شہر بیانہ را کہ شہر قدیم اسلام بود	شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر
و علماء و مشائخ از مدت ہفت صد	تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ
سال در آں جا اقامت داشتند	سات سَو سال سے اقامت پذیر
قہراً و جبراً متصرف گشتہ ہمہ	تھے، اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ
مسلمانان را بخواری اخراج نمودند[1]	کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری
	کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔

ملازمین شاہی جن کی تعداد لاکھ سے اوپر تھی کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

چوں خزانۂ پادشاہ نماند نقدی	جب خزانۂ بادشاہ نہیں رہا،
ہم موقوف شد آخر حال ہمہ از	نقدی بھی موقوف ہوگئی، آخر کار
ہم پاشیدند، و کاسۂ گدائی در	سب ملازمین تتر بتر ہو گئے، اور
دست گرفتہ اند و از سلطنت	کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا،
بجز نامے باقی نماند۔[2]	سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ
	باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا حال لکھتے ہوئے ان کے قلم سے یہ موثر جملہ نکل گیا ہے:۔

بالجملہ ایں جماعت مسلمین قابل ترحّم	غرض کہ جماعت مسلمین قابل رحم
اند۔[3]	ہے۔

نواب نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] ایضاً ص۹ [2] ایضاً ص۱۱ [3] ایضاً ص۱۱

مسلمانانِ ہندوستان چہ دہلی وچہ غیر آں چندیں صدمات دیدہ اند، وچند بار نہیب وغارت آزمودہ کار باستخواں رسیدہ است، جائے ترحم است[1]۔	مسلمانانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کے شکار ہوئے ہیں "چاقو ہڈی تک پہونچ گیا ہے" رحم کا مقام ہے۔

شاہ صاحب حقائق و واقعات اور مؤثر اور طاقتور اسباب پر نظر کر کے یقینی نتائج اور مستقبل قریب کی اس طرح پیشین گوئی کرتے ہیں، جس میں قیاس و ذہانت کا دخل نہیں محض حالات کا غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ ہے :۔

اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ بہمیں مرتبہ ماند مسلماناں اسلام فراموش کنند واندکے از زماں نہ گذرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را[2]۔	اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ نہ گذرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائیگی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔

مغل بادشاہوں اور ارکان سلطنت کو نصیحت و مشورہ

شاہ صاحبؒ نے خاندان مغلیہ کے سلاطین کے عروج وزوال اور ان کے اسباب کا

---

[1] مکتوب ہفتم بطرف نجیب الدولہ ص۲۲-۲۳ [2] ایضاً ص۱۲

بغور مطالعہ فرمایا تھا، (جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے جو باب ہفتم میں گزر چکا ہے) سلطنت مغلیہ کے علاوہ انھوں نے دوسری اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی دقّت نظر سے پڑھی تھی، اور اس سے انھوں نے وہ حکیمانہ نتائج اخذ کئے تھے، جو قرآن مجید کا ایسا ہی حامل اور عالم اخذ کر سکتا ہے، جو خدا کے قانون مجازاۃ اور سنت اللہ سے واقف ہے، ان سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ اس خاندان کا مزاج طویل موروثی سلطنت، اسباب عیش و عشرت کی فراوانی، اور خود غرض، مصاحبین، اور مشیران سلطنت کی کوتاہ نظری سے فاسد ہو گیا ہے، اور بیماریاں اس کے جسم میں جڑ پکڑ گئی ہیں، وہ عرب فلسفی مورخ علّامہ ابن خلدون کے اس حکیمانہ مقولہ سے بھی بے خبر نہ تھے کہ "إن الهرم إذا نزل بالدولة لا يرتفع"[1] (جب کوئی سلطنت بوڑھاپے کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا از سر نو جوان ہونا (عام طور پر) ممکن نہیں ہوتا۔)

لیکن صحیح فکرمندی، سچی طلب اور دل سے لگی ہوئی بات انسان کو ایسی جگہ بھی قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے، جہاں کامیابی کی امید موہوم بھی ہو، جس مسافر پر تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے، اور جان لبوں پر آجاتی ہے، ہنر اور عقل و دانائی اور تجربوں کے باوجود بھی اس کے قدم پانی کی امید میں چشمۂ سراب کی طرف بے اختیارانہ اُٹھ جاتے ہیں کہ عقل کی خود فریبی سچی پیاس کی علامت ہے، عرفیؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

زنقصِ تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گراز جلوۂ سراب نخورد

(سچی پیاس کی کمی کو اس کا سبب سمجھ، اپنی عقل پر ناز نہ کر اگر تیرے دل نے (جان بوجھ کر بھی)

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمۃ ابن خلدون فصل إن الهرم اذا نزل بالدولة لا يرتفع ص ۲۰۶

سراب کی ظاہری چمک دمک سے دھوکا نہیں کھایا۔)

لیکن انسان، پھر ایک ایسے خاندان کا معاملہ جس نے صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کی تھی، ایک بے جان اور جامد سراب سے بہر حال مختلف ہے، اور اس سے یہ توقع کرنی بے جا نہیں کہ اس میں پھر کوئی باحمیّت اور صاحبِ عزیمت مردِ میدان پیدا ہو سکتا ہے، جو حالات کا رُخ بدل دے اور جاں بلب سلطنت میں زندگی کی نئی روح پھونک دے، شاہ صاحب اپنے عہد کے قرآن مجید کے بڑے رمز شناس اور غوّاص تھے، ان کے سامنے قرآن کی یہ آیت تھی:۔

تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ	تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا اور
فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ	تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے
وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ	اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا
مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ٥	کرتا ہے، اور تو ہی جاندار سے بے جان
(آل عمران - ۲۷)	پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے
	بے شمار رزق بخشتا ہے۔

اسی بنا پر شاہ صاحب نے قلعۂ معلّٰی کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی اپنے زمانہ کے ایک مغل بادشاہ[1] کو خط لکھا ہے، جس میں اس کو اصلاح حال، تقویت سلطنت، اور خدا کی رحمت و نصرت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایسے حکیمانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے گئے ہیں، جو اعلیٰ درجہ کی حکمت دین، تاریخ و سیاست اور نظم مملکت کے عمیق و وسیع مطالعہ پر مبنی ہے، شروع ہی میں لکھا ہے کہ:۔

امیدواری از فضل حضرت باری　　　اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

---

[1] افسوس ہے کہ اس مغل بادشاہ کا نام (جس کے نام یہ اہم خط لکھا گیا ہے) معلوم نہیں ہو سکا۔

آنست کہ اگر بموجب ایں کلمات	امید ہے کہ اگران کلمات کے بموجب
عمل کنند تقویت امور سلطنت	عمل کریں گے تو امور سلطنت کی
وبقائے دولت، ورفع منزلت	تقویت، حکومت کی بقاء اور
بظہور می رسد فردے	عزت کی بلندی ظہور پذیر ہو گی۔
درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند	شاعر کہتا ہے۔
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم[1]	کہ مجھکو آئینہ کے پیچھے طوطی کے مانند
	رکھا ہے، جو کچھ استاد ازل نے کہا ہے
	وہی کہتا ہوں۔

اس خط میں جو بادشاہ وقت، اس کے وزیر اور امراء سلطنت کو لکھا گیا ہے، چند نہایت دانشمندانہ، سیاسی وانتظامی مشوروں کے بعد جن کے بغیر سلطنت کا قیام، رعیت کا رفاہِ عام اور لوگوں کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا، آخر میں لکھا ہے کہ قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کو رشوت ستانی کی تہمت نہ لگی ہو، اور وہ مذہب اہل سنت والجماعت کے ہوں، نیز یہ کہ ائمۂ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے، نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید کی جائے، اور اس کا پورے اہتمام کے ساتھ اعلان کیا جائے کہ ماہ رمضان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے، آخر میں یہ کہ بادشاہ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش وعشرت میں مشغول نہ ہوں، گذشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں، اگران کلمات پر عمل کیا جائیگا تو مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہو گی "وماتوفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب[2]"

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول بجانب بادشاہ ووزیر وامراء۔

[2] ملاحظہ ہو سیاسی مکتوبات صفحہ ۱۸

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو ایک جیّد عالم دین، شارحِ قرآن وحدیث اور وقت کے مصلح اور مجدّد کو ادا کرنا چاہئے تھا، جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ اور ان خطرات سے باخبر ہے جو صرف حکمراں خاندان ہی کے سر پر نہیں، پورے اہل ملک کی گردنوں پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہے تھے، شاہ صاحبؒ نے اپنے اسلاف کے اتباع اور ربانیین امت کے دستور کے مطابق سرکار دربار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھا تھا، اور اپنے بوریائے فقر پر متمکّن رہے تھے لیکن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے جانشین حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی طرح ان کا دل حکومتِ وقت اور اس کی صحیح رہنمائی کے لئے دعا میں مشغول تھا، اور ان لوگوں کو جو اس مرکز علمی وروحانی سے تعلق رکھتے تھے، وہ زبان وقلم سے صحیح مشورہ دینے میں کسی بخل اور احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے، ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ خود اچانک شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دعا کی درخواست کی، اپنے محبوب ومعتمد مرید مسترشد اور برادر نسبتی شاہ محمد عاشق پھلتی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جمعرات کے دن بادشاہ حضرت نظام الدین اولیاء اور دیگر مشائخ کے مزارات کی زیارت کرنے کے لئے سوار ہو کر گیا تھا[1]، مجھے پہلے سے اطلاع دیئے بغیر کابلی دروازہ سے سادہ تخت پر سوار ہو کر غریب خانہ پر وارد ہوا، فقیر کو کوئی اطلاع ہی نہ تھی، مسجد میں بوریوں پر آکر بیٹھ گیا، اس قدر توقیر سلطان کرنا لازم ہوئی کہ فقیر جس مصلّے پر بیٹھتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے، اس کو اس طریقہ سے بچھا دیا گیا کہ اس کی ایک جانب بیٹھ گیا اور دوسری جانب بادشاہ، بادشاہ نے اول مصافحہ کیا بڑی تعظیم کے ساتھ بعد ازاں کہا، میں مدت سے آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا، لیکن آج اس جوان کی رہنمائی میں

---

[1] افسوس ہے کہ مکتوب میں اس بادشاہ کا نام درج نہیں، اور نہ کسی اور ذریعہ سے اس کی وضاحت ہو سکی۔

یہاں پہونچا ہوں، اشارہ وزیر کی طرف کیا پھر کہا کہ غلبۂ کفر، اور رعیت کا تفرقؔ و انتشار اس درجہ پر پہونچ گیا ہے کہ سب کو معلوم ہے، چنانچہ مجھے تو سونا، اور کھانا پینا دوبھر اور تلخ ہو گیا ہے، اس بارہ میں آپ سے دعا مطلوب ہے، میں نے کہا کہ پہلے بھی میں دعا کرتا تھا اور اب تو انشاء اللہ اور زیادہ دعا میں مشغول رہوں گا۔

اسی دوران میں وزیر نے مجھ سے کہا کہ حضرت بادشاہ پانچوں وقت کی نماز کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں، میں نے کہا الحمدللہ! یہ وہ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد سننے میں آرہی ہے، ورنہ ماضی قریب کے بادشاہوں میں سے کسی میں یہ نماز کی پابندی سننے میں نہیں آئی تھی۔"[1]

آخر میں شاہ صاحبؒ نے بادشاہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ وصیت سنائی جو انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ بناتے وقت فرمائی تھی:۔

"خلیفہ کو بھی عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہیں، اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی، ان تمام مشکلات کا بس ایک ہی علاج ہے کہ مرضیاتِ حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جائے، اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے۔"[2]

شیخ محمد عاشق کے نام ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ[3] اور اس کی والدہ آئے تھے، پہلے مسجد میں زنانہ کا انتظام کیا گیا، اس صورت سے بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے،

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۳۵-۱۳۶ [2] ایضاً ص۱۳۶-۱۳۷ [3] یہاں بادشاہ سے احمد شاہ مراد ہے جو محمد شاہ کا فرزند و جانشین تھا ۱۱۶۱ھ میں تخت نشین ہوا۔

تقریباً تین ۳ یا ۴ گھنٹے رہے، کھانا بھی کھایا، اس کی زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی بھلائی کی کاروائیوں اور ہمدردی چاہنے سے متعلق تھیں۔[1]

لیکن ظاہر ہے کہ حکمران خاندان کا زوال طویل موروثی سلطنت کے اثرات اور بیرونی مخالفتیں اور سازشیں اس درجہ کو پہونچ گئی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صاحب عزم اور نگ نشین بھی تنہا اس زوال کو عروج سے، کمزوری کو نئی طاقت اور توانائی سے بدل کر پورے ملک کے حالات میں انقلاب نہیں لا سکتا تھا، تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کا زوال اپنے آخری حدود تک پہونچ جاتا ہے، اور مخالفتوں اور سازشوں کی سنگیں سلطنت کو بارود کی طرح اڑانے کے لئے تیار ہوتی ہیں، تو بڑے سے بڑا قوی الارادہ جفاکش اور صاحب صلاح بادشاہ بھی سلطنت کے جسم میں زندگی کی نئی روح پھونکنے میں ناکام رہتا ہے، متعدد بار ایسا پیش آیا کہ حکمراں خاندان کا آخری آدمی جس کے زمانہ میں سلطنت کا انقراض پیش آیا، اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا، اور اس نے سلطنت کو سقوط سے بچانے کی جانبازانہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا، بنی مروان کے خاندان اور بنی امیہ کی سلطنت کے آخر میں مروان ابن محمد معروف بمروان الحمار (م ۱۳۲ھ) اور خلفائے عباسیہ کے خاندان کا آخری فرمانروا مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) اور کسی حد تک تیموری خاندان کا آخری فرمانروا ابوظفر بہادر شاہ (م ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) اس کی چند مثالیں ہیں۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شاہ صاحبؒ کا جیسا بالغ نظر مصلح، وسیع النظر مؤرخ اور فراست ایمانی کا حامل برائے نام مغل فرمانرواؤں اور ان کے امرائے دربار سے رابطہ قائم کرنے، ان کے اندر... حمیت ملی و غیرت دینی بیدار کرنے، بگڑے ہوئے حالات اور

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۱۱

انتشار انگیز طاقتوں سے پنجہ آزمائی پر آمادہ اور تیار کرنے پر اکتفا نہ کرے، شاہ صاحبؒ نے درباری امراء کے محدود حلقہ سے باہر نکل کر ان امرائے سلطنت آزمودہ کار قائدین افواج اور عالی حوصلہ سرداروں سے خط و کتابت کی جن کے خاکستر میں ان کو دینی حمیت اور قومی عزت کی کوئی دبی ہوئی چنگاری نظر آئی، ان میں حسب ذیل امرائے سلطنت اور قائدین تھے، وزیر مملکت آصف جاہ[1]، نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی[2]، عماد الملک وزیر، تاج محمد خاں بلوچ، نواب مجد الدولہ بہادر[3]، نواب عبید اللہ خاں کشمیری، میاں نیاز گل خاں، سید احمد روہیلہ۔

لیکن شاہ صاحب کی نگاہ انتخاب و اختصاص (جس کے ساتھ فراست ایمانی اور الہام ربانی شامل معلوم ہوتا ہے) اس عہد کی دو عظیم شخصیتوں پر پڑی جن میں سے ایک ہندوستان کے اندر کی تھی اور ایک باہر کی، ہماری مراد امیر الامراء نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان سے ہے۔

نواب نجیب الدولہ

نواب نجیب الدولہ[4] میں وہ تمام صفات و خصائص پائے جاتے تھے، جو عہد قدیم میں بانیان سلطنت کی خصوصیت ہیں، اور جنھوں نے شخصی سلطنتوں اور خاندانوں کے عروج و اقتدار کے عہد میں (جب ذاتی جوہر اور وفاداروں کی جمعیت کا فراہم ہو جانا

[1و2] مجموعۂ مکتوبات حضرت شاہ عبد الرحیم و حضرت شاہ ولی اللہؒ (قلمی) محفوظ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد مخطوطات ص۲۱۴ [3] ان کے نام چار خط ہیں ملاحظہ ہوں "حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات" ص۷-۶۶ [4] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نجیب التواریخ" از نصیر الدین (قلمی نسخہ حبیب گنج) مختصر حالات کے لئے "شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات" ص۲۳۱-۲۳۴

فتح اور قیام سلطنت کے لئے کافی ہوتا تھا) اہم کردار ادا کیا ہے، اور ان کے ہاتھوں کسی فتح و تسخیر کے کسی کارنامہ کا ظہور ہوا ہے، ان کے اندر اپنے ولیِ نعمت کے ساتھ وفاداری کا جوہر اپنے رفیقوں اور ماتحتوں کے ساتھ شرافت و احسان کی خو، سپہ گری کا جوہر و شجاعت اور قائدانہ صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، لیکن تاریخی تجربہ یہ ہے کہ یہ صفات و کمالات جنگی طاقتوں کو شکست دینے اور ملک فتح کرنے میں تو کامیاب ہو جاتی ہیں، لیکن ایسے ماحول میں جس میں غدّاری اور کورنگی کو "فنِ شریف" کا درجہ دیا جائے، بے اصولی و بے کرداری کو اعلیٰ درجہ کی سیاست سمجھا جائے، اور موقع سے فائدہ اٹھانے کو دانشمندی اور دور اندیشی تصور کیا جائے، اکثر مفید بننے کے بجائے کامیابی میں حارج اور مشکلات پیدا ہونے کا باعث بنتی ہیں، بدقسمتی سے نواب نجیب الدولہ اور آصف جاہ نظام الملک کو ایسا ہی فاسد ماحول ملا تھا، مؤرخین اس کے اعلیٰ کردار اور سپاہیانہ و قائدانہ صلاحیت کی تعریف میں یک زبان ہیں سر جادوناتھ سرکار لکھتا ہے :-

"ایک مؤرخ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی، یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہ یا صحیح رائے کی، یا اس کی اس فطری صلاحیت کی جو اس کو انتشار و ابتری میں ایسی راہ دکھاتی تھی جس سے نتیجہ اس کے موافق نکل آتا تھا"[1]

مولوی ذکاء اللہ دہلوی تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں :-

"نجیب الدولہ ایسا عاقل، ہوشیار و دانشمند تھا کہ کمتر ہوتے ہیں، امانت داری

---

[1] SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, VOL-II, P 416

(ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص۲۳۲)

ایمانداری تو اس وقت میں اس پر ختم تھی، وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خاں روہیلا اور نواب شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کئے جاتا تھا، ملہر راؤ ہلکر سے بھی اس کا ساز باز چلا جاتا تھا، یاد ہوگا یہ مرہٹہ پانی پت کی لڑائی سے اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، غرض یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نباہ رہا تھا۔"[1]

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:۔

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود	نجیب الدولہ کے یہاں نو سو
ادنی پنج روپیہ اعلیٰ پنج صد روپیہ[2]	عالم تھے، جن میں سے سب سے نیچے درجہ والے کو پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچ سو روپیہ ملتے تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول "۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک وہ دہلی کی سب سے بڑی شخصیت تھی، تمام سیاست اس کے گرد گھومتی تھی اور وہ سارا نظام حکومت اپنے کاندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا۔"[3]

شاہ صاحبؒ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی و حقیقت پسندی کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا جو ان لوگوں کو عطا ہوا کرتا ہے جو تاریخ اصلاح و تجدید اور کارِ آدم گری و مردم سازی میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں، قحط الرجال کے اس عہد میں جو حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں سے بھرا ہوا تھا اپنے کام کی تکمیل و مدد لینے میں نجیب الدولہ کا انتخاب کیا اور ان کی دوربین و باریک بین نگاہ نے اس جوہر قابل اور اس کے اندر دینی حمیت کو دیکھ لیا،

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۱۵ [2] ملفوظات ص ۱۸ [3] سیاسی مکتوبات ص ۲۳۲

شاہ صاحب نے ان سے مراسلت شروع کی اوران چنگاریوں کو فروزاں کرنے کی کوشش کی جوان کی خاکستر میں دبی ہوئی تھیں، وہ ان کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

خدائے عز وجل آں امیر المجاہدین را بنصر ظاہر وتائید باہر مشرف کناد، واین عمل را بعز قبول رسانیدہ ثمرات عظیم وبرکات جسیم برآں مرتب گرداناد۔	خدائے عز وجل امیر المجاہدین کو نصرت ظاہر اور تائید واضح کے ساتھ مشرف کرے اوراس عمل کو قبولیت کے درجہ میں پہونچا کر بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام محبت شام واضح آنکہ دعائے نصر مسلمین کردہ می شود واز سروش غیبی نفحات قبول شنیدہ می شود امید انست کہ خدائے تعالےٰ بر دست ایشاں احیاء طریقۂ جہاد فرمودہ برکات آں عاجلاً وآجلاً نصیب کند۔	فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت شام واضح ہو کہ نصرت مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جارہی ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں امید یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ آپکے ہاتھ پر دینی جہد وجہاد کو زندہ کرکے اس کے برکات اس دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔
إنہ قریبٌ مجیبٌ [1]	إنہ قریب مجیب۔

ایک دوسرے خط میں ان کو "امیر الغزاۃ اور رئیس المجاہدین" کے لقب سے یاد فرماتے ہیں [2]، ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۹ [2] ایضاً صـ۲۰

"معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ اور امداد امت مرحومہ کا کام آپ ہی کے ذریعہ انجام پائے گا جو اس کار خیر کا سرچشمہ اور ذریعہ ہے' آپ کسی طرح کے وساوس وخیالات کو دل میں جمنے نہ دیں انشاء اللہ تمام کام دوستوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق انجام پائیں گے"[1]

شاہ صاحب نواب نجیب الدولہ کے نام خطوط میں دعاؤ تہنیت پر اکتفا نہیں کرتے ان کو بڑے مفید بنیادی مشورے بھی دیتے ہیں' اور ان غلطیوں اور واقعات کے اعادہ سے محتاط و محترز رہنے کی تلقین بھی فرماتے ہیں جو اس سے پہلے حملہ آوروں اور مسلمان افواج سے ظہور پذیر ہوئے اور جو خدا کی نصرت و تائید سے مانع بن جاتے ہیں ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"جب افواج شاہی کا گذر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام واہتمام ہونا چاہئے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے' دہلی والے کئی مرتبہ لوٹ مار' ہتک عزت' اور بے آبروئی کا تماشہ دیکھ چکے ہیں' اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر پیش آرہی ہے' آخر ین مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو تشنۂ تکمیل تھے' وہ مکمل ہو جائیں تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں تعرض نہ کرے"[2]

شاہ صاحب متعدد خطوط میں ہندوستان کی' ان تین انتشار پسند اور جنگجو طاقتوں کے خطرہ اور ملک کو ان کے گزند سے محفوظ کر دینے کی ضرورت کی طرف بار بار متوجہ فرماتے ہیں (جن کا ذکر اس باب کے آغاز میں موجود ہے) کہ اس کے بغیر ملک میں نظم ونسق' امن وامان' شعائر دینی ومعابد کی حفاظت اور معتدل معمول کے مطابق (NORMAL) زندگی گزاری نہیں جا سکتی'

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۲۸ [2] ایضاً صـ۲۱

ان کی وجہ سے سارا ملک مستقل طور پر حالت جنگ اور عسکری نظام کی صورت میں زندگی گذار رہا ہے[1]

شاہ صاحبؒ کو نواب نجیب الدولہ سے ایسا تعلق خاطر معلوم ہوتا ہے اور وہ ان سے ایسی توقعات رکھتے ہیں کہ بار بار اس کی تاکید فرماتے ہیں کہ جب وہ اس مقصد کے لئے عنان عزیمت اٹھائیں تو شاہ صاحب کو اس کی ضرور اطلاع کریں تاکہ وہ دعا میں مشغول ہوجائیں[2]، نیز ان کو بار بار فتح و کامیابی کی امید دلاتے ہیں اور اس کی پیشین گوئی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ:-

"فقیر کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے[3]"

شاہ صاحبؒ نے نواب نجیب الدولہ ہی کو احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کے لئے خاص ذریعہ بنایا ان کے نام براہ راست خط لکھنے کے علاوہ جو آئندہ صفحات میں آرہا ہے ان سے بھی خطوط لکھوائے اور ان کو بار بار تاکید کی، نواب نجیب الدولہ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد رجب ۱۱۸۴ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء) کو انتقال کیا پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی عدل گستری و بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے اپنے فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپڑ کے مقام پر تھیں اور گڈھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلہ میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے[4]"

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ششم و ہفتم سیاسی مکتوبات ص۲۱۔۲۱ [2] ملاحظہ ہو مکتوب ہشتم و نہم سیاسی مکتوبات ص۲۵۔۲۷ [3] مکتوب ہشتم ص۲۴۔۲۵ و مکتوب نہم ص۲۶

[4] سیاسی مکتوبات ص۲۳۴ بحوالہ سرکار ج م ص۴۱۵

احمد شاہ ابدالی

شاہ صاحبؒ نے اپنی بالغ نظری، ہندوستان کی صورت حال کے حقیقت پسندانہ مطالعہ ارکان سلطنت اور امراء دربار کی بے کرداری اور حکمراں خاندان کی روز افزوں نااہلی سے دو حقیقتیں ایسی سمجھ لی تھیں جو روز روشن کی طرح صاف تھیں، ایک تو یہ کہ ملک کی پہلی ضرورت اس بے نظمی اور طوائف الملوکی کو دور کرنا ہے، جس سے نہ اہل ملک کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ ہے نہ کسی تعمیری کام اور بہتر نظم و نسق کی گنجائش ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اس افراتفری، بے یقینی اور سراسیمگی کی دائمی فضا کی ذمہ داری ان تین انتشار پسند اور جنگجو گروہوں پر تھی، جو نہ تو کسی ایسے ملک میں حکومت کا تجربہ رکھتے تھے جس میں مختلف مذاہب، قومیں و تہذیبیں صدیوں سے پائی جاتی تھیں، اور جس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا احساسِ ذمہ داری، قوت ضبط و تحمل، وسیع النظری اور فراخ دلی ضروری تھی، نہ ان کے پاس ملک کو اعتدال و سکون عطا کرنے، اہل ملک کا اعتماد بحال کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے کوئی منصوبہ تھا نہ کوئی تخیل، اس لئے پہلا کام یہ تھا کہ ان تینوں طاقتوں بالخصوص مرہٹوں کے غلبہ کے خطرہ سے ملک کو محفوظ کر دیا جائے، جس سے ہندوستان کے اس مرکزی حصہ کو جو حکومتوں کا مستقر رہا ہے، یعنی لاہور سے دہلی اور صوبجات متحدہ تک کے علاقہ کو کسی وقت اطمینان نہیں تھا کہ کس وقت میدان جنگ میں تبدیل اور گلزار و پر رونق شہر ایک آزاد شکارگاہ میں مبتدل ہو جائیں گے، جہاں شکاریوں کو پُرامن شہریوں کو چڑیوں اور جانوروں کی طرح مارنے کی اجازت ہوگی اور ان کا پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ دیکھتے دیکھتے تاراج ہو جائیگا، اس سے دوسرے درجہ پر وہ خطرہ تھا جو سکھوں اور جاٹوں کی شکل میں تہذیب و تمدن

اور دولت وثروت کے ان مرکزوں کو بلائے ناگہانی کی طرح پیش آتا رہتا تھا۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے تجربہ کار عسکری قائد اور منظم سپاہ کی ضرورت ہے جو نئی جنگی طاقت سے معمور تو ہو لیکن مخمور نہ ہو اس کے اندر سپہ گری کے جوہر اور شجاعت و بہادری کے ماسوا... ایمانی غیرت و دینی حمیت بھی ہو، نیز وہ ان ذیلی و ضمنی اختلافات رقابتوں اور پرانے کینوں اور دشمنیوں سے محفوظ ہو جو دہلی کے ایوان سلطنت اور ملک کے اہل سیاست کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں، اور جن کی موجودگی میں کسی ایسے بلند تر مقصد کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس میں بجائے کسی نسلی عنصر، مذہبی گروہ یا ذاتی فتح مندی کے حصول کے ملت کا فائدہ، اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت مقصود و پیش نظر ہو، شاہ صاحب کی نظر میں ایک ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے تو امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کی (جیسا کہ اوپر گذرا) ضرورت و افادیت تھی لیکن وہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر تنہا کافی نہیں تھے اور ان کے ذریعہ ان طاقتوں کا زور نہیں توڑا جا سکتا تھا جنھوں نے اپنی فوجی طاقت اتنی بڑھا لی تھی کہ ملک کی کوئی واحد فوجی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی تھی، اس کے لئے ایک تازہ دم بیرونی فوجی قائد کی ضرورت تھی جو اس ملک کے لئے مطلقاً اجنبی اور نووارد نہ ہو، وہ اس ملک کے نشیب و فراز، باشندگان ملک کی راہ و رسم، اور یہاں کے حریف اور نبرد آزما گروہوں کے مزاج اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو، اور جو اس کا حوصلہ اور ظرف بھی رکھتا ہو کہ اس ملک کو ان فوری خطروں سے محفوظ کر کے عنان حکومت یہیں کے قدیم حکمراں خاندان کے کسی اہل اور با صلاحیت فرد، وفادار و صاحب کردار امیر یا وزیر کے حوالہ کر کے واپس چلا جائے کہ یہی حقیقت پسندی، ملی مفاد اور حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

اس نازک اور دشوار کام کے لئے (جس میں ہر نازک و دشوار کام کی طرح حضرت

ومنفعت کے پہلو ہوا کرتے ہیں) شاہ صاحب کی نظر انتخاب احمد شاہ دُرّانی (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء تا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) والیٔ قندھار پر پڑی، جو ہندوستان کے لئے اجنبی اور نووارد نہیں تھا، وہ ملتان میں پیدا ہوا[1]، یہاں تک ایک سڑک ابدالی روڈ کہلاتی ہے، اس نے مختلف حالات و مقاصد کے تحت ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر نو حملے کئے، شاہ صاحب اور نواب نجیب الدولہ کی دعوت اور پانی پت کے معرکہ سے پہلے وہ چھ مرتبہ ہندوستان آچکا تھا، وہ ملک کے نشیب و فراز، طریقۂ جنگ، فوجی طاقتوں کے تناسب، اور امراء اور اراکین سلطنت کے رجحانات سے واقف تھا، وہ اٹھارویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی ہجری کے وسط کے ان ممتاز ترین فوجی قائدین میں تھا، جو عرصۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں، اور مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، اس نے بڑی خوبی و کامیابی کے ساتھ منتشر افغانوں کی شیرازہ بندی کی، منصفانہ قوانین جاری کئے، محکمۂ احتساب قائم کیا، وہ سپہ گری، مکارم اخلاق اور شرافت نفس کی صفات کا جامع تھا، علم و ادب کا ذوق رکھتا تھا، وقار و رعب کے ساتھ اپنی قوم میں محبوب و مانوس بھی تھا، دیندار، پابندِ مذہب اور علماء اور صلحاء کی مجالست کا خواہش مند، سادات و مشائخ کا ادب کرنے والا، اپنے مذہبی معلومات میں اضافہ اور علمی تبادلۂ خیال کا شائق، رحم دل و فیاض، مساوات اور مذہبی رواداری پر عامل تھا، اس نے بعض ایسی سنتوں کا احیاء کیا جن کا افغانی ماحول میں نام لینا بھی مشکل تھا، مثلاً بیوگان کا نکاح ثانی، وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور اہل قلم تھا، اپنی روحانی ترقی کا متمنی رہتا تھا[2]، فیریر نے لکھا ہے کہ:۔

---

[1] مقالہ (C. COLLIN DAVIES) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

[2] احمد شاہ ابدالی کے حالات میں ملاحظہ ہو ڈاکٹر گنڈا سنگھ کی کتاب AHMAD SHAH DURRANI - FATHER OF MODERN AFGHANISTAN, ASIA PUBLISHING HOUSE, 1949

"مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں سے احمد شاہ مبرّا تھا، شراب نوشی، افیون
وغیرہ سے اجتناب کلّی کرتا تھا، لالچ اور منافقانہ حرکتوں سے پاک تھا، مذہب کا
سخت پابند تھا، اس کی سادہ لیکن باوقار عادتیں اس کو ہر دلعزیز بنادیتی
تھیں، اس تک پہونچنا آسان تھا، وہ انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا، کبھی
کسی نے اس کے فیصلہ کی شکایت نہیں کی"[1]

احمد شاہ درّانی شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں چھ مرتبہ ہندوستان آکر اور مقامی اور وقتی
ضرورتوں کو پورا کرکے واپس جاچکا تھا، ان حملوں میں اپنی فوجی طاقت کے مظاہرہ اور وقتی
ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اس نے کوئی اور مفید کام انجام نہیں دیا تھا، اس کی فوج
نے ان اسلامی تعلیمات و آداب کی پابندی بھی نہیں کی تھی جن کی ایک پابند شریعت
مسلمان سے توقع کی جاتی ہے، اس کے بعض حملوں سے شاہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین
کو بھی پریشانی و مصائب برداشت کرنے پڑے تھے، لیکن ان کمزوریوں اور تلخ تجربات
کے باوجود وہی ایک ستارۂ امید تھا جو اس تاریک اُفق پر نظر آتا تھا، مولانا محمد عاشق صاحب
پھلتی کا بیان ہے کہ اس سب کے بعد بھی شاہ صاحبؒ یہی فرماتے تھے "وے را دریں دیار غلبہ
شدنی است" (اس کا اس علاقہ پر غلبہ ہوگا) ایک مرتبہ بہادر خاں بلوچ کے سوال کے
جواب میں فرمایا "دریں ملک غلبہ کلّی وے خواہد شد" (اس ملک پر اس کا پورا غلبہ ہوگا)
ایک مرتبہ اس کی موت کی افواہ گرم ہوئی شیخ محمد عاشق کے دریافت کرنے پر فرمایا:۔

آنچہ معلوم شدہ انیست کہ احمد شاہ	جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ احمد شاہ
درّانی باز دریں ملک می آید و ایں	درّانی اس ملک میں پھر آئیگا اور

---

[1] HISTORY OF THE AFGHANS ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص۲۲۵-۲۲۶

کفار را بر انداز دو ویرا باوجود ایں اوزار ظلم برائے ہمیں کار گذاشتہ اند[1]۔ | ان کفار کو زیر وزبر کردے گا باوجود مظالم کے جو وہ کر رہا ہے اس کو اسی لئے اب تک اللہ نے باقی رکھا ہے وہ یہی کام ہے۔

شاہ صاحبؒ کو امید تھی کہ اللہ تعالےٰ شاہ ابدالی کے حالات کی اصلاح فرمائیگا اور اس سے وہ کام لے گا جو بظاہر اسباب، کسی دوسرے امیر یا قائد کے بس کا نہیں ہے' حکیم ابوالوفاء کشمیری سے ایک مرتبہ فرمایا کہ ابدالی کو حصول مقصد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ اس وبال ظلم کی بنا پر ہیں' جو اس نے (اپنے پہلے حملوں میں) ہندوستان کے شہروں پر کئے ہیں بعد کو اس کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے[2]۔

شاہ صاحبؒ احمد شاہ ابدالی سے ملک کو اس غیر یقینی صورت حال اور افراتفری سے محفوظ کردینے اور سلطنت کو شاہی خاندان کے کسی نسبتاً لائق تر آدمی کے حوالہ کردینے کا کام لینا چاہتے تھے، شاہ صاحبؒ نے اس کی آمد سے پہلے پیشین گوئی کی تھی' اور فرمایا تھا کہ ابدالی یہاں ٹھہرے گا نہیں بلکہ اولاد ملوک میں سے کسی کے حوالہ کرکے چلا جائیگا[3]۔

بالآخر شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ سے خطوط لکھوائے پھر براہ راست ایک پُر زور و پُر اثر خط لکھا جو شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت' دینی حمیت' اخلاقی جرأت اور زور انشاء کا آئینہ دار ہے[4]، اس خط میں ہندوستان کی موجودہ صورت حال' اس کا قدیم طرز حکومت اس کے مختلف صوبوں کا نظم و نسق، ملک کی مختلف نسلی و مذہبی گروہوں

---

[1] ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص۲۶-۲۷ [2] ایضاً ص۳۰ [3] ایضاً

[4] پورا خط ملاحظہ ہو مکتوب دوم بعض سلاطین کے عنوان سے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص۶-۱۷

کی تعداد و طاقت کا تناسب، ان کے بارے میں مسلمان بادشاہوں کی سیاسی غلطیوں اور کوتاہ نظری، ان کا تدریجی طور پر طاقت پکڑ لینا اور اقتدار حاصل کرنا اس سلسلہ میں مرہٹہ اور جاٹ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے اقتدار، بار بار کے حملوں سے غربتِ اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت کا دلدوز نقشہ کھینچا گیا ہے، اور اس باحمیت مسلمان قائد کو جو اس وقت ہندوستان سے لے کر ایران تک سب سے بڑی منظم فوجی طاقت کا مالک تھا، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے اور سلطنت مغلیہ کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور ملک کی ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دینے پر آمادہ کیا گیا ہے، اور صفائی کے ساتھ لکھا گیا ہے :-

دریں زمانہ پادشاہ صاحب اقتدار وشوکت باشد وقادر بشکست لشکر کفار و دوراندیش جنگ آزمائی غیر آں ملازمان آنحضرت موجود نیست۔[1]	اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار اور شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو دوراندیش و جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔

آگے لکھتے ہیں :-

ما بندگان الٰہی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم شفیع می آریم، وبنام خدائے عزوجل سوال می نمائیم کہ ہمت بانہمت را بجانب جہاد کفار	ہم بندگان الٰہی حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شفیع بناتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۲

ایں نواحی مصروف فرمائید تا در پیش	اس جانب متوجہ فرماکر مخالفین سے
خدائے عزوجل ثوابِ جمیل در نامہ	مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے
اعمال آنحضرت ثبت شود و در دیوان	یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال
مجاہدین فی سبیل اللہ نام نامی	میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ
نوشتہ شود، و در دنیا غنائم بے حساب	کی فہرست میں نام درج ہو جائے
بدست غازیانِ اسلام افتد و	دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں، اور
مسلمانان از دست کفار نجات یابند[1]	مسلمان دست کفار سے خلاصی
	پا جائیں۔

اسی خط میں انھیں سیاسی بصیرت اور حالات سے گہری واقفیت کی بناء پر ہندوستان کی ان نوخیز طاقتوں کے بارے میں جن کی کسی مقابل منظّم طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت وطاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور ان کو ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا، صحیح اندازہ پیش کیا ہے جو ایک تجربہ کار قائد اور سیاسی مبصّر ہی پیش کر سکتا ہے، مرہٹوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"قوم مرہٹہ کا شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیان اسلام کمرہمت باندھ لیں حقیقت یہ ہے قوم مرہٹہ خود قلیل ہے، لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے ایک گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائیگی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائیگی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے، اس لئے ان کا تمامتر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ ہو، دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے"[2]

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۲ [2] ایضاً ص۸۶

شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو جو خطوط لکھے پھر شاہ صاحب نے جو طویل و مؤثر خط براہ راست لکھا (جس کا کچھ اقتباس اوپر گذرا) وہ بے اثر نہیں رہا، احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں مرہٹوں کا زور توڑنے اور نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے لئے (جنھوں نے اس موقع پر سیاسی شعور اور اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا تھا) ہندوستان کا قصد کیا ایک سال ذیلی جنگوں اور جھڑپوں میں گذر گیا، بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۴؍جنوری ۱۷۶۱ء) کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں اور افغانوں اور ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ کے درمیان وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا، اور مرہٹوں کو ہندوستان کے نئے ابھرتے ہوئے سیاسی نقشہ سے باہر نکال دیا، اس جنگ کا مختصر حال اور نتیجہ مولوی ذکاءاللہ صاحب مؤلف "تاریخ ہندوستان" کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے[1]:۔

"لڑائی میں بڑا گھمسان ہو گیا مگر اب بھی مرہٹوں کا پلہ بھاری تھا، احمد شاہ نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر کر قتل کرنے کا حکم سنایا اور یہ کہدیا جو بھاگے گا مارا جائے گا، بعد اس کے اس نے اپنی صف کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، ایک سپاہ کو اپنے بائیں طرف دشمن کے بازو پر حملہ کا حکم دیا، اس تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا، قلب سپاہ میں بھاؤ، بسواس راؤ گھوڑوں پر سوار لشکر کو لڑا رہے تھے، خنجر اور کھانڈے بازی ہو رہی تھی کہ یکایک خدا معلوم کیا ہوا کہ مرہٹوں کے لشکر کا قدم میدان جنگ سے اُٹھ گیا، قدم کا اٹھنا تھا کہ میدان جنگ کا ان کے مُردوں سے بھرنا تھا، لشکر اسلامیہ نے ان کا تعاقب بڑے جوش و خروش سے ہر جانب میں پندرہ۱۵، پندرہ۱۵، بیس۲۰، بیس۲۰ میل تک کیا،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۰۵-۳۰۹

اور مرہٹوں کو مار مار کر ڈھیر لگا دیا، جو مرہٹے ان دشمنوں کے ہاتھ سے بچ گئے، ان کو گنواروں نے مار ڈالا، بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے، جن کو جی سیندھیا کو کسی درانی نے چھپا رکھا تھا، وہ بھی تلاش کرنے سے پکڑا گیا اور مارا گیا، ابراہیم خاں گاردی بھی قید ہوا، ایک ہفتہ کی موت نے اس کے زخموں پر بھی مرہم رکھا شمشیر بہادر بھی بھاگتے ہوئے مارے گئے، مالوہ میں ملہار راؤ جان بچا کر نکل گیا، آپاجی سیندھیا بھی لنگڑا ہو کر وہاں جا پہونچا، ان دو سرداروں کے سوا کوئی اور نامور سردار نہیں بچا، مرہٹوں کو ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی نہ ایسی مصیبت پڑی تھی، اس سے ساری قوم کا دل پژمردہ وافسردہ ہو گیا، اس صدمہ سے بالاجی بھی تھوڑے دنوں کے بعد مر گیا جب سے شکست کی خبر سنی تھی ایک مندر میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھانا اختیار کر لیا تھا۔"[1]

بقول ایک مؤرخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی، سرجدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہو گئی۔"[2]

شاہ صاحبؒ کے نقشہ کے مطابق احمد شاہ ابدالی نے وقت کا یہ ضروری کام انجام دے کر قندھار کی طرف عنان عزیمت موڑی، مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

"بعد اس فتح کے احمد شاہ پانی پت سے نواح دہلی میں آیا اور چند روز متوقف رہا، ہندوستان کا بادشاہ شاہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم کو مقرر کیا، اور بادشاہ سے شجاع الدولہ کے وزیر اور نجیب الدولہ کے امیر الامراء ہونے کی سفارش کی شاہ عالم اس وقت

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص۳۹ [2] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص۴۵

دہلی میں نہ تھا، اس لئے اس کے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا نائب دہلی میں مقرر کیا

اور نجیب الدولہ کو دہلی کا منتظم مقرر کیا اور شجاع الدولہ کو خلعت دے کر اودھ اور

الہ آباد کے صوبوں پر بھیج دیا اور خود قندھار کو چلا گیا۔[1]

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ :-

"جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد

کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب

زینت محل سے خط لکھوایا احمد شاہ نے شاہ عالم کو بلانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ وہ انگریزوں

کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کرے۔"[2]

خلیق صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کسی کی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ

ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی، شاہ صاحب

اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت

اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ

مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔"[3]

اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے

فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی لیکن

حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی، جنگ پانی پت کا

اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔"[4]

---

[1] تاریخ ہندوستان ج ۹ ص ۳۰۹-۳۱۰ [2] سیاسی مکتوبات ص ۴۵-۴۶ [3] ایضاً ص ۴۷ [4] ایضاً ص ۴۵

شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ زریں موقع کھو دیا اور ساری کوششوں اور خود اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے باوجود پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں ۲۵ر دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوا اس کے بعد اس کے اور اس کے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے، اس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۸۵۷ء کا انقلاب سلطنت بلکہ انتزاع سلطنت ہے (اگرچہ سلطنت برائے نام تھی) جو انگریزوں کے ہاتھ پیش آیا، جنھوں نے اپنی دانشمندی اور سیاسی ذہانت سے ہندوستان پر تسلّط کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے صحیح جانشین اور علم و بصیرت اور غیرت و حمیّت دینی کے وارث ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد نامدار کے شروع کئے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کی توسیع و تکمیل کی کوشش کی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس وقت کے سیاسی میدان کے اصل حریف اور حقیقی طاقت (انگریزی اقتدار) کی طرف موڑ دی جس نے اب "خطرہ" سے بڑھ کر (جس کے دیکھنے کے لئے سیاسی بصیرت درکار ہوتی ہے) "واقعہ" کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے دیکھنے کے لئے بصارت بھی کافی ہوتی ہے[1]۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد انھیں کے دانش گاہ کے دو تربیت یافتہ صاحبِ عزیمت داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے سیاسی نقشہ میں (جو انھوں نے نظری طور پر "حجۃ اللہ البالغہ" اور "ازالۃ الخفا" کے صفحات اور تفہیمات میں پیش کیا تھا) رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کی اساس پر قائم کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی، انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی

---

[1] اس اجمال کی تفصیل باب یازدہم میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سلسلہ میں آئیگی۔

تعلیمات اور ان کی دی ہوئی روشنی سے کتنا فائدہ اٹھایا ان کے عزائم کتنے بلند، ان کی نگاہ کتنی دور بین، ان کا قلب کتنا وسیع اور فراخ تھا، وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی فوجی حکومت کے استیصال و استحصال کی اسی طرح کی فوری مصیبت سے بچانے کے بعد (جس طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے مرہٹوں اور جاٹوں کے روزمرہ کے قتل و غارت گری سے اپنے وقت کے ماحول و معاشرہ کو بچانے کی کوشش کی تھی) اور انگریزوں کو جن کو وہ "بیگانگانِ بعید الوطن و تاجرانِ متاع فروش" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، نکالنے کے بعد ہندوستان کو وہ کس طرح آزاد کرانا اور اسلام کے عدل و مساوات کے اصول پر اس کا نظم و نسق قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوگا جو انھوں نے سلاطینِ وقت، امراء نامدار، صاحبِ حمیت مسلمانوں اور ہوشمند والیانِ ریاست کو لکھے ہیں[1]:-

اس طرح اس سلسلے کے اہلِ دعوت و عزیمت کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول کا دسواں باب "جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب" ص ۳۸۵-۳۹۴

بابِ دہم

امت کے مختلف طبقات کا احتساب
اور
ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب

شاہ صاحب کا امتیاز

عام طور پر جن علمائے کبار کا ذوق علمی تصنیفی اور تحقیقی ہوتا ہے، اور ان کو ذکاوت، باریک بینی اور دقیقہ رسی سے حصۂ وافر عطا ہوتا ہے، وہ عام طور پر مطالعۂ کتب، علمی مباحث پر تحقیق و تدقیق یا تدریس و تصنیف کے مشغلہ میں ہمہ تن منہمک و مستغرق رہتے ہیں، اور معاشرہ کے مختلف طبقات اور عامۃ المسلمین کی کمزوریوں اور بیماریوں سے یا تو بے خبر ہوتے ہیں، یا ان کے لئے اس عوامی سطح تک اترنا اور اس علمی نظری بلندی سے (جس میں دنیا کی ہر لذّت و حلاوت سے بڑھ کر لذّت و حلاوت ہوتی ہے) "نزول" دشوار ہوتا ہے۔

علمائے سلف میں اس بارے میں دو شخصیتوں کا واضح طریقہ پر استثنا کیا جا سکتا ہے، ایک حجۃ الاسلام امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کا، جنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید کتاب احیاء علوم الدین میں اپنے زمانہ کے مسلم معاشرہ اور ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کی بیماریوں اور کمزوریوں کی اس طرح نشاندہی کی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اپنے زمانہ کی عوامی زندگی اور معاشرہ کے مختلف طبقات سے، علماء کے حلقہائے درس اور مشائخ کی مجالسِ ذکر وفکر سے لے کر، خلفاء وسلاطین کے درباروں، امراء کے ایوانوں اور رؤسا کے عشرت خانوں تک، اور ان محل سراؤں سے لے کر اہل حرفہ وتاجروں کی دوکانوں اور بازاروں کے پرشور ہنگامہ خیز ماحول تک سے واقف ہیں، اور جانتے ہیں کہ نفس وشیطان نے کس کس طرح سے علماء ورؤسا کے مختلف طبقوں اور عوام وخواص کے مختلف حلقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم وحقائق کس طرح تبدیل ہوگئے ہیں، اور وہ مقصد اصلی (سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی) سے کس طرح غافل ہیں۔[1]

یہی حال (اجمال وتفصیل اور طرز واسلوب کے فرق کے ساتھ) علامہ ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) کا اپنی مشہور تصنیف تلبیس ابلیس میں ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور جماعت کو سنت وشریعت کے معیار سے جانچا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، اور اس بارے میں کسی طبقہ کی رعایت نہیں کی، علماء ومحدثین فقہاء وواعظین، ادباء وشعراء، سلاطین وحکام، عبّاد وزہّاد، صوفیائے اہل دین اور عوام سب کا بے لاگ احتساب کیا، اور ان کے مغالطوں کا پردہ چاک کیا ہے۔[2]

لیکن (جہاں تک تلبیس ابلیس کا تعلق ہے) یہ تنقید واحتساب زیادہ تر "سلبی" اور منفی انداز کا ہے، اس کے ساتھ اصلاح حال کی مفصل وپرزور "مثبت" دعوت نہیں ہے، یا اگر ہے تو مقدار وتاثیر میں اس کے درجہ کی نہیں ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے

---

[1] تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۳۔۴ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۱۴۶ تا ۱۶۶

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تلبیس ابلیس از ص ۱۱۹ تا ۳۹۴ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۲۳۴ تا ۲۳۹

موضوع کے دائرہ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

مختلف طبقاتِ امت سے خصوصی خطاب

ان دو شہرۂ آفاق علماء و داعیانِ دین و معلّمین اخلاق کے بعد (جو اپنے اصلاحی و تربیتی مقام کے ساتھ عظیم المرتبت عالم و مصنف بھی تھے) ہمیں (اپنے محدود مطالعہ میں) اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، انھوں نے سلاطینِ اسلام، امراء و ارکانِ دولت، فوجی سپاہیوں، اہلِ صنعت و حرفت مشائخ کی اولاد (پیرزادوں) غلط کار علماء، متقشّف اور خوردہ گیر واعظوں اور تارک الدنیا و عزلت گزیں زاہدوں کو علیحدہ علیحدہ خطاب کیا ہے، ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی ہے، اور ان کی اصلی بیماریوں اور خود فریبیوں کی نشاندہی کی ہے، ان سب کے علاوہ امتِ اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے، اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے، اور ان کا علاج بتایا ہے، ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی حمیت کا جوش، دعوت کا جذبہ اور زورِ قلم اس نقطۂ عروج پر ہے، جس کی مثال سابق الذکر مصلحین و ناقدین اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں ملنی مشکل ہے، شاہ صاحب کی مشہور کتاب "التفہیمات الالٰہیہ"[۱] (جلد ۱-۲) سے یہاں پر مختلف اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں آپ نے اپنے زمانہ کے مختلف ممتاز اور صاحبِ اثر طبقوں کے سربراہوں سے خطاب کیا ہے[۲]، ان خصوصی خطابات سے شاہ صاحب کی ژرف نگاہی،

---

[۱] یہ کتاب المجلس العلمی ڈابھیل سورت کی طرف سے ۱۳۵۹ھ ۱۹۳۶ء میں مدینہ پریس بجنور سے دو جلدوں میں شائع ہوئی

[۲] شاہ صاحب کی اصل عبارت عربی میں ہے، اس کا ترجمہ خود پیش کرنے کے بجائے ہم نے فاضل گرامی (باقی صفحہ ۳۲۶ پر)

حکمت دعوت، اخلاقی جرأت اور واقفیتِ عامّہ وخاصّہ کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کو دیکھ کر تاریخ کا ایک ایسا طالب علم جو اس عہد و معاشرہ کی زبوں حالی، اہل علم واہل قلم کی مصلحت اندیشی اور داعیوں و مصلحوں کی اصلاح حال سے مایوسی کی کیفیت سے واقف ہے، انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ؏

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟

سلاطین اسلام سے خطاب

"اے بادشاہو! ملأ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک کہ مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے، اور اہل کفر وفسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں، اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں۔ "وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے، اور "دین" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمہیں چاہئے کہ ہر تین[۳] دن

(باقی ص۳۲۵ کا) مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے اس مضمون کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کی ہے جو انھوں نے الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے "آغوش موج کا ایک دُرِّ تابندہ" کے عنوان سے لکھا تھا، اس مضمون میں تفہیمات کے ان ٹکڑوں کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا ہے، اور ان پر مختلف عنوانات لگا دیئے ہیں، اس طرح شاہ صاحب کے مبارک تذکرے کے ساتھ ایک مخلص و متبحّر عالم کی یاد بھی تازہ اور زندہ رہے گی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

یا چار[۴] دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل
وانصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو، اور
خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو، اور اس میں سرگرم ہو کر پھر لوگوں میں بغاوت
وسرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں، اور نہ دین سے مرتد
ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو،
اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص
اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت
رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔

مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے
بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے، اور حکومت کے
مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔

چاہئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر
کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں، ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی
جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو، جن کے دل میں جہاد کا
ولولہ ہو، اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں، ہر سرکش اور متمرد
سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو ——— اے بادشاہو! جب تم
یہ کر لو گے تو اس کے بعد ملأ اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور
عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ، اور ایسا کر دو کہ
پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے، جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد

لوگ امن وامان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔[1]

امراء وارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم بُرا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے، اور شرابیں ڈھالی جائیں، جُوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے، اور اس حال کو نہیں بدلتے، کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حدِ شرعی نہیں جاری ہوئی، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو، اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں، کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے، کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے، یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ جلد اول از ص ۲۱۵ تا ۲۱۶

فوجی سپاہیوں کو خطاب

"اے فوجیو! اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی، اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا، اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے، لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے، اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو، اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اس سے اپنی دولت میں اضافہ کرو، اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو ــــــ تم شرابیں پیتے ہو، بھانگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو، اس کی قیمت ان تک نہیں پہونچتی ــــ ــــ خدا کی قسم تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا صالحین غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو، چاہئے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو، جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو، تمہیں چاہئے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں، انھیں سیکھ لو، مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے، اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا، پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو، اور اپنی نیتوں کو درست کر لو، اللہ تعالےٰ تمہارے جاہ و منصب میں برکت دے گا، اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا"[1]

[1] تفہیمات ج ۱ ص ۲۱۶

اہل صنعت و حرفت سے خطاب

"ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہوگیا ہے، تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہوچکے ہو، اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدار[1] اور سالار[2] کا حج کرتے ہو، تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے، یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طرح سے کھاتے کھلاتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے، وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خواری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں، اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں، یہ کیسا بدبخت آدمی ہے، اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو، اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہونچا دے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی، اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی، کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا ہی برا بچھونا ہے۔

---

[1] شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری مراد ہیں جو شاہ مدار کے نام سے مشہور ہیں۔ [2] سید سالار مسعود غازی مدفون بہرائچ جن کے جھنڈے نکالے جاتے ہیں، اور لوگ دور دور سے آکر اُن کے عُرس میں شریک ہوتے ہیں۔

دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو، اور دن کے بڑے حصہ کو
اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گذارو، اپنے خرچ کو اپنی
آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی
مدد کیا کرو، اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو۔
تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو، اور تمہاری تدبیر
درست نہیں ہے۔"[1]

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے
خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

"اے وہ لوگو! جو اپنے آبا و اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی
گذشتہ بزرگان دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا
ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بنٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے
راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے، اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا، اور محض اپنے
لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی، اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں
ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے، اپنی جگہ
اپنے کو راہ یافتہ اور راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ دراصل وہ خود گم کردۂ راہ

---

[1] ایضاً ص ۲۱۷

اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے مٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز وہ نہ اختیار کریں گے، دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ گیر ہیں، ان کا شمار دجّالوں کذابوں فتّانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا، جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو، اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو، دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا	یہ میری راہ ہے سیدھی، تو اس پر چل پڑو
فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ	اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ
بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (الانعام۔۱۵۳)	تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے۔"[1]

پھر اس زمانہ کے طلبۂ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

---

[1] ایضاً ص ۲۱۴

غلط کار علماء سے خطاب

"ارے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو، اور صرف ونحو ومعانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے، یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیئے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ، اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے، اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضوء کرنے کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا، اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے، اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کا کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، چاہیئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے، اسے سنت ہی سمجھو، نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو، اسی طرح چاہیئے کہ جو تم پر فرائض ہیں، انھیں سیکھو، مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں، زکاۃ کا نصاب کیا ہے، قدر واجب کیا ہے، میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے، پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو، جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور

جس میں سر کھپایا ہے ہو' اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ' یہ دنیا کے علوم ہیں۔[1]

پھر ان ہی طلباء کو فرماتے ہیں :۔

"جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو' نہ کہ خود انہی کو مستقل علم بنا بیٹھو' علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو' لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے' کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے' حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں' جو علماء سے خالی ہیں' اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں' وہاں بھی دینی شعار وں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔"[2]

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے' جنھوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے' اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا' گویا دین سے وہ خارج ہے' اس گروہ میں زیادہ تر زہّاد' عبّاد اور وعّاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے' اس لئے عنوان کا آغاز انہیں سے کیا گیا ہے' فرماتے ہیں :۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشیں زاہدوں سے خطاب

"دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں' اور

---

[1] ایضاً ص ۲۱۴ [2] ایضاً ص ۲۱۵

واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امتِ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہونچاؤگے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دوگے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو، جو بیچارے مغلوب الحال تھے، اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و حواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھدی جاتی ہیں، نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے، تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے، اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہئے تھا کہ اعتقاداً و عملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی، اور نہ اربابِ کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی، چاہئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو، پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے، جو آپ کی ہدایت ہے، پھر تم کیا بتا سکتے ہو؟ کہ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے۔"[1]

---

[1] ایضاً ص ۲۱۵

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے، جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہے، فرماتے ہیں:۔

عام امت مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

"میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں، اے آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر بیجا حرص و آز کا ہوکا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے، عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئیں ہیں، اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں، حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے، اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے، پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا، اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہونچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں، اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو،

تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کروگے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا، جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہیئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہر حال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے، اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے، اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت بہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالے کی یاد اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں، جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے، تم عاشوراء کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو، اور مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں، جس نے تم پر تمہاری زندگی

تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلّف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بُری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے، یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی، اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں، تم میں کچھ لوگ ہیں، جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انھیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں، جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں، تم نے زکاۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے، جس کے اقربا و اعزّہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے، اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں اور ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکاۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں، خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انھیں برداشت کرنی پڑتی ہے، اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے، اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے، تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے، سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بُری عادت ہے ۔۔۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں

جو روزے رکھتے ہیں، لیکن سحری نہیں کرتے، اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے، جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں"۔

آخر میں فرماتے ہیں:۔

"ملأ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور سے متعلق تقاضا ہو رہا ہے، اس کا ایک طویل باب ہے، لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے، اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے"۔[1]

اصلاح رسوم و تطہیر معاشرہ

شاہ صاحب نے ان خصوصی طبقات سے خصوصی خطاب پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس وقت کے مسلم معاشرہ میں صدیوں سے ہندوؤں کے درمیان رہنے، حدیث و سنت کی عدم اشاعت، علمائے دین کی غفلت و کوتاہی اور اسلامی حکومت کی فرض ناشناسی اور دینی احتساب کے فقدان کی وجہ سے جو ہندوانہ رسوم، بدعات اور غیر اسلامی شعائر رواج پا گئے تھے، اور مسلمان سختی سے ان کے پابند تھے، ان پر بھی شاہ صاحب نے نکیر فرمائی، اور ان عقائدِ فاسدہ، توہمات اور غیر مسلموں کی تقلید کی مذمت کی، عام طور پر وہ علماء، جن کا معقولات و علوم حکمت سے اشتغال تھا، ان عادات و رسوم کو معمولی سمجھ کر، یا اس بکھیڑے اور مخالفتِ عوام سے بچنے کے لئے ان کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد، جنھوں نے اپنے متعدد مکتوبات میں ان عقائد شرکیہ، شعائر جاہلیت و رسوم فاسدہ کی تردید و مذمت کی ہے،[2] اصلاحِ رسوم اور اسلامی معاشرہ کی تطہیر کا کام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ذریعہ

---

[1] ایضاً ص ۲۱۷ تا ۲۱۸ [2] ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" ج ۴ از ص ۲۳۹ تا ۲۵۳

شروع ہوا، جس کی تکمیل ان کے فرزندان گرامی مرتبت اور انھیں کے خاندان کے تربیت یافتہ مصلحین امت، حضرت سید احمد شہیدؒ (خلیفہ شاہ عبد العزیزؒ) حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ (نبیرۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ) نے کی۔[1]

یہاں پر تفہیمات اور وصیت نامہ (فارسی) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"ہندوؤں کی عادات شنیعہ میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا ہے تو اسے وہ دوسری شادی نہیں کرنے دیتے، عربوں میں یہ عادت بالکل نہ تھی، نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ ان کے زمانہ میں، نہ بعد میں، اللہ تعالےٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اس تقبیح عادت کو ختم کرے، اور اگر عام لوگوں سے اس کا رواج ختم نہ ہوسکے تو اپنی قوم کے درمیان ہی عربوں کے طریقہ کو رواج دینا چاہئے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس عادت کو قبیح سمجھنا اور دل سے اس کا دشمن ہونا چاہئے کہ یہ ہی منکر کا سب سے آخری درجہ ہے۔

ہماری دوسری بری عادت یہ ہے کہ بہت لمبا مہر باندھتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (کہ آپ سے ہمارے دین و دنیا کی عزت وابستہ ہے) اپنے گھر والوں کے مہر (جو بہترین خلائق تھے) ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر فرمائے تھے جس کے پانچ سَو درم ہوتے ہیں۔

ہماری ایک دوسری بری عادت اسراف کی ہے کہ خوشی کے موقعوں اور رسموں میں بہت خرچ کرتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شادیوں میں صرف ولیمہ اور

---

[1] ملاحظہ ہو صراط مستقیم (از افادات حضرت سید احمد شہیدؒ، جمع کردہ شاہ اسماعیل شہیدؒ) نیز کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ (۱-۲) "و کاروان ایمان و عزیمت" از مصنف۔

عقیقہ ثابت ہے، چنانچہ ان دونوں کی پابندی کرنی چاہیئے، اور اس کے علاوہ سے بچنا چاہیئے، یا ان کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیئے۔

ہماری بری عادتوں میں غم کے موقعوں، سیُّم، چہلم، ششماہی، فاتحہ اور سالانہ کے نام پر بھی اسراف ہے، حالانکہ ان میں سے کسی کا عرب اولین میں رواج نہیں تھا، بہتر یہی ہے کہ میت کے ورثا کی تین دن تعزیت اور ایک شب و روز کے کھانے کے علاوہ کوئی اور رسم نہ کریں، تین دن کے بعد قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر میت کی عورتوں کے کپڑوں میں عطر ملیں، اور اگر میت کی زوجہ حیات ہو تو عدت گذرنے کے بعد سوگ کا سلسلہ ختم کر دیں[1]"۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اپنے مضمون "منصب تجدید کی حقیقت" اور "تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام" (الفرقان ولی اللہ نمبر) میں "ازالۃ الخفا" اور "تفہیمات" کے اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صحیح لکھا ہے کہ :۔

"ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے، اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جن کے ضمیر و ایمان میں زندگی، جن کے قلب میں بُرے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے، ان کی اسلامی حِس اتنی تیز ہو جاتی ہے، کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انھیں کھٹکنے لگتا ہے، ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے، کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں

---

[1] تفہیمات الٰہیہ از ص ۲۴۶ تا ۲۴۷ طبع بجنور ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء، وصیت نامہ فارسی مطبوعہ دہلی ۱۲۶۸ھ ص ۲۴

اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں، اور ان کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انھیں اصلاح کے لئے بےچین کر دیتی ہے، اس کے بعد مجدد کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے، تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے، اس پر وہ اپنی نظر جما سکیں، اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں، یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا، جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔[1]"

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص۱۰۱، ۱۰۲

بابِ یازدہم

فرزندان گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، نامور معاصر

لائق فرزندان وجانشین

مصلحینِ امت ومجدّدینِ اسلام میں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر اللہ تعالیٰ کے جو خصوصی انعامات اور اہلِ دعوت وعزیمت میں آپ کو جو امتیازات حاصل ہیں، ان میں ایک تاریخی امتیاز اور اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ معاملۂ خاص یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے فرزند وجانشین عطا فرمائے جو "نعم الخلف لنعم السلف" کے صحیح مصداق ہیں، اور جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے جلائے ہوئے چراغ کو نہ صرف روشن وتاباں رکھا، بلکہ اس سے سیکڑوں چراغ جلائے، پھر ان چراغوں سے وہ چراغ جلتے رہے جن سے اس پورے تحتی برِّاعظم (ہندوستان) اور ہندوستان کے باہر بھی کتاب وسنت، عقائدِ حقّہ، اشاعتِ توحیدِ خالص، ردِّ شرک وبدعت، اصلاح رسوم، تزکیۂ نفس، حصول درجۂ احسانی، اعلائے کلمۃ اللہ وجہاد فی سبیل اللہ، حمیّت دینی، تاسیس مدارس دینیہ، دین کی صحیح تعلیمات کی ترجمانی وتبلیغ کے لئے تصنیف وتالیف اور تراجم قرآن وکتب حدیث وفقہ کا مبارک سلسلہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک جاری ہے، اگر ان مبارک اقدامات ومساعی کی تاریخ دیکھی جائے اور خیر وبرکت کے ان مراکز اور سلسلوں کے "شجرۂ نسب" کی تحقیق کی جائے،

تو معلوم ہوگا کہ ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا رہا، اور یہ سب چراغ اس چراغ سے روشن ہوئے جو بارہویں صدی ہجری کے وسط میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آندھیوں کے طوفان میں جلایا تھا، اس وقت بے اختیار فارسی کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

عجیب مماثلت

فرزندان گرامی اور ان کے ذریعہ سے اپنی خصوصی دعوت اور اس سلسلہ کی اشاعت میں (جو ہزار کمالات کے باوجود تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ایک نادر و نایاب خصوصیت ہے) آپ کو اپنے ہی سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بانی اور شیخ الشیوخ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے عجیب مماثلت ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چار فرزندان گرامی درجۂ کمال کو پہونچے،[1] خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، خواجہ محمد یحییٰ، ان میں سے اول الذکر حضرت خواجہ محمد صادق کا ۲۵ سال کی عمر میں ۱۰۲۵ھ میں انتقال ہوگیا، حضرت مجددؒ سے ان کے بارے میں بلند کلمات منقول ہیں، سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت تینؒ آخر الذکر فرزندان گرامی کے ذریعہ ہوئی اور حضرت سید آدم بنوریؒ کو مستثنیٰ کر کے (جن کا تعلق حضرت سے نسب کے بجائے نسبت کا تھا، اور وہ نسبت ایسی قوی اور مقبول تھی کہ انھیں کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، اور ان کے خلفائے نامدار اور علمائے کبار ہیں) اس سلسلۂ عالیہ کی توسیع و تبلیغ اور حضرت مجددؒ کے شروع کئے ہوئے

---

[1] ان چار کے علاوہ حضرت مجدد کے بقیہ صاحبزادے شیر خوارگی اور صغر سنی میں وفات پا گئے تھے۔

کارِتجدید وانقلاب کی تکمیل انھیں تینوں فرزندان گرامی قدر کے ذریعہ ہوئی، پھران تینوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو انتیاز خاص حاصل ہے کہ ان کے ذریعہ سے یہ سلسلہ ترکستان و عرب اور ترکی تک پہونچا اور کہنے والے نے صحیح کہا کہ ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصومؒ

منوّر از فروغش ہند تا روم

پھر آپ ہی کا مخفی ہاتھ اور توجہات باطنی تھیں کہ اکبر کے تخت پر دو پشتوں کے بعد ہی وہ باحمیّت، مجاہد و غازی، متشرع اور فقیہ سلطان آیا، جو ماحیِ دین بننے کے بجائے حامی دین، اور ہادم ملّت کے بجائے خادم ملت قرار پایا، جس کو حضرت خواجہ شروع سے اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" لکھ کر اس کارِ عظیم کے لئے تیار کر رہے تھے۔

بالکل اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے چار[1] باکمال فرزند چھوڑے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فرزندان گرامی کا بھی یہی معاملہ ہے کہ ان کے چار[2] صاحبزادوں میں سے شاہ عبدالغنی صاحب کا (جو اپنے بھائیوں میں سب سے صغیر السن تھے) اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے (۱۲۲۷ھ میں) انتقال ہوگیا، شاہ صاحبؒ کی تعلیمات آپ کے علوم و معارف کی

---

[1] شاہ صاحبؒ کی پہلی اہلیہ سے شیخ محمد کے نام سے ایک فرزند تھے، جن کا انتقال شاہ صاحبؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جوانی میں ہوگیا تھا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، مختصر ترجمہ "نزہۃ الخواطر" ج ۶ میں بھی ہے۔

[2] حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ انھیں کے فرزند تھے، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد یہی چار صاحبزادے (شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ) معروف و مشہور ہوئے۔

صاحبزادوں کی ترتیبِ وفات عکسی ہے، سب سے چھوٹے صاحبزادہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے پہلے (۱۲۲۷ھ میں)، پھر ان سے بڑے شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے (۱۲۳۰ھ میں)، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے (۱۲۳۳ھ میں)، پھر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے (۱۲۳۹ھ میں) وفات پائی۔

تبلیغ واشاعت، مردانِ کار کی تربیت وتکمیل اور تدریس وتصنیف کا وہ طرز خاص جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق، اور اجتہاد وتجدید کا رنگ جھلکتا تھا، انھیں تین صاحبزادوں کے ذریعہ جاری رہا، پھر ان تینؒ میں بھی سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کو اپنے بھائیوں میں وہ مقام حاصل ہوا، جو حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو حاصل ہوا تھا، اور ان کے ذریعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے سلسلہ، اور آپ کے علوم وتعلیمات کی عالمگیر اشاعت ہوئی، اور بعض شعبوں کی تو اس طرح توسیع وتکمیل ہوئی کہ ادب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ . ؏

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

قبل اس کے کہ ہم شاہ صاحبؒ کے شروع کئے ہوئے کاموں کی اس تکمیل، توسیع وترقی کا ذکر کریں، جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے ہاتھوں عمل میں آئی، ہم ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور تذکرہ وتعارف پیش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم سے ان کا تذکرہ نقل کرنے پر اکتفا کریں گے، جو ماقلّ و دلّ کا مصداق ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ

امام العلماء، راس الفضلاء، علامۂ محدث، شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلویؒ، خود اپنے زمانہ کے علماء کے سردار اور گزشتہ علماء کے سرتاج کے چشم وچراغ، بعض لوگوں نے آپ کو "سراج الہند" اور بعض نے "حجۃ اللہ" کا خطاب دیا۔ آپ پنجشنبہ کی رات ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ آپ کے

تاریخی نام" غلام حلیم" سے معلوم ہوتا ہے' آپ نے قرآن شریف کے حفظ سے فراغت پائی' اور اپنے والد ماجد سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ان سے قرأت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق و درایت اور توجہ سے علم حاصل کیا، جس سے آپ کو علوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہو گیا، جب آپ ۱۶ سال کے تھے' تو آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا، اس کے بعد آپنے شیخ نور اللہ بڈھانوی، شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا، آپ کو اجازت علمی شاہ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی سے حاصل ہوئی جو آپ کے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور محرم راز تھے' آپ نے ان حضرات سے ان علوم و کمالات میں استفادہ اور ان کی تکمیل کی جو والد صاحب کی وفات سے تشنۂ تکمیل تھے' اپنے ایک رسالہ میں آپ نے اپنے والد صاحب اور دوسرے علماء سے اپنے استفادہ کی تفصیل لکھی ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتب حدیث میں پوری مؤطا مع مسوّیٰ اور مشکوٰۃ المصابیح اپنے والد صاحب سے پڑھیں، حصن حصین، اور شمائل ترمذی کی آپ کے درس میں سماعت کی جس کی قرأت آپ کے بھائی شیخ محمد کرتے تھے، صحیح بخاری کتاب الحج تک کی سماعت سید غلام حسین مکّی کی قرأت سے کی، جامع الترمذی، سنن ابی داؤد کی سماعت مولوی ظہور اللہ مراد آبادی کی قرأت سے اور مقدمۂ صحیح مسلم اور اس کی بعض احادیث اور سنن ابن ماجہ کے کچھ حصوں کی سماعت محمد جواد پھلتی کی قرأت سے، مسلسلات اور مقاصد جامع الاصول کے بعض حصوں کی سماعت مولوی جار اللہ نزیل مکہ کی قرأت اور سنن النسائی کے کچھ حصوں کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے حلقۂ درس میں کی، صحاح ستّہ کے باقی ابواب کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے خلفاء سے جیسے شیخ نور اللہ اور خواجہ محمدؒ امین سے کی اور ان کے علاوہ کتابوں کی اجازت عامہ اپنے والد کے خلیفۂ ارشد

اور ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین سے پائی، اور ان دونوں کے لئے آپ کے والد ماجد صاحب کا اجازت نامہ "تفہیمات الٰہیہ" اور "شفاء العلیل" میں موجود ہے، ان لوگوں نے آپ کے والد صاحب سے پڑھا ہے، جبکہ شاہ محمد عاشق، آپ کے والد ماجد کی شیخ ابوطاہر مدنی کی خدمت میں قرأت وسماعت اور ان سے اجازت میں شریک بھی تھے، ان کی اسانید ان کی کتاب "الارشاد فی مہمات الاسناد" وغیرہ رسائل میں مذکور ہیں۔

آپ طویل القامت، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم تھے، داڑھی گھنی تھی، خط نسخ ورقاع بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھتے تھے، تیراندازی، شہ سواری اور موسیقی میں بھی مہارت تھی، آپ سے آپ کے بھائیوں، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کے داماد مولانا عبدالحیؒ بن ہبۃ اللہ بڑھانوی نے درس لیا، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور سید قمرالدین سونی پتی آپ سے قرأت وسماعت میں آپ کے بھائیوں کے ساتھ تھے، حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) نے آپ سے صحیح بخاری پڑھی، مولانا سید قطب الہدیٰ بن مولانا محمد واضحؒ رائے بریلوی نے آپ سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

آپ کے دوسرے اصحاب نے آپ کے بھائیوں سے پڑھا ہے اور آپ سے سند لی ہے، آپ کی مجلسوں میں حاضر رہے ہیں، اور آپ کا درس قرآن سنا ہے، اور آپ سے حسب توفیق استفادہ کیا ہے، آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق بن افضل عمری آپ کے یہاں قاری تھے، جو ہر روز قرآن مجید کے ایک رکوع کی تلاوت کرتے تھے، اور شاہ صاحبؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے، یہی آپ کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کا طریقہ بھی تھا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کا آخری درس قرآن آیت " اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی "[1] تک ہوا تھا، جہاں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنا درس شروع کیا، آپ کا آخری درس " اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ "[2] تک ہوا تھا، وہاں سے آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے اپنا درس شروع کیا جیسا کہ " مقالات طریقت " میں ہے، آپ اپنے علم و فضل، فہم و ذکاء اور سرعت حفظ میں یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پندرہ ۱۵ سال کی عمر ہی سے درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا اور آپ سے بڑے بڑے فضلاء نے استفادہ کیا، اکثر اطراف کے طلبہ آپ کی خدمت میں اس ذوق و شوق سے حاضر ہوئے جیسے پیاسا پانی پر گرتا ہے۔

پچیس ۲۵ سال کی عمر میں آپ کو متعدد اذیّت رساں امراض نے گھیر لیا، جن کے سبب آپ مراق، جذام، برص میں مبتلا ہوئے اور بصارت بھی جاتی رہی، بعض واقفان حال نے آپ کے چودہ ۱۴ تکلیف دہ امراض کا ذکر کیا ہے، اس وجہ سے آپ نے اپنی تدریسی ذمہ داری اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سپرد کر دی، مگر اس کے ساتھ خود بھی درس دیتے تھے، تصنیف و افتاء اور وعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، ہر سہ شنبہ کو آپ کا ہفتہ وار وعظ قرآن مجید کی تفسیر پر مشتمل ہوتا تھا، اخیر عمر میں آپ مجلس میں تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لئے اپنے قدیم و جدید مدرسہ کے درمیان ٹہلتے رہتے اور لوگ بڑی تعداد میں اس حالت میں بھی استفادہ کرتے اور آپ کا درس وافتاء اور وعظ ہوتا رہتا تھا، اسی طرح عصر و مغرب کے درمیان دو آدمیوں کی مدد سے مدرسہ اور جامع مسجد کی درمیانی سڑک پر نکلتے تھے، لوگ راستہ میں آپ کے منتظر رہتے اور اپنی مشکلات حل کراتے۔

انھیں امراض میں عدمِ اشتہا کا مرض اس حد تک بڑھ گیا کہ کئی کئی دن کسی چیز کے

---

[1] المائدۃ — ۸   [2] الحجرات — ۱۳

چکھنے کی بھی نوبت نہ آتی، اور بخار کی طرح اس کی بھی باری آتی تھی، آپ نے "مناقب حیدریہ" کی تقریظ میں لکھا ہے:۔

"اس تقریظ میں کوتاہی کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، جو اعذار اور امراض کے سبب ہوئی جن کی وجہ سے بھوک بالکل ختم ہوگئی ہے اور کھانے کی نوبت باری کے بخار کی طرح آتی ہے، ایسا غالباً پت کے غلبہ کے سبب ہے، قویٰ مضمحل ہوگئے، حواس میں فرق آگیا، اعضاء کمزور پڑگئے، ہڈیاں اور ڈاڑھیں بھی کمزور ہوگئیں۔"

امیر حیدر بن نور الحسنین بلگرامی کو خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر آپ اپنے محب کا حال پوچھتے ہیں، تو وہ بہت خراب ہے اور صبح و شام اس میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، اور اسے ظاہری و باطنی آلام گھیرے ہوئے ہیں، قرار و سکون چھن گیا ہے، اور قلق و اضطراب بڑھ گیا ہے، اور یہ سب ایسے امراض کے سبب ہے جن میں سے ایک مرض بھی آدمی کو پریشان اور غمزدہ کرنے کے لئے کافی ہے، جیسے بواسیر، معدہ اور آنتوں میں ریاح کا رکنا، اس حد تک فقدانِ اشتہا کہ کئی رات دن کھانا چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی، بخارات جب قلب کی طرف چڑھتے ہیں تو دم گھٹنے کی کیفیت ہوجاتی ہے، یہ جب دماغ کی جانب پہونچتے ہیں تو تکلیف دہ درد سر شروع ہوجاتا ہے، جو ہاون دستہ کے ضرب کی طرح محسوس ہوتا ہے "وَإِلَى اللهِ الْمُشْتَكَىٰ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ"، یہ حالت ایک لفظ بھی بولنے کی اجازت نہیں دیتی، چہ جائیکہ کوئی کتاب املا کراسکے یا کوئی پیغام لکھوا سکے۔"

آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب، خوش گفتار ہے، اور تواضع، بشاشت اور مہر و محبت کی یہی ادا قائم رہی جو شروع سے تھی، آپ کی صحبت ذہن و فکر کو

جلا بخشتی تھی، ان صحبتوں میں حیرت انگیز خبریں، چیدہ اشعار، دور دراز کے ملکوں، ان کے باشندوں اور وہاں کے عجائبات کا بیان اس طرح ہوتا تھا جس سے سامعین کو محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنے مشاہدات بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ آپ نے کلکتہ کے علاوہ کوئی اور شہر نہیں دیکھا تھا، مگر آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور متجسس فطرت کے مالک تھے، جس کے سبب آپ نے باہر سے دہلی آنے والوں اور معلومات افزا کتابوں سے (جن کے مطالعہ سے مشاہدہ کی کیفیت حاصل ہو سکتی ہے) یہ معلومات اپنے دماغ میں محفوظ کر لئے تھے۔

لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لئے حاضر ہوتے، شاعر و ادیب ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کے لئے[1]، اور محتاج و ضرورت مند لوگ امراء سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کے لئے آتے، کیونکہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی شہرت عام تھی، اسی طرح مریض دوا علاج کے لئے حاضر ہوتے، اہل جذب و سلوک آپ سے روحانی استفادہ کے لئے آپ کے پاس جاتے تھے، پردیسی علماء و مشائخ کو آپ اپنے یہاں ٹھہراتے اور ان کی حاجت روائی کرتے، اگر آپ کے پاس کوئی مخالف یا ایسا شخص بیٹھتا جسے دینی مسائل میں کچھ اختلاف ہوتا تو آپ اپنی سحر بیانی سے

---

[1] مولوی محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی، آتش و آب و خاک و باد، وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل کہے اسے میں استاد مانتا ہوں، دوسرے مشاعرہ میں استاد ذوق نے (جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے) اسی پر غزل پڑھی، شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے، جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا، شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا" آب حیات ص ۴۵۲-۴۵۳" از مصنف

آگ اور پانی اور متضاد چیزوں میں اتحاد پیدا کر دیتے، اور وہ آپ سے متفق وہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:۔

"وہ فضل و کمال اور شہرت و مقبولیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ اطراف ہند کے لوگ ان سے انتساب بلکہ آپ کے تلامذہ و منتسبین سے بھی ادنیٰ نسبت پر فخر کرتے تھے.......آپ کے ان کمالات میں جن میں آپ کا کوئی معاصر آپ کا مقابل نہ تھا، آپ کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی بھی تھی، جس کے سبب آپ بحث میں غالب آتے اور مخاطب کو لاجواب کر دیتے، انھیں کمالات میں آپ کی قادر الکلامی حسن تعبیر و خوبیٔ تحریر بھی تھی جس میں اہل نظر نے آپ کو سب پر فائق تسلیم کیا تھا"

آپ کے ایسے ہی کمالات میں آپ کی بے مثل فراست بھی تھی، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کی امتیازی صلاحیت عطا کی تھی، آپ خواب کی ایسی تعبیر دیتے جو پوری ہوتی تھی اور آپ کی چشم دید معلوم ہوتی تھی، یہ صلاحیت بڑے پاک نفس انسانوں ہی کے حصہ میں آتی ہے، ان کے علاوہ بھی آپ کے متعدد فضائل و کمالات ہیں، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں نوع بہ نوع اور گوناگوں فضائل جمع کر دیئے تھے، جو ابنائے دہر میں پھیلے ہوئے تھے، اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اس کو صاف معلوم ہوتا کہ اس کا مبالغہ بھی قاصر ہے ؎

ولم أر أمثال الرجال تفاوتا لدى المجد حتى عُدَّ ألفٌ بواحد

(میں نے انسانوں کی طرح فرق مراتب نہیں دیکھا جس کے سبب ہزار انسان ایک کے برابر شمار ہوتے ہیں۔)

اس صورت میں آپ کے مفاخر و فضائل کا شمار کون کر سکتا ہے؟ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی سب تصنیفات علماء کے حلقوں میں بالعموم وقعت و قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے، ان کے اسلوب تحریر میں ایسی قوت اور فصاحت و سلاست ہے کہ

کان ان سے حلاوت پاتے ہیں، اور دل ان سے لذت یاب ہوتے ہیں، ان کے کلام میں تاثیر وتسخیر کی ایسی قوت ہے کہ اس سے متاثر و متفق نہ ہونا مشکل ہے، آپ کوئی کمزور اور قابل اعتراض تحریر دیکھتے تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی تردید فرماتے تھے، کلامی مسائل میں مذہب تشیّع آپ کا خاص موضوعِ بحث وتنقید رہا ہے، آپ نے ایسے عالمانہ و متکلّمانہ انداز سے اس پر بحث کی ہے کہ اس کا جواب شافی ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

آپ کی مشہور تصانیف میں یہ کتابیں ہیں:۔

تفسیر قرآن مسمّیٰ بہ "فتح العزیز" جسے آپ نے شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املاء کرایا تھا، یہ کئی بڑی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا، اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں، انھیں میں "الفتاوی فی المسائل المشکلۃ"[1] بہت ضخیم تھی، مگر اب اس کا خلاصہ دو جلدوں میں ملتا ہے، انھیں کتابوں میں "تحفۂ اثنا عشریہ" (جو مذہب شیعہ کی تنقید و تردید میں ہے) ایک بے مثل کتاب ہے، دوسری کتابوں میں "بستان المحدّثین"[2] ہے جو کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست و تذکرہ ہے، جو نامکمل رہی، "العجالۃ النافعۃ" اصول حدیث میں ایک فارسی رسالہ ہے، طلبہ حدیث کے حفظ کے لئے بھی ایک رسالہ ہے "میزان البلاغۃ" علم بلاغت کا ایک بہترین متن ہے، اسی طرح "میزان الکلام" علم کلام میں ایک متن ہے، ایک رسالہ "السرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل" ہے، جس میں خلفائے راشدینؓ کے فرق مراتب پر گفتگو ہے، ایک رسالہ "سرّ الشہادتین" جو شہادت

---

[1] حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا پایہ فقہ حنفی میں بہت بلند تھا، اس میں ان کو رسوخ کامل اور تفقّہ کا درجہ حاصل تھا اور بعض اہل نظر کے نزدیک وہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بھی فائق تھے۔ (مصنف)

[2] اس کتاب سے شاہ صاحب کی طبقات محدثین اور کتب حدیث پر وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات حسنین رضؓ کے بیان میں ایک عمدہ رسالہ ہے، ایک رسالہ انساب میں ہے، ایک رسالہ "تعبیر رؤیا" پر ہے، ان کے علاوہ اور بھی رسائل ہیں، منطق وحکمت کی کتابوں میں "میر زاہد رسالہ" "میر زاہد ملا جلال" "میر زاہد شرح مواقف" پر آپ کے حاشیے ہیں" حاشیہ ملا کو سبح" پر "عزیزیہ" کے نام سے آپ کا حاشیہ ہے، صدر شیرازی کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" پر بھی آپ کا حاشیہ ہے "ارجوزۂ اصمعی" کی شرح بھی لکھی ہے، علماء وادباء کے نام آپ کے بہت سے خطوط بھی ہیں، اپنے والد ماجدؒ کے قصائد بائیہ وہمزیہ کی نفیس تخمیس بھی کی ہے[1] نظم ونثر، قوت تحریر، حسن انشاء، خوبیٔ تعبیر میں آپ اپنی مثال تھے، آپ کی تحریریں برجستگی، وبدیہہ گوئی، قلم کی روانی اور زود نویسی کی اچھی مثال ہیں۔

نماز فجر کے بعد یکشنبہ ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو اسیؔ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر دہلی میں شہر کے باہر آپ کے والد ماجد کے قریب ہے۔[2]

شاہ صاحب [illegible] و تکمیل

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامہ کو ہم پانچ شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی ترجمانی، مسلمانوں میں اس کی تعلیمات ومضامین کی اشاعت عام، اس کے ذریعہ سے عقائد کی اصلاح اور دین خالص سے عوام کے براہ راست ربط وتعلق کی سعی جمیل۔

---

[1] شاہ صاحب کا عربی کلام بالخصوص ان کا قصیدۂ لامیہ (جو ان کے ترجمہ میں "نزہۃ الخواطر" میں منقول ہے) عربیت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عربی کلام سے بھی فائق معلوم ہوتا ہے، اہل زبان کی سی یہ عربیت ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید مفتی صدر الدین خاں صاحب کے عربی کلام میں نظر آتی ہے، ملاحظہ ہو وہ ابیات جو نمونۂ کلام کے طور پر "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" اور "نزہۃ الخواطر" میں مفتی صاحب کے تذکرہ میں منقول ہیں۔ (مصنف)

[2] "نزہۃ الخواطر" ج ۷، ص ۲۶۸-۲۷۶ باختصار خفیف۔

۲۔ حدیث کی نشر و اشاعت، اس کے درس و اجازت کے سلسلہ کا احیاء، اس کے حلقہائے درس کا اجراء اور اساتذۂ حدیث اور شارحین کتب حدیث کی تربیت۔

۳۔ فتنۂ رفض و تشیّع کا مقابلہ، صحابہ کرامؓ اور قرآن عظیم کو مجروح و مشکوک بنانے والی کوششوں اور سازشوں کا سدّ باب۔

۴۔ جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء اور ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور مسلمانوں کی آزادی کے لئے بڑے خطرے اور چیلنج کا مقابلہ۔

۵۔ ان مردان کار کی تربیت جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں۔

اشاعت و تبلیغ قرآن

جہاں تک عوام تک قرآن مجید کے پہونچانے اور اس کے ذریعہ سے عقائد باطلہ اور رسوم فاسدہ کی اصلاح اور ربط مع اللہ کی کوشش کا تعلق ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں اپنے والد بزرگوار کے کام کو بہت ترقی دی، اور اس میں بڑی عمومیت اور وسعت پیدا کر دی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا درس قرآن سورہ نساء کی آیت " اعدلوا ھو اقرب للتقوىٰ " تک پہونچا تھا کہ آپ کی وفات ہو گئی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہیں سے درس شروع کیا، سورہ حجرات کی آیت " ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " تک پہونچے تھے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کے سلسلہ حیات کے ساتھ ختم ہوا، آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسہ (جو کلیۃً آپ ہی کے تربیت یافتہ اور آپ کے صحیح جانشین تھے) شاہ محمد اسحاقؒ صاحبؒ نے درس شروع کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا درس قرآن ہر ہفتہ سہ شنبہ و جمعہ کے روز ہوتا تھا جس میں خواص بطریقِ خاص اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، اس درس میں آپ کی طبیعت اپنے پورے جوش پر ہوتی تھی، اور مضامین کی آمد سیلِ رواں کی طرح[۱]، اس درس سے دار السلطنت دہلی میں (جو علماء و فضلاء کا بھی مرکز تھا) قرآن مجید کا ذوق عام ہوا، اصلاح عقائد کی ایک طاقتور رو چلی، اور ترجمۂ قرآن اور درس تفسیر کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت تک اس برصغیر میں جاری ہے، اور جس سے لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی، اور ان کے دل و دماغ حلاوتِ توحید اور لذّت قرآن سے آشنا ہوئے، خود مدارس عربیہ میں اسی درس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء کے اثر سے متنِ قرآن کے درس و افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہوا، جس کو نصاب درس میں مختصر تفسیر[۲] کی شکل میں تبرکاً جگہ دی گئی تھی، اور علمائے دنیا کا پھیلایا ہوا یہ طلسم ٹوٹا کہ قرآن مجید کی اشاعت عوام میں بڑے دینی خطرات، بلکہ ضلالت کا پیش خیمہ ہے، اس میں یہ مخفی اندیشہ کام کر رہا تھا کہ عوام ان پیشہ ور علماء کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، جنھوں نے قرآن کو چیستان بنا رکھا تھا، اور عوام کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ تفسیر "فتح العزیز" کی شکل میں ہے، جسے "تفسیر عزیزی" اور "بستان التفاسیر" کا نام بھی دیا گیا ہے، یہ شاہ صاحبؒ کی باقاعدہ املا کی ہوئی مستقل تصنیف ہے، خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق وہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ، پھر سورۃ الملک، آخر قرآن تک ہے[۳]، لیکن سورۂ بقرہ مکمل نہیں ہو سکی (جس کے اسباب معلوم نہیں ہو سکے) صرف ربع پارۂ دوم کے قریب تک آیت "اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" تک طبع ہو سکی، اصل فارسی تفسیر کے

---

[۱] ملاحظہ ہو ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ص۱ [۲] قدیم درس میں جلالین کامل اور بیضاوی شریف (سورۂ بقرہ) ہوتی تھی، پورے متن قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا رواج نہ تھا۔

[۳] مقدمہ تفسیر "فتح العزیز" از حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ص۳، مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کا سلسلہ برادر بزرگ مولانا محمد بن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریک و تقاضے سے ۱۲۰۸ھ میں شروع کیا گیا۔

متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، کتاب تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لے کر پارۂ دوم کے ربع کے قریب تک ہے، دوسری جلد سورۃ الملک (انتیسویں[۲۹] پارے) سے لے کر آخر سورۃ المرسلات تک ہے، تیسری جلد سورۂ "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ" (سورۂ نباء) سے شروع ہو کر آخر قرآن مجید یعنی سورۃ النّاس کے ختم تک ہے۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے شاگرد رشید علامہ حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) صاحب "منتہی الکلام" نے اس کا تکملہ لکھا، صاحبِ "مقالات طریقت" لکھتے ہیں کہ: "مولوی حیدر علی صاحبِ "منتہی الکلام" نے حسبِ خواہش سکندر بیگم والیِ بھوپال تفسیر "فتح العزیز" کا تکملہ ستائیس[۲۷] جلدوں میں کیا، راقم نے دیکھا ہے[۱]"

یہ تکملہ صرف پانچویں[۵] پارے کے اختتام تک کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ملتا ہے، ابتدا کے ایک دو ورق نہیں ہیں۔

ایک کتاب (اردو میں) "تفسیر عزیزی" المعروف بوعظِ عزیزی کے نام سے مطبع انصاری دہلی کی چھپی ہوئی بھی ملتی ہے جس میں اس کے مرتّب ابو الفرید محمد امام الدین صاحب کی تصریح کے مطابق شاہ صاحب کا درس قرآن و حدیث (جو ہر سہ شنبہ اور جمعہ کو ہوتا تھا) قلمبند کر کے پیش کیا گیا ہے، یہ ۱۲۵۹ھ کی تالیف ہے، اور سورۃ المومنون سے سورۃ الصّافّات تک ہے۔

لیکن اس عدم تکمیل کے باوجود اس تفسیر میں بہت سے ایسے نکات و تحقیقات ہیں جو بہت سی مشہور تفاسیر میں نہیں ملتیں، شاہ صاحب کے درس تفسیر اور آپ کی کتاب تفسیر فتح العزیز میں ان مسائل پر خاص طور پر محققانہ کلام کیا گیا ہے، جن کے بارے میں اس وقت کے علماء نے تحقیق و صاف بیانی سے کام نہیں لیا تھا، اور اس کی وجہ سے عوام کی ایک بڑی تعداد فسادِ عقیدہ اور مشرکانہ اعمال تک میں گرفتار تھی، مثلاً آیت "وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" کی تفسیر جو اس کتاب کے خصوصی مقامات میں سے ہے، اسی طرح سحر کی بحث ("وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ" الخ کے ذیل میں)

---

[۱] مقالاتِ طریقت ص۳۳

اور بعض دوسری آیات کے سلسلہ میں تحقیقات نادرہ اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہیں۔

حدیث کی تدریس و ترویج

جہاں تک درس حدیث اور اس کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے آپ نے درس حدیث کی مدت تقریباً چونسٹھ سال کی ہے اس مدت میں آپ نے نہ صرف صحاح کا درس دیا اور بستان المحدثین العجالۃ النافعہ جیسی مفید کتابیں تصنیف کیں جو حدیث کا صحیح ذوق طبقات حدیث سے واقفیت اور محدثین کا مرتبہ شناس بناتی اور اصول سے واقف کرد[illegible] [illegible]رین گیا سیکڑوں صفحات کا عطر آگیا ہے آپ نے حدیث کے ایسے اساتذہ کا [illegible] [illegible] [illegible]ار انزرین پیدا کئے جنھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا اور ایک عالم کو مستفید کیا آپ کے ان باکمال تلامذہ کی تعداد جن کے تراجم صرف "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم میں موجود ہیں چھپن سے اوپر ہے ان میں وہ حضرات جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور انھوں نے حدیث کے دوسرے شیوخ و اساتذہ پیدا کئے حسب ذیل ہیں:-

مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی محدث، مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدر الدین دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے آپ سے حدیث کی سند لی ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کا استقصاء مشکل ہے یہاں ان چند حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں، جو اپنے بعض دوسرے کمالات، یا سلسلۂ طریقت، یا شہرت کے لحاظ سے امتیاز خاص رکھتے ہیں:-

حضرت شاہ غلام علی دہلوی (خلیفہ اعظم حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ)

حضرت شاہ ابو سعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت شاہ احمد سعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ (خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی)

مولانا بزرگ علی مارہروی (استاد مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی)

شاہ بشارت اللہ بہرائچی (مجددی سلسلہ کے ایک بڑے شیخ)

شاہ پناہ عطا سلونوی (سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک بڑے شیخ جن کو مکاتبۃً اجازت حاصل تھی)

شیخ ظہور الحق پھلواروی۔

ان تلامذۂ حدیث اور تربیت یافتہ شیوخ میں حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے ذریعہ ہوئی جنھوں نے ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز ترین علماء نے حدیث کی سند لی۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ معروف بہ میاں صاحب، قاری عبد الرحمٰن صاحب، پانی پتی، مولانا سید عالم علی مراد آبادی، مولانا مفتی عبد القیوم ابن مولانا عبد الحی بڑھانوی (خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ) حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، نواب قطب الدین دہلوی (مصنف مظاہر حق) مولانا احمد علی سہارنپوری (محشّی و ناشر صحیح بخاری) مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاد استاد العلماء مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی) اور بہت سے علماء ہیں جن کی فہرست طویل ہے، بقول صاحب "نزہۃ الخواطر" ہندوستان میں یہی سند حدیث باقی رہی۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے تلامذہ میں تنہا مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) نے دہلی میں سالہا سال حدیث کا درس دیا اور آپ کے درس سے متعدد جلیل القدر ناشرین و شارحین حدیث پیدا ہوئے، جن میں مولانا عبد المنان وزیر آبادی (جن کے کثیر التعداد تلامذہ پنجاب میں مصروف درس و افادہ تھے) عارف باللہ سید عبد اللہ غزنوی امرتسری اور اُن کے

فرزند جلیل مولانا سید عبدالجبار غزنوی امرتسری (والد مولانا سید داؤد غزنوی) مولانا شمس الحق ڈیانوی مصنف غایۃ المقصود، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا غلام رسول قلعوی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا امیر احمد سہسوانی، مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری ابو محمد مولانا ابراہیم آروی صاحب طریق النجاۃ، مولانا سید امیر علی بلیح آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، (اور علمائے عرب میں سے) شیخ عبداللہ بن ادریس الحسنی السنوسی، شیخ محمد بن ناصر النجدی، شیخ سعد بن احمد بن عتیق النجدی، کے نام اس درس کی وسعت وافادیت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (م ۱۲۹۶ھ) بھی شامل ہیں، جن سے ہندوستان کے کبار علماء واساتذۂ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے، اور ان کے ذریعہ سارا ہندوستان حدیث کے نور سے منور اور معمور ہوگیا، اور اس وقت کے سارے حلقہائے درس اور مدارس عربیہ انھیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تلامذہ کبار میں مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ صاحب بذل المجہود کا نام لینا کافی ہے، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے تلامذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مصنف اوجز المسالک وغیرہ کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں مولانا سید احمد حسن امروہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحبؒ

کے علو اسناد، عموم فیض اور بلند مرتبہ کے لئے ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بن یحیی ترہتی کی مشہور کتاب "الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی" کا مطالعہ معلومات افزا و بصیرت افروز ہے۔

نصرتِ سنّت وردِّ شیعہ

جہاں تک فتنہ رفض و تشیّع کے مقابلہ اور اس کے اثر سے اہل سنت کو محفوظ رکھنے کے کارنامہ کا تعلق ہے، اور جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی بے نظیر کتاب "ازالۃ الخفاء" سے کی تھی، اس کی تکمیل اور تقویت حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" سے کی، جو ان کتابوں میں ہے، جن کو ــــــ تاریخ ساز کہا جا سکتا ہے، اور جس طرح ملا محب اللہ بہاری کی تصانیف "سلّم العلوم" اور "مسلّم الثبوت" نے تقریباً سو برس تک علمائے ہند کو اپنی شرح و تحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی بہترین ذہانتوں اور توانائیوں کو مرکوز کر لیا[1]، اسی طرح اس کتاب کے جواب نے ممتاز ترین شیعہ علماء کو تصنیف و تالیف میں مشغول کر دیا، تنہا عبقات جس کا پورا نام "عبقات الانوار فی إمامۃ الأئمۃ الأطهار"[2] ہے، اور جس کے مصنف مولوی سید حامد حسین صاحب کنتوری (م ۱۳۰۶ھ) ہیں، آٹھ جلدوں میں لکھی گئی،

---

[1] مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند" مطبوعہ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق اور اس کے اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ سے ان شروح و حواشی کی حیرت خیز تعداد معلوم ہو سکتی ہے، جو ان دونوں کتابوں بالخصوص سلّم کی شرح میں لکھی گئیں۔ [2] کتاب کے متعدد اجزاء لکھنؤ و لدھیانہ کے مختلف مطابع میں شائع ہوئے ہیں۔

اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی جلد اول ۱۲۵۱ صفحات میں، جلد دوم ۹۷۷ صفحات میں، سوم ۶۰۹ صفحات میں، چہارم ۳۹۹ صفحات میں، پنجم ۵۴۷ صفحات میں، ششم کل صفحات ۷۰۴، بقیہ حصص علیٰ ہذا القیاس ـــــــــ پوری کتاب ۳۰ حصوں میں ہے، مصنف کے فرزند مولوی سید ناصر حسین صاحب نے کتاب کی تکمیل کی، کتاب نجوم السماء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سید حامد حسین صاحب کے علاوہ مولوی دلدار علی صاحب مجتہد اول، حکیم مرزا محمد کامل دہلوی، مفتی محمد قلی خاں کنتوری، اور سلطان العلماء سید محمد صاحب نے بھی اس کتاب کی تردید میں اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ضخیم کتابیں تصنیف کیں، یہ سلسلہ مرزا ہادی رسوا لکھنوی پر جا کر ختم ہوا، جو ادب و فلسفہ کے میدان کے آدمی تھے، لیکن انھوں نے بھی اس کار خیر میں حصہ لینے کی کوشش کی۔

تدریسی مشغولیت و انہماک، درس تفسیر و حدیث، اشاعت کتاب و سنت، بیعت و ارشاد و تربیت مریدین، افتاء و فصل خصومات کی ہوش رُبا مشغولیت میں اور مختلف عوارض و امراض کی موجودگی میں شاہ صاحب رح کو اس مسئلہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا خیال اور ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی فرصت کیسے ہوئی جس کے لئے بیسیوں کتابوں اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ اور ذہنی یکسوئی اور توجہ کامل ضروری تھی؟ اس کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط و آخر (اٹھارویں صدی کے نصف آخر کی) ہندوستان بالخصوص شمالی ہند، دہلی اور اس کے اطراف، اور اودھ، بہار و بنگال کے مسلم معاشرہ و تمدن کی صورت حال پر گہری نظر نہ ہو، اور اس ذہنی انتشار، دینی تشکیک اور مسلمان خاندانوں بالخصوص شرفاء، اہل حکومت اور صاحب اثر طبقہ پر تشیّع کے اثرات اور اس کے اقدامی و جارحانہ رویّہ سے واقفیت نہ ہو، اس کا اندازہ وہ شخص نہیں کرسکتا جس نے ہمایوں کے

ایران سے واپس آنے کے بعد سے فرخ سیر اور اس کے بعد تک کے سیاسی و انتظامی انقلابات ایرانی النسل امراء و علماء کے اثر و نفوذ، سید برادران (حسن علی خاں اور حسین علی خاں) کے دربار دہلی پر اثر و رسوخ، پھر دہلی میں نواب نجف علی خاں کے تسلط کی تفصیلات[۱]، نیز اودھ میں نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نیشاپوری کے خاندان کی حکومت قائم ہو جانے اور شجاع الدولہ کے بعد سے شیعیت کے اثرات کا جائزہ نہ لیا ہو، اس کا کسی قدر اندازہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جو تحفہ کے مقدمہ میں ان کے محتاط قلم سے نکلا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"اس ملک میں جس میں ہم سکونت پذیر ہیں، اور اس زمانہ میں جو ہمارے حصہ میں آیا ہے، مذہب اثنا عشری کا رواج اور اس کے شیوع کی نوبت اس حد تک آ گئی ہے کہ (سنیوں کے) کم گھر ہوں گے، جن میں ایک دو شخص اس گھر کے اس مذہب کے پیرو، اور اس عقیدہ کی طرف راغب نہ ہوں، ان میں سے اکثر علم تاریخ و اخبار سے بے خبر اور اپنے اسلاف کے حالات و اصول سے ناواقف اور غافل نظر آتے ہیں، جب مجالس اور محافل میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو کچھ بیانی

---

[۱] نواب نجف علی خاں کا دہلی پر مکمل تسلط و اقتدار تھا، اور وہ کھل کر تشیع کے حامی اور اہل سنت کے مخالف تھے ان کی تعدی کے متعدد واقعات مشہور ہیں، جو خواہ کلیتہً صحیح نہ ہوں اور ان میں مبالغہ یا تعصب سے کام لیا گیا ہو مگر ان کی کچھ اصل ضرور ہے، غالباً اس تعدی سے بچنے کے لئے، شاہ صاحبؒ نے تحفہ کی تصنیف کی نسبت اپنے مشہور نام کے بجائے، اپنے تاریخی نام "غلام حلیم" کی طرف کی ہے، اور سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے۔

"مصنفہ عالم باعمل فاضل اکمل حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد بن شیخ ابوالفیض دہلوی قدس سرہم" کتاب کا جواب لکھنے والوں نے جہاں مصنف کا حوالہ دیا ہے، وہاں "فاضل عزیز" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اور خلط مبحث سے کام لیتے ہیں، اس غرض کے لئے حسبۃً للہ تعالیٰ یہ رسالہ ترتیب
دیا گیا تاکہ بحث و مناظرہ کے وقت اس مذہب کے پیرو پٹری سے اترنے نہ پائیں،
اور خود اپنے اصول کے منکر نہ ہوں، اور ان بعض امور میں جو حقیقت پر مبنی ہیں،
شک و تردّد کو راہ نہ دیں[1]۔"

شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں ان مناظرانہ اور متکلمانہ کتابوں اور اسلوب کی پیروی نہیں کی، جو کسی مخالف فرقہ کی تردید و ابطال میں لکھی جاتی ہیں، اور ان کی خاص زبان ہوتی ہے، اولاً اس کتاب میں مذہب تشیّع کے پیدا ہونے اور اس کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے کا بیان ہے، اسی طرح فرقۂ شیعہ کے اسلاف علماء اور ان کی کتابوں کا تعارف ہے، پھر خلافت کی بحث اور مطاعن صحابہؓ اور ان کے جوابات پر اکتفا کرنے کے بجائے اصولی مسائل، الٰہیات، نبوت، معاد، اور امامت پر مستقل ابواب تحریر کئے گئے ہیں، پھر خلفائے ثلاثہ، اور حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہؓ پر شیعوں کی طرف سے جو اعتراضات اور قدح کی گئی ہے، ان کا مفصل جواب ہے، پھر مذہب شیعہ کے خواص، ان کے اوہام و تعصّبات پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی غلطیوں اور غلط فہمیوں پر تبصرہ ہے، آخری باب (دوازدہم) تولّا و تبرّا پر مشتمل ہے، جو دس مقدمات پر مبنی ہے، کتاب بڑی تقطیع اور باریک طباعت میں ۸۰۰ صفحات میں آئی ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی حلاوت و سلاست اور برجستگی ہے جس کا اعتراف ہندوستان اور ایران کے متعدد شیعہ علماء نے بھی کیا ہے، خود نام سے اس طرز فکر اور قصد و ارادہ کا اظہار ہوتا ہے، جو اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا ہے، اس کے مقابلہ میں

---

[1] تحفۂ اثنا عشریہ ص۲ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۲۵ھ

جو کتابیں لکھی گئیں، ان کے ناموں سے اکثر غضب و اشتعال کا اظہار ہوتا ہے اور سیف و سناں کی چمک ظاہر ہوتی ہے، مثلاً ایک کتاب کا نام "صوارم الإلٰھیات" ہے ایک کا "حسام الإسلام" ایک کا "سیف ناصری" ایک کا "ذوالفقار"۔

اس عہد میں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کی تصنیف نے جو وقت کی ایک ضرورت تھی، کیا خدمت انجام دی، راقم نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدر آباد سے (جن کا خاندان حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور ان کے خلفاء سے وابستہ رہا ہے) خود سنا کہ "اس کتاب کی تصنیف نے شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے مقابلہ میں ایک مضبوط پشتہ کا کام کیا" یہ کتاب شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہو گئی تھی[1]، اور اس کے جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، شاہ صاحبؒ کے ایک فاضل شاگرد مولوی اسلمی مدراسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، راقم نے یہ ترجمہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے کتب خانہ واقع باب جبریل مدینہ طیّبہ میں دیکھا ہے۔

انگریزی اقتدار کی مخالفت اور مسلمانوں کا ملّی تحفّظ

جہاں تک ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت اور مسلمانوں کی آزادی کی راہ میں پیش آنے والے خطرے اور چیلنج کے مقابلہ کا تعلق ہے، شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں حالات کے اس حقیقت پسندانہ جائزہ، بیدار مغزی، دور بینی اور شان عزیمت کا نمونہ پیش کیا، جو ایک صاحبِ بصیرت و فراست عالم دین، داعی و مصلح، اور اپنے وقت کے دینی رہنما کے

---

[1] مقالات طریقت صـ۳۳

شایان شان ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں وقت کا سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کی تاخت اور ان کی اس فوج کشی و غارت گری کو روکنا تھا، جو ایک روزمرّہ کا واقعہ بن گیا تھا، اور جس سے ایک طرف سلطنت مغلیہ بے بس، بے اثر اور ذلیل ہو رہی تھی، دوسری طرف مسلمانوں کی عزت و ناموس محفوظ نہیں رہے، اور شہروں کی معمول کے مطابق زندگی باقی نہیں رہی تھی، اس وقت اس خطرہ کو دور کرنا، اور اس کو روکنے کے لئے کسی امکانی امداد کو حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گھر یا محلہ میں آگ لگنے کے وقت آگ بجھانے والے انجن و دستہ FIRE BRIGADE کو طلب کیا جاتا ہے، اور شاہ صاحبؒ کی نظر میں احمد شاہ ابدالی اور اس کی فوج کی یہی حقیقت تھی، اور ان سے یہی شرط ہو گئی تھی کہ اس آگ کو بجھانے کے بعد واپس چلے جائیں گے، شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے کا موقعہ دینے کے لئے اور کسی بہتر نظام کو اس کی جگہ لینے کے لئے (اگر اس کے بغیر چارہ نہیں ہے) ایک عارضی انتظام اور تدبیر کے درجہ کی چیز تھی جو اس وقت کے مغل تاجدار شاہ عالم کی دوں ہمتی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی، اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کی زمام اقتدار سنبھالنے، پھر اس وسیع ملک پر سات سمندر پار کی ایک ملک کی حکومت قائم ہو جانے کے وہ آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے، جو شاہ صاحبؒ کی توجہ کو پورے طور پر اس پر مرکوز کر دیتے۔

لیکن شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے بدلے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے تین سال بعد) بنگال، بہار، اڑیسہ تینوں صوبوں کی دیوانی بلاشرکت غیرے بطور "التمغا" (انعامی یا عطا شدہ جاگیر کی سند) سرکار کمپنی کو دی جا چکی تھی، سرکار بنارس اور غازیپور بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے، اب

خاندان تیموریہ کے بادشاہ شاہ عالم کے پاس ملک میں صرف ایک صوبہ الہ آباد تھا، اور آمدنی میں وہ روپیہ تھا، جو انگریز اس کو دیتے تھے، ۸ مارچ ۱۷۸۷ء (۱۲۰۲ھ) میں کلکتہ گزٹ میں شہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر و ذلیل ہو گئی ہے، ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے" ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو اور ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء (۱۱۷۸ھ) میں بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ کو شکست دی، ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں سلطان شہید سلطان ٹیپو نے سرنگاپٹن کے میدان میں شہادت حاصل کی، اور گویا ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی قسمت پر مہر لگ گئی، سلطان شہید کی نعش دیکھ کر جنرل ہارس HARRIS نے بجا طور پر کہا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"[1]۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جو دہلی میں مصروف درس و افادہ تھے، لیکن ان کی حقیقت بین نگاہ سارے ہندوستان پر تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی طور پر حقیقت پسند ذہن اور صاحبِ حمیّت و عزیمت طبیعت عطا فرمائی تھی، اس انقلاب کا پورا جائزہ لیا، اور اس نتیجہ تک پہونچ گئے کہ اس وقت بچے کھچے اسلامی اقتدار اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خطرہ انگریز ہیں، ان کے ایک عربی شعر میں اس حقیقت کی پوری عکاسی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے اثرات کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں سمجھتے تھے، ان کو اس سے زیادہ وسیع اور دوررس سمجھ رہے تھے، وہ فرماتے ہیں :۔

وإني أرى الافرنج أصحاب ثروة لقد أفسدوا ما بين دهلي وكابل

(میں فرنگیوں کو جو دولت کے مالک ہیں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے)

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود خاں محمود بنگلوری ص ۲۶۶

ہمارے علم میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس وقت ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی جرءت کی، اور صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے فقہ واصول فقہ کی روشنی میں مسئلہ کی ایسی تنقیح کی جس سے ان کی بصیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور اخلاقی ودینی جرءت کا بھی، فتاویٰ عزیزی جلداول میں اس سوال کے جواب میں کہ دارالاسلام دارالحرب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ "دُرِّ مختار" کی ایک طویل عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"اس شہر (دہلی) میں امام المسلمین کا حکم اصلاً جاری نہیں ہے، نصرانی حکّام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے فقہاء جس کو اجرائے احکام کفر کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ملکداری کے معاملہ، رعایا کے بندوبست، خراج وباج، اور اموال تجارت کے عشور کے وصول کرنے، ڈاکوؤں، چوروں کو سزادینے فصلِ خصومات اور جرائم کی تعزیر میں کفار بطور خود حاکم ومختار ہوں، اگر بعض اسلامی احکام جیسے جمعہ اور عیدین، اذان وذبح بقر سے وہ تعرّض نہ کرتے ہوں لیکن اصل الاصول یہی ہے کہ یہ چیزیں ان کے رحم وکرم پر ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مساجد کو بے تکلف منہدم کردیتے ہیں، کوئی مسلمان، یا (غیر مسلم) ذمّی ان کی اجازت کے بغیر اس شہر اور اس کے نواح میں داخل نہیں ہوسکتا، اپنی منفعت کے لئے وہ باہر سے آنے والوں، مسافروں، اور سوداگروں کو منع نہیں کرتے لیکن دوسرے ذی وجاہت لوگ مثلاً شجاع الملک، ولایتی بیگم بغیر ان کے حکم کے ان شہروں میں داخل نہیں ہوسکتے، اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی عملداری پھیلی ہوئی ہے، ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں انھوں نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں،

۱۔ فتاویٰ عزیزی (حصہ اول)

کچھ تو اپنے مصالح کی بنا پر اور کچھ ان ریاستوں کے حکام کے ان کی اطاعت قبول کر لینے کی بنا پر[1]"

حضرت شاہ صاحبؒ کے خیالات کا، اور وہ انگریزوں کو جس نظر سے دیکھتے تھے، پورا عکس ان کے جلیل القدر خلیفہ اور تربیت یافتہ داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے خیالات و جذبات میں پایا جاتا ہے، جن کی صاف جھلک آپ کے خطوط میں نظر آتی ہے، جو آپ نے اس وقت ہندوستان کے بعض ذی اثر و صاحبِ حکومت رؤسا، اور بعض غیر ملکی مسلمان اہل حکومت کو لکھے ہیں، شاہ سلیمان والیٔ چترال کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

قضارا از مدت چند سال حکومت	تقدیر سے چند سال سے ہندوستان
وسلطنت ایں ملک برایں عنوان	کی حکومت و سلطنت کا یہ حال
گردیدہ کہ نصارا نکوہیدہ خصال	ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین
ومشرکین بد مآل بر اکثر بلاد ہند استیلاً	نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر
یافتند و آں دیار را بظلمات ظلم و بیداد	غلبہ حاصل کر لیا ہے، اور ظلم و بیداد
مشحون ساختند[2]	شروع کر دی ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہندو راؤ وزیر گوالیار کو لکھتے ہیں :-

بررائے سامی روشن و مبرہن است کہ	جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی
بیگانگان بعید الوطن، ملوک زمین	سمندر پار کے رہنے والے، دنیا
وزمن گردیدہ، و تاجران متاع فروش	جہاں کے تاجدار اور یہ سودا

---

[1] فتاویٰ عزیزی جلد اول مطبوعہ مطبع مجتبائی، دہلی ص۱۱۴ [2] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص۳۸۹

بہ پایہ سلطنت رسیدہ، امارت	پہنچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے
امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی	ہیں، بڑے بڑے اہل حکومت کی
مقدار برباد نمودہ اند، و عزت	حکومت اور ان کی عزت و حرمت
واعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔[1]	کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔

غلام حیدر خاں کے نام لکھتے ہیں، جو گوالیار کے ایک فوجی افسر تھے :۔

اکثر بلاد ہندوستان بدست	ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں
بیگانگان افتادہ وایشاں ہر جا بنائے	کے قبضہ میں چلا گیا ہے، اور انھوں نے
وآئین جور و ظلم نہادہ، ریاست	ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لی
رؤسائے ہندوستان برباد رفتہ۔[2]	ہے، ہندوستان کے حاکموں کی
	حکومت برباد ہو گئی۔

سید صاحبؒ کے اس خط سے جو انھوں نے شہزادہ کامران کو لکھا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد سے آپ کا مقصود اصلی ہندوستان تھا، جو بتدریج انگریزوں کے قبضہ میں چلا جا رہا تھا، خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

باز خود ایں جانب معہ مجاہدین صادقین	اس مہم (سرحد و پنجاب) سے
بہ سمت بلاد ہندوستان بنا بر	فراغت کے بعد یہ خاکسار مع مجاہدین
ازالہ کفر و طغیان متوجہ خواہد شد،	صادقین کفر و طغیان کے ازالہ کی
کہ مقصود اصلی خود ہندوستان	نیت سے ملک ہندوستان کی طرف
است۔[3]	متوجہ ہوگا کہ وہی مقصود اصلی ہے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۳۸۹-۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹۰ [3] ایضاً

اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ سید صاحبؒ ۱۲۲۷ھ میں (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات سے بارہ سال پہلے) امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، جو اس وقت انگریزوں سے برسرِپیکار تھے، ان کے ساتھ ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر، مسلمانوں کا گرم و تازہ خون، ہندوستان کی فاتح طاقت کا بچا کھچا سرمایہ، اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے، یہ ہندوستان میں ایک بڑھتی ہوئی آزاد طاقت تھی، جس کو وقت کا کوئی مبصر نظر انداز نہیں کر سکتا اور جس کو بامقصد اور منظم بنا کر انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں لایا جا سکتا تھا،[1] کہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسی حوصلہ مند طاقتوں نے اپنی عددی اور سلاحی کمزوری کے باوجود حالات کا رخ بدل دیا ہے، اس کا کوئی تحریری ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی صریح ہدایت اور حکم سے نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، لیکن اس کا قرینہ ضرور پایا جاتا ہے کہ یہ اقدام حضرت شاہ صاحبؒ کے ایماء پر یا کم سے کم تائید و پسندیدگی پر ہوا، اس لئے کہ ۱۲۳۳ھ میں جب نواب نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور راجپوتانہ اور مالوہ کے چند متفرق اور غیر اہم حصوں پر قناعت کر کے جن کے مجموعہ کا نام ریاست ٹونک تھا، انگریزوں سے جنگ کرنے سے علیحدگی اختیار کر لی، اور سید صاحبؒ نے اب وہاں مزید قیام بے سود سمجھا تو آپ نے علیحدگی کا فیصلہ فرمایا اور ایک خط حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو لکھا جس کا مضمون تھا:۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول۔ امیر خاں مرحوم کو پنڈاروں سے جن کو انگریزی تاریخوں، اور ان سے متأثر مؤرخوں کی کتابوں میں ایک راہزن اور تخریبی گروہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے، کوئی تعلق نہ تھا، اصلیت صرف اتنی ہے کہ پنڈارے کبھی کبھی ان کی پناہ لے لیتے تھے، اور وہ ان کو فوری خطرہ سے بچا لیتے تھے۔

"خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا،
نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں" [1]

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ سفر شاہ صاحبؒ کے ایماء و مشورہ سے ہوا تھا، اس لئے واپسی پر آپ کو اس کی اطلاع دینی ضرور تھی۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اس خطرہ کے پہچاننے میں جو مسلمانوں اور ہندوستان کو درپیش تھا، خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست سے کام لیا، اور اس کے لئے وہ اپنے زمانہ میں جو تدبیر کر سکتے تھے، اس میں کوئی کمی نہیں کی، ان کی یہی بصیرت اور جذبہ ان سے انتساب رکھنے والی جماعت مجاہدین (جس کی قیادت حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ صاحبؒ کے قابل فخر بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کر رہے تھے) میں پورے طور پر کارفرما نظر آتا ہے، اور جس کا پورا مظاہرہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صادقپوری، مولانا احمد اللہ، و مولانا عبد اللہ صاحب کی انگریزوں کے خلاف سرحدی جنگوں، اور صادقین صادقپور کی عظیم قربانیوں میں جلوہ فگن ہے، جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ [2]

پھر یہ جذبہ اس جماعت سے ان علماء اور دینی قائدین کی طرف منتقل ہوا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں اس کے لئے جان کی آخری بازی لگائی، اور جن میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسیؒ، مولانا لیاقت علی الہ آبادیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے نام معروف و مشہور ہیں، اور اس کے بعد ان علماء کی طرف جنھوں نے اس شمع کو روشن رکھا اور ۱۹۴۷ء تک اس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ ع

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) ص۸۵ نسخہ محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کاروان ایمان و عزیمت" از ص۴۴ تا ۶۱

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مردانِ کار کی تربیت

جہاں تک ان مردانِ کار کی تربیت کا تعلق ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں، اور جہد و جہاد کا بیڑہ اٹھائیں، یہ تقدیرِ اور حکمتِ الٰہی کی بات ہے کہ اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حصہ اپنے بہت سے مشائخ و اسلاف اور بعض ایسے حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے، جن کا درجہ ممکن ہے (اور قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں) کہ اللہ تعالےٰ کے یہاں ان سے بڑھا ہوا ہو، شاہ صاحبؒ کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت و عزیمت رکھنے والے صاحبِ تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا، جنھوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا، اور ایک پوری صدی سنبھال لی، شاہ صاحبؒ کے علم اور زندگی کے دریا کی سطح ساکن تھی، لیکن بقول اقبال ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

حضرت سید احمد شہیدؒ

اس دعوے کے ثبوت کے لئے تنہا ان کے خلیفۂ ارشد حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ) کا نام لینا کافی ہے جنھوں نے اس تحتی برِ اعظم میں اس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی جس کی نظیر جامعیت، قوتِ تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور

طریق نبوت سے قرب و مماثلت میں نہ صرف تیرہویں صدی میں نظر نہیں آتی جو اس کا عہد ہے، بلکہ گزشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفریں تحریک، اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ، اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے، اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار، اور ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا، بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ ہندوستان اور اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت اور قیام حکومت اسلامیہ علی منہاج الخلافۃ الراشدہ کی جدوجہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدّوجہد کی زمامِ قیادت ہندوستان میں اول اول اسی جماعت کے علماء اور قائدین کے ہاتھ میں رہی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، اور ترجمہ اور نشر و اشاعت کی جدید تحریک (جس نے اس وسیع و عمیق خلیج کو پُر کیا، جو مسلم عوام اور صحیح اسلامی تعلیمات اور کتاب و سنت کے درمیان پائی جاتی تھی) انھیں کی کوششوں کی رہین منّت ہے، مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری بالواسطہ اور بلا واسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ ہے، اس تحریک کے اثرات، علم و ادب، فکر اسلامی، اور زبان و اسالیب بیان پر بھی پڑے، اس نے اصلاح معاشرہ، جاہلی رسوم کے ابطال، ہندوانہ اثرات کے ازالہ اور صحیح اسلامی زندگی کی طرف بازگشت کا زبردست کام انجام دیا۔

سید صاحبؒ اور ان کی دعوت و تربیت کے اثرات کی وسعت، قوت اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں پر ہم چند اہل نظر کی تحریروں کے کچھ اقتباسات

پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف ومؤرخ نواب سید صدیق حسن خاں والی بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے سید صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور آپ کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا، اپنی تصنیف "تقصار جیود الاحرار" میں لکھتے ہیں:۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی وجسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہونچی، آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک وبدعت کے خس وخاشاک سے پاک کر دیا، اور کتاب وسنّت کی شاہراہ پر ڈال دیا، ابھی تک ان کے وعظ وپند کے برکات جاری وساری ہیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحبِ کمال سنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہ حق سے خلق خدا کو پہونچے ان کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء ومشائخ سے نہیں پہونچا۔"[1]

علامۂ عصر استاد الاساتذہ حضرت مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکی (م ۱۲۷۳ھ) تلمیذ حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ "صیانۃ الناس" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی ہدایت کا نور آفتاب کے مثل کمال زور وشور کے ساتھ بلاد وقلوب عباد میں منور ہوا، ہر ایک طرف سے سعیدان ازلی رخت سفر باندھ کر منزلوں سے

---

[1] تقصار جیود الأحرار من تذکار جنود الأبرار (فارسی) مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۸ھ ص ۱۱۰-۱۰۹

آآ کے شرک و بدعات وغیرہ منہیات سے (جن کے حسب عادت زمانہ خوگر ہو رہے تھے) توبہ کرکے توحید و سنت کی راہ راست اختیار کرنے لگے اور اکثر ملکوں میں خلفائے راست کردار جناب موصوف نے سیر فرماکر لاکھوں آدمی کو دین محمدیؐ کی راہ راست بتادی، جن کو سمجھ تھی، اور توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی، وہ اس راہ پر چلے[1]۔"

ہندوستان کے ایک باخبر اور ثقہ عالم دین مولوی عبدالاحد صاحب جنھوں نے اس جماعت قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی، اور جن کا زمانہ سید صاحبؒ سے قریب تھا، لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس[۴۰] ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس[۳۰] لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں[2]۔"

---

[1] "صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس" مطبوعہ ۱۲۷۰ھ ص۴

[2] سوانح احمدی، اس سلسلہ میں مزید شہادتیں اور حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) مولانا کرامت علی جونپوری (م ۱۲۹۰ھ) کے بیانات مصنف کے رسالہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" میں دیکھے جائیں، سید صاحبؒ کے مفصل حالات و کمالات کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہید" (۱۔۲۔۳۔۴) اور مصنف کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" (۱۔۲) کا مطالعہ کیا جائے، سید صاحبؒ کے خلفاء کے ذریعہ جو عمومی ہدایت و اصلاح ہوئی اور وہ جس درجہ کے صاحب تاثیر تھے اس کا کچھ اندازہ "الذکر الجلی فی کرامات السید محمد علی" (اردو) تصنیف افسر الدولہ جان جہاں خاں ابن نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ مطبوعہ ۱۳۰۵ھ مطبع مرغوب دکن سکندر آباد) سے ہو سکتا ہے جو سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا سید محمد علی واعظ رامپوری کے حالات و کرامات اور مدارس میں ان سے جو ہدایت و فیض پہونچا اس کے تذکرہ میں ہے۔

اسی عظیم الشان اصلاحی وتجدیدی کارنامہ کی بناء پر اکثر اصحاب نظر واہل انصاف آپ کو تیرہویں صدی کا مجدّد مانتے ہیں۔

مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کا دوسرا نمونہ آپ کے دو تلامذۂ رشید اورعزیز قریب مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ ہیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ خود ان دونوں کی فضیلت علمی اور تبحر کے قائل تھے، آپ نے ایک خط میں ان دونوں کو "تاج المفسّرین فخر المحدّثین سرآمد علمائے محقّقین" لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ :۔

"دونوں حضرات تفسیر وحدیث، فقہ واصول ومنطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں، جناب باری کی جو عنایت ان دونوں بزرگوں کے شامل حال ہے، اس کا شکر مجھ سے ادا نہیں ہوسکتا، ان دونوں کو علمائے ربّانی میں شمار کرو اور جو اشکال حل نہ ہو ان کے سامنے پیش کرو۔"[1]

مولانا عبدالحی صاحبؒ کا پایہ اہل علم کے نزدیک علوم رسمیّہ میں بہت بلند تھا، اور تفسیر میں خود شاہ صاحبؒ مولانا کو اپنے تمام تلامذہ پر فضیلت دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ وہ میرا نمونہ ہیں، شیخ الاسلام کا لقب جو اسلام میں خاص خاص علماء کو دیا گیا ہے، شاہ صاحبؒ نے خود مولانا کو ایک خط میں دیا ہے۔

علمی تبحّر اور ذہنی کمالات پر بھی جو چیز فوقیت رکھتی ہے، وہ آپ کی للّٰہیت اور اخلاص ہے کہ اس علم وفضل کے ساتھ سید صاحبؒ کی طرف رجوع ہوئے، جو عمر میں آپ سے کہیں خورد سال

---

[1] مکتوب بنام منشی خیرالدین صاحب (سرائے معالی خاں لکھنؤ) ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول صفحہ ۲۱۶-۲۱۷

اورعلم میں آپ سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے، بیعت ہوتے ہی آپ سید صاحبؒ کے رنگ میں رنگ گئے، اور اپنے سارے علم وفضل کو آپ پر اور دعوت وجہاد کے کام پر تصدّق، اور قلم وزبان اور خدا کی دی ہوئی ہر قوت وقابلیت کو حق کی اشاعت ونصرت کے لئے وقف کردیا، اور سفر ہجرت وجہاد ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

جہاں تک مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کا تعلق ہے، وہ ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ مجتہدانہ دماغ کے مالک تھے، اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ان میں بہت سے علوم کو از سر نو مدوّن کرنے کی قدرت وصلاحیت تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ایک خط میں ان کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے، آپ کی تصانیف اور علم میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز کی جھلک نظر آتی ہے[1]، وہی علم کی تازگی، استدلال کی لطافت، نکتہ آفرینی، سلامت ذوق و قرآن وحدیث کا خاص تفقّہ اور استحضار اور زور کلام۔

شاہ صاحبؒ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے علماء اہل درس اور اہل ذکاوت کے اس دائرہ سے باہر قدم نکالا، جو برسوں بلکہ صدیوں سے اس گروہ کے لئے مقرر ہو چکا تھا، اور اصلاح وارشاد عام اور جہاد وعزیمت کے دائرہ میں نہ صرف قدم رکھا، بلکہ اس میں قیادت کا فرض انجام دیا، ان کی تنہا تصنیف "تقویۃ الایمان" سے خلق خدا کو وہ فائدہ پہونچا اور عقائد کی ایسی اصلاح ہوئی کہ شاید کسی حکومت کی منظّم کوشش سے مشکل سے ہوتی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ "مولوی اسماعیل صاحبؒ کی حیات ہی میں ڈھائی لاکھ آدمی درست ہو گئے تھے، اور ان کے بعد جو نفع ہوا، اس کا تو اندازہ

---

[1] ملاحظہ ہو "منصب امامت" "عبقات" "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح"

ہو ہی نہیں ہو سکتا"

عمومی دعوت واصلاح کے اس عظیم کام کے ساتھ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنے کو پورے طور پر تیار کیا، سید صاحبؒ کی (جن سے آپ نے بعیت سلوک وبعیت جہاد کی تھی) نہ صرف ہمرکابی اور رفاقت کا حق ادا کیا، بلکہ اس کام میں آپ کی حیثیت تحریک کے ایک قائد، اور امیر کے وزیر و نائب کی تھی، پھر اسی کام میں اپنی ہستی فنا کر دی اور بالاکوٹ کے معرکہ میں شہادت کا شرف حاصل کیا، اقبالؔ نے ایسے ہی حضرات کے متعلق کہا ہے ؎

تکیہ بر حجّت و اعجاز بیاں نیز کنند	کارِ حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ می پوشند	عاشقاں بندۂ حال اند و چناں نیز کنند

مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ و شاہ محمد یعقوب صاحبؒ

شاہ صاحبؒ کے ذوق خاص، درس حدیث، اجازت واسناد اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت میں آپ کے جانشین آپ کے دونوں نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ (۱۱۹۷ھ۔ ۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد یعقوبؒ (۱۲۰۰ھ۔ ۱۲۸۲ھ) تھے، جو شاہ محمد افضل کے صاحبزادے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کو اپنا جانشین بنایا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ آپ ہی کو ہبہ کر دیا، آپ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی مسندِ درس پر بیٹھے اور ۱۲۳۹ھ سے لے کر ۱۲۵۸ھ تک دہلی میں اور ۱۲۵۸ھ سے (جب آپ نے مکہ معظمہ ہجرت کی) ۱۲۶۲ھ تک حجاز مقدس میں حدیث کی تدریس و خدمت میں سرتاپا غرق و منہمک رہے، اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپ سے حدیث کا درس لیا، اور بڑے بڑے علماء

واساتذۂ حدیث نے بلاد وامصار سے آکر آپ سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند لی جن میں شیخ عبداللہ سراج مکّی اور دوسرے کبار علماء شامل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو شاہ محمد اسمٰعیل (بھتیجہ) اور شاہ محمد اسحٰق (نواسہ) کی شکل میں دو قوتِ بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے، اور اکثر یہ آیت پڑھتے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ" دوشنبہ ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ مکہ معظمہ میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں حضرت سیدہ خدیجہؓ کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔[1]

شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی دہلی میں ایک مدت تک درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا، پھر اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے ساتھ ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور وہیں متوطّن ہو گئے، ان سے نواب سید صدیق حسن خاں قنوجیؒ (والی بھوپال[2]) حضرت مولانا سید خواجہ احمد حسنی نصیر آبادیؒ[3]، اور ایک خلق نے استفادہ کیا، جمعہ کے دن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں مکہ مکرمہ میں انتقال کیا، اور جنۃ المعلاۃ میں مدفون ہوئے۔

اجلّۂ علماء واساتذۂ کبار

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس وتربیت وصحبت سے جن علماء نے

---

[1] حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر ۷"۔ [2] نواب صاحب نے حدیث کی جو خدمت کی اور ان کی ذات سے کتب حدیث کی جو اشاعت ہوئی، ان کی توجہ اور سرپرستی سے ریاست بھوپال جس طرح درس حدیث کا ایک مرکز اور محدثین کا مسکن وموطن بن گیا وہ ایک تاریخی حقیقت اور ان کا ایک کارنامہ ہے، پہلی بار فتح الباری کی طباعت واشاعت جو مطبع بولاق مصر سے ہوئی اور اس پر پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) روپیہ کی رقم صرف ہوئی، علماء اور طلبائے علم حدیث پر احسان عظیم ہے اور یہ شرف اولیت ان کو حاصل ہے۔ [3] آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان اور سلسلہ کے بلند پایہ مصلح، داعی الی اللہ اور صاحب سلسلہ تھے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "کاروان ایمان وعزیمت"۔

فائدہ اٹھایا، پھر اپنا حلقۂ درس قائم کر کے سارے ہندوستان میں نام پیدا کیا، اور دینی نظام تعلیم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی، پھر خود ان کے درس کے فیض سے کثیر التعداد جید علماء تیار ہو کر نکلے، ان میں سے چند کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں، جو اپنی قوت و ملکۂ تدریس، منقول و معقول کی جامعیت، اور تبحر علمی میں مشہور و مسلّم تھے، اور جو اپنی اپنی جگہ خود ایک مدرسہ اور دبستان تھے۔

(۱) مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۲) مولانا امام الدین دہلوی (۳) مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی (۴) مولانا حیدر علی فیض آبادی، صاحبِ "منتہی الکلام" (۵) مولانا رشید الدین دہلوی (۶) مولانا مفتی صدر الدین دہلوی۔

ان کاملین علم و فن، اساتذۂ کبار اور ان سے بیشتر جن اہل دعوت و عزیمت اور تحریک اصلاح و تجدید اور جہاد فی سبیل اللہ کے قائدین کا نام آیا، جو شاہ صاحبؒ سے نسبت روحانی اور استفادۂ باطنی رکھتے تھے، ان سب کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے تعلیم و ارشاد اور تربیت افراد کی صدی تھی، "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"۔

شاہ صاحبؒ کے تذکرہ سے فارغ ہو کر جو سلسلۂ ولی اللّٰہی کے دائرہ کا نقطۂ مرکزی، اور ان کے صاحبزادگان اور تلامذہ کے سلک نور میں دُرّ شہوار (واسطۃ العقد) کی حیثیت رکھتے تھے، ہم شاہ صاحبؒ کے دوسرے دو صاحبزادوں حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبد القادرؒ کا اور شاہ صاحبؒ کے تین خلفائے کبار حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، خواجہ محمد امین کشمیری اور سید شاہ ابو سعید حسنیؒ رائے بریلوی کا تذکرہ پیش کریں گے، جو "نزہۃ الخواطر" ج ۷ سے ماخوذ و مقتبس ہوگا۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ

شیخ امام، عالم کبیر، علامہ رفیع الدین عبدالوہاب بن ولی اللہ بن عبدالرحیم عمری الدہلوی اپنے وقت کے مشہور محدث، متکلم، اصولی، مسند وقت، فرید عصر اور نادرۂ دہر تھے، دہلی میں ولادت اور نشو ونما ہوئی، اور اپنے برادر اکبر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کی اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، طریقت میں شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے استفادہ کیا، اور بیس سال کی عمر میں علم و افتاء اور درس میں امتیاز و شہرت حاصل کی، اپنے برادر بزرگ کی زندگی ہی میں آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اور اکابر علماء میں شمار ہونے لگے تھے، شاہ صاحبؒ کے آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد درس و تدریس کا کام آپ نے سنبھال لیا، طلبہ کا ہجوم ہوا اور انھوں نے بقدر استعداد آپ کے علمی افادات سے فائدہ اٹھایا، علمائے آفاق نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا، اور آپ کی تصانیف نے قبولیت و شہرت حاصل کی، آپ کے برادر معظم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شیخ احمد بن محمد شروانی کو شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے بارے میں لکھا تھا:۔

> "اب برادر یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے، جو نسباً میرے حقیقی بھائی ہیں، اور فنون علم و ادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے شریک ہیں، وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں، مگر فن و حکمت میں میرے برابر ہیں، اللہ تعالےٰ نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا، وہ چند دنوں کے سفر کے بعد

واپس آئے تو مجھے ایک مختصر مگر قیمتی رسالہ کا تحفہ دیا، جو ایسے لطائف و نکات پر مشتمل ہے، جن میں وہ منفرد ہیں اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں لکھا ان کی یہ انفرادیت آیت نور کی تفسیر اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کی رونمائی کے سلسلہ میں ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس باب میں ان کے بیانات ایسے حیرت انگیز ہیں، جن کے ذریعہ انھوں نے مغز سخن کو ظاہر کر دیا اور دلوں کے چراغ روشن کر دیئے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت سے سعید روحوں کو تازہ دم کر دیا ہے۔"

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں فرماتے ہیں:۔

"ان مروّجہ علوم کے علاوہ شاہ صاحبؒ کو علوم اوائل میں بھی مہارت تامّہ حاصل تھی، جو ان کی طرح بہت کم اہل علم کے حصہ میں آتی ہے، ان کی تصانیف بہت عمدہ اور مرصّع ہیں ــــــــــــــ میں نے بعض کتابیں دیکھیں تو آپ کی علمی و فنّی عبارتوں میں ایسے اسرار و رموز نظر آئے جن کے رمز آشنا کم ہی ہوتے ہیں، تھوڑے سے لفظوں میں آپ بہت سے مسائل جمع کر دیتے ہیں جس سے آپ کی علمی گہرائی اور دقّت فہم کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی کتاب "دمغ الباطل" علم حقائق کے بعض مشکل مسائل پر مشتمل ہے، جس کی اہل فن نے تعریف کی ہے، آپ کا ایک مختصر و جامع رسالہ اور ہے، جس میں آپ نے ہر چیز میں محبت کی کارفرمائی دکھائی ہے، اور اس کی وضاحت کی ہے، اس کا نام "اسرار المحبۃ" ہے، ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جنھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہو، میرے خیال میں آپ سے پہلے اس موضوع پر

صرف دو فلسفیوں' ابوالنصر فارابی اور بوعلی سینا نے لکھا ہے، جیسا کہ نصیر الدین طوسی کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے"۔

شیخ محسن کی ذکر کردہ کتابوں کے علاوہ بھی ان کی کتابیں ہیں، جن میں عروض میں ایک رسالہ، مقدمہ علم، تاریخ، اثبات شق القمر، حکماء کے اصول پر براہینِ حکمیہ کے ابطال، تحقیق الوان، آثار قیامت، حجاب، برہان تمانع، عقد انامل، اربعین کافات کی شرح، منطق، امور عامہ پر بھی آپ کے رسالے ہیں' رسالہ میر زاہد پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

آپ کی کتابوں میں "تکمیل الصناعۃ" ایسی عجیب کتاب ہے کہ بہت کم مصنفین کو ایسی کتاب لکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا، ان کے علاوہ بھی آپ کی متعدد بلند پایہ کتابیں ہیں' اپنے والد ماجد کے بعض عربی قصائد کی آپ نے تخمیس بھی کی ہے' ان کے عربی اشعار کا نمونہ یہ ہے:۔

یا احمد المختار یازین الوریٰ   یاخاتم الرسل ما اعلاکا

یاکاشف الضرّاء من مستنجد   یا منجیا فی الحشر من والاکا

هل کان غیرك فی الأنام من استوی   فوق البراق وجاوز الأفلاکا الخ

ان کا ایک اور فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس سے علوم عقلیہ میں ان کی بلندی اور عربی پر قدرت کا پتہ چلتا ہے' آپ نے اس میں بوعلی سینا کے قصیدہ "عینیہ" کا جواب لکھا ہے' جو "قصیدۃ الروح" کہلاتا ہے' اور جس کا مطلع ہے ؎

هبطت الیك من المحل الارفع   ورقاء ذات تعزّز و تمنّع

یہ قصیدہ ابن سینا کی عربی زبان پر قدرت' بیک وقت حلاوت وسلاست اور شکوہِ الفاظ کا مظہر ہے' ہر شخص کا کام نہیں تھا کہ اس کا جواب دے، حضرت شاہ

رفیع الدین صاحبؒ نے اس کا جواب لکھا ہے، جس سے آپ کی قادر الکلامی اور عربیت کا اظہار ہوتا ہے آپ کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

عجبا لشیخ فیلسوف ألمعی   خفیت لعینیہ منارة مشرع[1]

آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبد العزیزؒ کی حیات ہی میں ۶ر شوال ۱۲۳۳ھ کو دہلی میں وفات پائی اور شہر کے باہر اپنے والد ماجد و جدّ امجد کے پاس دفن ہوئے۔[2]

شاہ عبد القادر دہلویؒ

شیخ امام، عالم کبیر و عارف شہیر شاہ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلوی علوم الٰہیہ کے ممتاز علماء میں تھے، آپ کی ولایت و جلالت پر لوگوں کا عام اتفاق ہے، جب آپ کے والد ماجد کی وفات آپ کے بچپن میں ہوگئی تو آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کیا، اور شاہ عبد العدل دہلویؒ سے طریقت کی تعلیم پائی اور علم و عمل، زہد و تواضع، اور حسن سلوک میں امتیاز کے مالک ہوئے، ان فضائل کے سبب اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا کردی اور آپ اپنے شہر میں مرجع عام بن گئے اور علم روایت و درایت، اصلاح نفس، اور روحانی تربیت میں آپ سے رجوع کیا جانے لگا۔

آپ درس و افادہ میں مشغول اور دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں مقیم رہتے تھے آپ سے مولانا عبد الحیؒ بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مولانا محمد اسماعیلؒ بن شاہ عبد الغنی دہلویؒ، مولانا فضل حق بن

---

[1] علامہ نعمان آلوسی بغدادی کی "جلاء العینین" میں دونوں قصیدے ملاحظہ ہوں ص ۱۴۲-۱۴۸ شاہ صاحب کا قصیدہ ایک سو سولہ ۱۱۶ اشعار کا ہے۔ [2] نزہۃ الخواطر جلد سابع ص ۱۸۲-۱۸۶

فضل امام خیر آبادی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ اسحٰق بن شاہ افضل عمری دہلوی (مدفون مکہ مکرمہ) مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا سید اسحٰق بن عرفان رائے بریلوی (برادر معظم حضرت سید احمد شہیدؒ) اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

آپ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ تھی کہ آپ کو ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی توفیق ملی، علماء نے اس کی بڑی قدر دانی کی اور اسے معجزاتِ نبویؐ میں سے ایک معجزہ قرار دیا، والد ماجدؒ نے "مہر جہاں تاب" میں لکھا ہے کہ "شاہ عبد القادرؒ نے یہ ترجمہ لکھنے سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ آپ پر قرآن نازل ہوا، اسے آپ نے اپنے بھائی شاہ عبد العزیزؒ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، مگر چونکہ اب نبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد سے وحی آنے کا سلسلہ موقوف ہوگیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے قرآن کی بے مثال خدمت لے گا" چنانچہ یہ بشارت "موضح القرآن" کی صورت میں پوری ہوئی۔

اس کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے زبان کے مقابلہ میں ایسی زبان اختیار کی ہے، جس میں عموم و خصوص اور اطلاق و تقیید اور محل استعمال کا پورا لحاظ ہے، یہ اللہ کی ایسی عنایت ہے جس کے لئے وہ چند ہی لوگوں کو مخصوص کرتا ہے۔[1]

---

[1] مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کو عربی زبان و ادب کا جیسا صحیح ذوق اور قرآنی الفاظ کی روح اور طاقت اور منشاء کے مطابق اردو کے الفاظ کے انتخاب میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کی نظیر کم سے کم ہندوستان میں نہیں ہے، اور بعض مقامات پر وہ علامہ زمخشری و راغب اصفہانی جیسے علمائے بلاغت و ائمہ لغت سے بھی بڑھ جاتے ہیں، تائید الٰہی، اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور وہبی ادبی اور لسانی صحیح ذوق کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ (مصنف)

میں نے "موضح القرآن" کی سماعت و روایت اپنی نانی صاحبہ سیدہ حمیراء بنت شاہ علم الہدیٰ حسنی نصیر آبادی سے کی ہے جنھوں نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی صاحبزادی سے روایت کی ہے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد سے روایت کی تھی، آپ کی وفات چہار شنبہ ۱۹ رجب سنہ ۱۲۳۰ھ میں ہوئی اور اپنے والد کے پاس دفن ہوئے، اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ حیات تھے، اس لئے قدرتی طور پر انھیں بہت صدمہ ہوا، وہ حضرات ان کے دفن کے وقت یہ کہہ رہے تھے کہ "ہم ایک انسان کو نہیں بلکہ سراپائے علم و عرفان کو دفن کر رہے ہیں۔"

یہ عجائبات زمانہ میں سے ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے چار صاحبزادے ارادت خانون بنت سید ثناء اللہ سے تھے، جن میں بڑے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ پھر شاہ عبدالقادر صاحبؒ پھر سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے والد) تھے، مگر سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی وفات ہوئی پھر ان کے بعد شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات ہوئی، یہ سب بھائی علم و عمل، افادہ و فیض رسانی میں (شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے سوا، کیونکہ ان کی وفات عنفوان شباب میں ہو گئی تھی) فضلائے زمانہ میں ممتاز تھے، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کو اللہ نے ایسی توفیق عطا کی جس سے انھوں نے اپنے والد ماجد کی طرف سے پوری تلافی کر دی[1]۔

شاہ محمد عاشق پھلتی

عالم کبیر و محدّث جلیل مولانا شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ بن محمد صدیقی پھلتی،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۹۵-۲۹۶

کبار مشائخ میں سے تھے' آپ کا نسب حضرت محمد بن ابی بکر صدیق رضی تک اکیس[۲۱] واسطوں سے پہونچتا ہے، بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے، اور شیخ اجل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کی صحبت اختیار کی، (جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے) اُن سے آپ نے علم و معرفت حاصل کی، اور ان کے ساتھ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور اساتذۂ حرمین سے اخذ و استفادہ میں آپ کے ساتھ شریک رہے، جن میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی امتیاز خاص رکھتے ہیں' شیخ ابوطاہر نے ان کو اجازت بھی دی۔

شاہ ولی اللہ صاحب رح کے اصحاب میں آپ علم و معرفت کے لحاظ سے سب پر فائق تھے، اس طرح آپ شاہ صاحب دہلوی رح کے محرمِ اسرار ہو گئے، جیسا کہ شیخ ابوطاہر رح نے اپنے اجازت نامہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ اُن (شاہ ولی اللہ رح) کے کمالات کا آئینہ اور خصالِ جمیلہ کا نمونہ ہیں" ان کے استاد حضرت شاہ ولی اللہ رح نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

یحدثنی نفسی بأنك واصل	إلی نقطة قصواء وسط المراكز
وأنك فی تيك البلاد مفخم	يكفيك يومًا كل شيخ وناهز

(میرا دل کہتا ہے کہ تم علمی مرکزوں کے مقامِ بلند پر فائز ہو گے اور ان شہروں میں محترم ہو گے اور چھوٹا بڑا تمہارا تابع ہو گا۔)

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

وان يك حقا ما علمت فانه	سيلقی إليك الامر لابد سابغا
سيأتيك أمر لا يطاق بهاءه	إلی كل سرلا محالة بالغا

وثلج وبرد یجمعان شتاتکم　　یزیلان ھمًا فی فؤادك لاذعا

(اگر میرا یقین صحیح ہے تو سررشتہ تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تمہیں وہ نور حاصل ہوگا جس سے نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی اور وہ ہر راز کو افشا کردے گا، اور شرح صدر سے وہ جمعیت خاطر حاصل ہوگی جو تمہارا غم غلط کردے گی۔)

شرح دعائے اعتصام کی تقریظ میں شاہ صاحبؒ نے لکھا تھا ؎

لیھنك ما اوفیت ذروۃ حقہ　　من الفحص والتفتیش والفھم والفکر

ویھنك عن طی العلوم ونشرھا　　ونظمك أصناف الجواھر والدر

وحفظك للرمز الخفی مکانہ　　وخوضك بحرا زاخرا أیما بحر

فللہ ما أوتیت من حلل المنی　　وللہ ما أعطیت من عظم الفخر

(علم و تحقیق اور فکر و نظر کی بلندیوں پر فائز ہونا مبارک ہو، اور علوم کی تحقیق و اشاعت اور علم کے ہیرے موتیوں کی تنظیم و ترتیب بھی مبارک ہو، نیز رمز مخفی کی حفاظت اور علم و عمل کے بحر زخّار کی غواصی و شناوری تمہیں یہ مرادیں اللہ ہی کی طرف سے ملی ہیں، اور مفاخر کا سرمایہ بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔)

ان سے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ اور سید ابوسعید رائے بریلویؒ اور ایک خلق نے استفادہ کیا، ان کی کتابوں میں "سبیل الرشاد" فارسی میں تصوف کی ایک مبسوط کتاب ہے، دوسری کتاب "القول الجلی فی مناقب الولی" ان کے شیخ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حالات میں ہے، "دعائے اعتصام" حقائق و معارف میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب کی شرح، ان کی سب سے بڑی کتاب "تبییض المصفیٰ شرح المؤطا" ہے جو شاہ صاحبؒ کی کتاب "مصفیٰ" سے

متعلق ہے ۱۱۸۷ھ میں انتقال کیا جیسا کہ سید ابو سعید رائے بریلوی کے نام حضرت شاہ عبدالعزیز کے گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللہی

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ان چار خلفاء[1] و مسترشدین کبار میں سے جن سے ان کے سلسلۂ تعلیمات اور مقاصد کی اشاعت و تبلیغ ہوئی، ان کے ایک اہم شاگرد خلیفہ خواجہ محمد امین کشمیری بھی تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ "نزہۃ الخواطر" میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وہ اصلاً کشمیر سے تعلق رکھتے تھے لیکن دہلی میں سکونت تھی، وہ شاہ صاحب کے اجلۂ اصحاب میں تھے، اپنے شیخ کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، اور ولی اللّٰہی لکھتے، اور کہلاتے تھے، ان کے امتیاز و شرف کے لئے اتنا کافی ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان سے علوم کی تکمیل کی جیسا کہ خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے رسالہ "عجالۂ نافعہ" میں اس کی صراحت کی ہے، ان کے اعزاز و امتیاز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے لئے خصوصی طور پر بعض رسائل تصنیف فرمائے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے حضرت شاہ ابو سعید رائے بریلوی کے نام بھیجا ہے۔

---

[1] مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم اپنی کتاب "التمہید" (حصۂ اردو) میں لکھتے ہیں:—

"شاہ صاحب کے مکمل نظریہ کو سمجھنے والوں میں چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللّٰہی کشمیری (۳) شاہ نوراللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی" (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبیداللہ سندھی ص ۱۷۳-۱۷۴)

اصحاب ثلاثہ شیخ محمد عاشق پھلتی، خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی اور شاہ ابو سعید صاحب رائے بریلوی کا ذکر مستقل طور پر آیا ہے، چوتھے صاحب شیخ نوراللہ صدیقی بڈھانوی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں تھے، اور شاہ صاحب کی زندگی ہی میں اُن کو امتیازی شہرت حاصل ہوگئی تھی، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو ان کے داماد بھی تھے ان سے فقہ کی کتابیں پڑھیں ۱۱۸۷ھ کے قریب ان کی وفات ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۶)

پتہ چلتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۸۷ھ میں یا اس کے آس پاس ہوا، اس لئے کہ حضرت سید شاہ ابو سعید صاحب ربیع الاول ۱۱۸۷ھ میں عازم حج ہوئے تھے اور ۱۱۸۸ھ میں ان کی مراجعت ہوئی اور شاہ صاحبؒ کا یہ خط ان کی واپسی پر ملا[1]۔

خواجہ محمد امین کشمیریؒ کی خصوصیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ "کلمات طیبات" میں شاہ صاحب کے ان کے نام چار اہم مکتوب ہیں جو دقیق حقائق و معارف پر مشتمل ہیں[2]۔

ان چار خلفائے عظام کے علاوہ شاہ صاحب کے بعض دوسرے خلفاء بھی تھے، جن کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے، ان میں ایک حافظ عبد النبی معروف بہ عبد الرحمٰن بھی تھے، جن سے شاہ صاحب کا خصوصی تعلق معلوم ہوتا ہے[3]۔

شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ

سید والا تبار ابو سعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شیخ اجل علم اللہ نقشبندیؒ بریلوی، علمائے ربانیین میں سے تھے، رائے بریلی میں ولادت اور نشو و نما ہوئی، اور ملا عبد اللہ امیٹھوی سے تعلیم حاصل کی، پھر اپنے چچا سید محمد صابر بن آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے اور صوفیہ کے اذکار و اشغال میں ایک مدت تک مصروف رہے، اس کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا، اور ان کی وفات کے بعد ضرورت کا احساس کر کے شاہ صاحبؒ کے شاگرد شیخ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی سے بھی استفادہ کیا، شاہ محمد عاشق صاحبؒ نے آپ کے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۶   [2] کلمات طیبات ص ۱۶۱-۱۶۷

[3] ملاحظہ ہو رسالہ برہان مقالہ مسعود انور صاحب علوی ایم۔ اے علیگ شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۳ء۔

اجازت نامہ میں لکھا ہے:۔

"سید تقی ونقی، عارف باللہ، قابل تعریف ولی میر ابوسعید ہمارے شیخ ولی اللہ محدث رحؒ کے ساتھ رہے ہیں، اوران سے بعض اشغالِ طریقت معلوم کرکے ان پر مداومت کی ہے، حتیٰ کہ ان پر شیخ کی توجہ کی برکت سے ظاہری وباطنی لطائف واسرار کے دروازے کھل گئے، اوران کی شخصیت میں صوفیہ کے احوال وآثار ظاہر ہوئے اور انھیں وہ "شہود" حاصل ہوا جو صوفیہ کا مقصود ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"پھر جب حضرت شیخ رحؒ نے دار رضوان کو انتقال فرمایا تو انھیں خیال ہوا کہ سلسلۂ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ وغیرہ کے بقیہ اشغال فقیر سے حاصل کریں، اور صوفیہ کے متوارث طریقہ میں داخل ہوں، میں نے ان کی طلب دیکھ کر حدیث "اِلجام" کے خوف سے حصول مقصد میں ان کی مدد کی اوران اشغال کی تلقین کی، اور جب ان میں ان کے آثار وانوار کا مشاہدہ کیا اوران کی پختگی کا اندازہ کرلیا، تو استخارہ کے بعد انھیں طالبین وسالکین کی رہنمائی کی اجازت دی، اور انھوں نے تمام طریقوں میں بیعت کی، اور انھیں "خرقۂ فقریہ فخریہ" انابت واجازت کے طور پر پہنایا، جیساکہ ہمارے شیخ رحؒ نے ہمیں پہنایا تھا، اوراس کی اجازت دی تھی، اور جیساکہ شیخ عبیداللہ نے ہمیں اپنے آباء ومشائخ کرام کے ذریعہ حاصل ہونے والے لباس اوراجازت سے نوازا تھا، اس کے ساتھ میں نے انھیں تفسیر وحدیث، فقہ وتصوّف کے درس کی (بشرط مطالعہ ومراجعت شروح) اور

نحو وصرف کے درس کی اجازت دی، نیز جائز ضرورتوں کے وقت تعویذ اور اعمال مشائخ کی اجازت دی "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں مندرج تمام اعمال واشغال کی اجازت دی۔"

سید شاہ ابو سعیدؒ ایک باوقار، کریم النفس، کثیر الاحسان، مہمان نواز، غریب پرور بزرگ تھے، رفقاء کے ساتھ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو مکہ مکرمہ پہونچے اور حج سے مشرف ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں چھ ماہ مقیم رہے اور "مصابیح" کی شیخ ابوالحسن سندھی صغیر سے سماعت کی، ایک بار آپ مرقد نبویؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ کو دیکھا کہ حجرۂ مبارکہ سے باہر جلوہ افروز ہیں، پہلے آپؐ کے دوش مبارک ظاہر ہوئے، پھر جسد مطہر ظاہر ہوا اور آنحضرتؐ سامنے تشریف فرما ہو کر متبسّم ہوئے، آپ کے مرید ومجاز شیخ امین بن حمید علوی کاکوروی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"شیخ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں بچشم سر دیکھا ہے۔"

پھر آپ مکہ مکرمہ واپس ہوئے اور "جزریہ" شیخ محمد میرداد انصاری سے پڑھی، پھر طائف ہوتے ہوئے، ہندوستان آئے اور "مدراس" میں داخل ہوئے، اور وہاں ایک مدت تک قیام کیا اور مقبولیت حاصل کی، اور آپ سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے، ان میں الحاج امین الدین بن حمید الدین کاکوروی، مولانا عبدالقادر خاں خالص پوری، میر عبدالسلام بدخشی، شیخ میرداد انصاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، اور شیخ عبداللطیف حسینی مصری، اور بہت سے دوسرے

لوگ تھے، ۹ رمضان ۱۱۹۳ھ کو رائے بریلی میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔[1]

ایک نامور معاصر و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہّاب

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نامور معاصر اور عظیم مصلح نجد کے ایک ممتاز عالم اور صاحبِ عزیمت داعی و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان التمیمی، الحنبلی، (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) (۱۷۰۳-۱۷۹۲ء) ہیں، وہ سنہ ولادت کے لحاظ سے شاہ صاحبؒ کے متقارب السن،[2]

---

[1] واضح رہے کہ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے، خاندان ولی اللّٰہی سے آپ کے تعلّقات کی نوعیت، اور آپ کی خصوصیت وعظمت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے، جو شاہ اہل اللہ (برادر حضرت شاہ ولی اللہ) مولانا نوراللہ، حضرت شاہ محمد عاشقؒ، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کے نام بھیجے ہیں، اور جن میں خاندانی حوادث اور پیش آنے والے واقعات کی اطلاع، نیز آپ کے بلند مقام اور کمالات کا اعتراف ہے، یہ مجموعہ مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی کا مرتب کیا ہوا "مکتوب المعارف" کے نام سے خاندانی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، آپ ہی کے حقیقی چچا زاد بھائی مولانا سید محمد واضح حسنی کو بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرف سے اجازتِ عامّہ تھی اور شاہ صاحبؒ ان کا بلند الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو مکتوب مشمولہ مکتوبات قلمی عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد ص۱۵)

[2] شاہ صاحبؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے، اس طرح آپ شیخ سے ایک سال بڑے تھے۔

اور سنہ وفات کے لحاظ سے ان سے تیس[۳۰] سال متاخر ہیں، معاصر ہونے اور متعدد مابہ الاشتراک باتوں کے باوجود، ملاقات تو بجائے خود ایک کی دوسرے سے واقفیت کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا، حضرت شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ میں حج کے لئے گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ حجاز میں قیام فرمایا، یہ وہ زمانہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک نجد کے علاقہ عُیینہ و درعیہ وغیرہ میں محدود تھی، امیر محمد بن سعود نے اس وقت تک نہ شیخ سے بیعت کی تھی اور نہ ان دونوں کے درمیان (دعوت کی نشر و اشاعت اور اس کی بنیاد پر حکومت کے قیام اور اس کی تائید کا) کوئی معاہدہ اور سمجھوتہ ہوا تھا، یہ معاہدہ ۱۱۵۸ھ میں ہوا اور اس کے نتیجہ میں درعیہ دعوت کا مرکز اور ایک دینی دارالحکومت بنا، شیخ کی دعوت کا حجاز میں اس وقت تعارف اور اثر و نفوذ پیدا ہوا جب ۱۲۱۸ھ میں (شیخ کی وفات کے بارہ[۱۲] سال اور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بیالیس[۴۲] برس بعد) مکہ معظمہ پر آل سعود کا قبضہ ہوا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و جدّ و جہد کا اصل دائرہ توحیدِ خالص کی دعوت و تبلیغ، ردّ شرک، و استیصال رسوم جاہلیت (جس کے بعض مظاہر و شعائر کا بُعدِ زمانہ، جہالت، اور علماء کی غفلت سے جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ کے بعض علاقوں اور قبائل میں ظہور ہو گیا تھا[۱]) توحید الوہیت و توحید ربوبیت کا فرق اور خدا کی طرف سے جس توحید کا اپنے بندوں سے مطالبہ اور قرآن مجید میں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" (مطبوعہ مکتبۂ نشأت ثانیہ حیدر آباد) نیز عربی کی وہ کتابیں جو شیخ کے حالات میں لکھی گئیں اور ان کی فہرست طویل ہے۔

اس کی صریح دعوت ہے، اس کی وضاحت و تنقیح تھی[1]، اس بارے میں شیخ کو جو کامیابی ہوئی اس کی مثال پچھلے دور کے مصلحین میں ملنی مشکل ہے، اگرچہ بقول ڈاکٹر احمد امین، اس میں اس کو بہت دخل تھا کہ اس کی بنیاد پر ایک حکومت، (حکومت سعودیہ) قائم ہوئی، اور اس نے اس دعوت کو اپنا لیا، اور اس کی سرپرستی کی[2]، لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ شیخ نے اس سلسلہ میں ایک انقلابی مصلح کا کردار ادا کیا، اور خواہ کسی صاحبِ علم کو ان کے افکار، دعوت پیش کرنے کے طریقہ و لہجہ اور طرزِ عمل سے سَو فیصدی اتفاق نہ ہو، اس دعوت کی افادیت، اثر انگیزی اور ان خاص حالات میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

عقیدۂ توحید کی توضیح و تنقیح، قرآن مجید سے اس کے ثبوت، اور توحید الوہیت و توحید ربوبیت کے درمیان فرق کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کے خیالات و تحقیقات میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے، جو قرآن مجید کے عمیق اور براہ راست مطالعہ و تدبّر اور کتاب و سنّت سے گہری واقفیت کا نتیجہ ہے، اور جس نے اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے محققین و مصلحین کو مماثل نتائج پر پہونچایا اور ان کو واضح اور دو ٹوک دعوت توحید کی اشاعت و تبلیغ پر آمادہ کیا۔

لیکن شاہ صاحبؒ کا دائرۂ عمل اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کام کا میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس میں علوم اسلامیہ کا احیاء، فکرِ اسلامی کی تجدید،

---

[1] ملاحظہ ہو شیخ کا شہرۂ آفاق رسالہ "التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید"

[2] ملاحظہ ہو "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" ترجمہ شیخ محمد بن عبد الوہاب۔

اسرار و مقاصد شریعت کی نقاب کشائی، شریعت اور تعلیمات اسلامی کو مربوط و مکمل شکل میں پیش کرنے کا علمی کارنامہ، علمی جمود اور مذاہب فقہیہ کے تعصّب کی اصلاح، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاہب الفقہیہ کا مجتہدانہ کام، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت کی سعی، حدیث کا عمیق مطالعہ اور اس کی نشر و اشاعت کی مجدّدانہ کوشش، تزکیۂ نفس اور حصولِ درجۂ احسان کی دعوت اور اس کی تعلیم اور مردان کار کی تربیت شامل ہے، اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے یہاں (اقبالؔ کے الفاظ میں) "حجازی ریگ زار" (توحید خالص کی مضبوط زمین) میں زمزم کا چشمۂ شیریں (محبّت و لینت کی جوئے شیر) بھی ہے، جو شاہ صاحبؒ کے خاص ماحول و تربیت اور تصوف و سلوک کا نتیجہ ہے، اور جس کا نمونہ ان کے نعتیہ قصائد اور شوقیہ اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے، اس لحاظ سے ان کا اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کا (جن کی سعی بہر حال مشکور ہے) تقابلی مطالعہ کرنے اور ان دونوں میں مماثلت و اتفاق کے نقاط تلاش کرنے کے بجائے شاہ صاحبؒ کا اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا تقابلی مطالعہ اور اتفاق و اختلاف کے نقاط تلاش کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں اپنے علمی تبحّر، علوم کتاب و سنت میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچنے، عمق و وسعتِ نظر، کار اصلاح و تجدید کے تنوّع اور شخصیت کی عظمت و عبقریت میں زیادہ مماثل نظر آتے ہیں (اور کتاب میں اس کی طرف جابجا اشارات گزر چکے ہیں) اس اختلاف کے ساتھ جو ماحول تعلیم و تربیت، زمان و مکان کے اختلاف اور سلوک و تربیتِ باطنی کا نتیجہ ہے۔

باب دوازدہم (۱۲)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات

کتب و رسائل

یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی چھوٹی بڑی عربی فارسی تصنیفات کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست دی جا رہی ہے، اہم کتابوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، قلمی و مطبوعہ اور زبان کی نشان دہی کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

(ا)

۱۔ الاربعین (عربی) چالیس (۴۰) احادیث کا مجموعہ جو ان مختصر اور جامع احادیث پر مشتمل ہے جو "جوامع الکلم" کا مصداق ہیں، مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا، ۱۲۵۴ھ میں اس کا اردو ترجمہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک خلیفہ سید عبداللہ مرحوم نے مطبع احمدی کلکتہ سے شائع کیا، اس کے بعد متعدد ترجمے شائع ہوئے، مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) میں اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی، جو ہندوستان و پاکستان سے "چہل حدیث ولی اللّٰہی" اور "اربعین ولی اللّٰہی" کے نام سے شائع ہوئی۔

۲۔ الارشاد إلی مهمات علم الاسناد (عربی) اس میں اپنے اساتذہ و شیوخ حجاز کا

ذکر ہے، رسالہ مطبوعہ ہے۔

۳۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی) موضوع، حجم، طباعت اور اہم مضامین کی تلخیص، کتاب کے تعارف میں گزر چکی ہے۔

۴۔ أطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم (عربی) یہ شاہ صاحبؒ کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے، جن سے شاہ صاحبؒ کی قادر الکلامی اور عشق نبویؐ کا اندازہ ہوتا ہے، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا۔

۵۔ ألطاف القدس (فارسی) کتاب لطائف باطنی کی تشریح اور تصوف کے بنیادی مسائل کی توضیح میں ہے، سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں مطبع احمدی سے شائع ہوئی۔

۶۔ الإمداد فی مآثر الأجداد (فارسی) مختصر رسالہ ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنے چند اجداد کا حال لکھا ہے، اس میں اپنا سلسلۂ نسب بھی درج کیا ہے "انفاس العارفین" میں یہ رسالہ بھی شامل ہے، نیز مطبع احمدی دہلی کے طبع کردہ مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں بھی شامل ہے۔

۷۔ الانتباہ فی سلاسل أولیاء اللہ[1] (فارسی) تصوف کے مختلف سلاسل کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کا مختصر تذکرہ، ۱۳۱۱ھ میں سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں اردو ترجمہ کے ساتھ مطبع احمدی سے شائع ہوا۔

---

[1] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں ص۱ پر کشف قبور کے عنوان کے ماتحت جو طریقہ لکھا گیا ہے وہ ان تمام احتیاطوں اور محققانہ و محدثانہ ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا، جو شاہ صاحبؒ کی اہم تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ اور الفوز الکبیر میں نمایاں ہے، اور اگرچہ اس کی تاویل کی جا سکتی ہے (ملاحظہ ہو "حفظ الایمان" از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ص۸) لیکن ان موہم الفاظ میں بھی اس مضمون کا آنا جو مشائخ طریقت کے تجربات اور بعض کے عمل کے مطابق ہے علمی لغزش اور غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے، امام مالکؒ کے درجے اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کہ انھوں نے مسجد نبویؐ کے درس میں قبر انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "کلٌّ یُؤخذ من قوله ویُردُّ، إلا صاحب هذا القبر" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۸۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (فارسی) اس رسالہ کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزرچکا ہے "انفاس العارفینؒ" کا جزء ہے، مطبع احمدی سے مجموعۂ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہؒ کے ضمن میں بھی شائع ہوا ہے۔

۹۔ الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف (عربی) رسالہ کے تعارف کے سلسلہ میں اس کی اہمیت، طباعت اور مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل گزرچکی ہے۔

۱۰۔ انفاس العارفین (فارسی) کتاب کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزرچکا ہے، ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۷ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی، یہ کتاب دراصل حسب ذیل ساتؔ رسالوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱) بوارق الولایۃ (۲) شوارق المعرفۃ (۳) الامداد فی مآثر الاجداد
(۴) النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ (۵) العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ
(۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین (۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

اس میں سے اکثر رسائل علیحدہ بھی طبع ہوئے ہیں۔

(ب)

۱۱۔ البدور البازغۃ۔ (عربی) کتاب فلسفۂ دینی کے بیان پر مشتمل ہے، لیکن اس میں فلسفہ کی اصطلاحات فطرت وترکیب انسانی، طبقات وافراد کے خصائص پر فلسفیانہ اور اشراقی رنگ میں روشنی ڈالی گئی ہے، اور طبعیات وعلم الاخلاق کے مباحث ملے جلے ہیں، ارتفاقات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور صالح تمدن اور اس بارے میں شریعت کی رہنمائی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جماعت انسانی کی صحیح تنظیم اور خلافت وامارت کے احکام وآداب بھی بیان کئے گئے ہیں پھر معرفت الٰہی،

اور اسماء وصفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، مراتب احسان اور ان کے حجابات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مرض شرک اور اس کے اصناف اور طبقات کا بھی ذکر ہے، فتن اور قیامت کا اثبات بھی ہے، عالم برزخ و حشر کے منازل، فضائل اعمال و مناقب کا تذکرہ، نبوت کا اثبات، اقسام انبیاء و مراتب وحی کی بھی تفصیل ہے، ملّت کی حقیقت، اس کے ظہور کے انواع، جاہلیت اولیٰ کا تذکرہ اور ملل سابقہ کا بھی تعارف کرایا گیا ہے، پھر اس ملّت کی شریعت، اس کے ارکان دین، علم تشریع اور مقاصد شرع کا بیان تفصیل سے ہے، اور ارکان اربعہ کے اسرار و حکم پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقابلہ میں مضامین کی کثرت اور ان کا تنوّع زیادہ ہے، اور اس میں بعض ایسے مباحث الٰہیہ اور مسائل کلامیہ بھی آگئے ہیں، جن کو جمہور متکلمین اور حکمائے امت نے بیان نہیں کیا تھا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ اپنے عمق، علم و نظر کی پختگی، ذہنی و علمی ارتقاء اور علوم و حقائق کو شریعت و سنت کی زبان اور زیادہ طاقتور عربی اسلوب میں بیان کرنے میں فائق ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۴ھ میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا۔

۱۲۔ بوارق الولایۃ (فارسی) یہ رسالہ انفاس العارفین کا جزء ہے، اس میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے اقوال و احوال و واقعات و تصرّفات ذکر کئے ہیں۔

(ت)

۱۳۔ تاویل الاحادیث (عربی) اس میں انبیاء علیہم السلام کے ان قصص کے جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں، لطائف و نکات اور ان سے استخراج کئے ہوئے بہت سے اصول شرعیہ کا بیان ہے، اختصار کے باوجود کتاب میں بعض بڑے قیمتی اشارات اور قرآن مجید کے عمیق فہم کے نمونے ہیں، شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی حیدرآباد (پاکستان) کی جانب سے شائع ہوئی۔

۱۴۔ تحفۃ الموحدین ۔ یہ عقیدۂ توحید کی تشریح پر شاہ صاحب کا فارسی میں ایک مختصر رسالہ ہے جس کا متن افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا، مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی مصنف "حیات ولی" نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے یہ ترجمہ شائع ہوا ہے، شاہ صاحب کی تصنیفات میں عام طور پر اس رسالہ کا ذکر نہیں آتا، رسالہ کا بنیادی مضمون اگرچہ شاہ صاحب کی دوسری تحریرات کے مطابق ہے، لیکن بعض مضامین کی بنا پر بعض اہل نظر کو اس کی شاہ صاحب کی طرف نسبت میں تردّد ہے، واللہ اعلم بالصواب ۔

۱۵۔ تراجم ابواب البخاری (عربی) اس میں اصولی طور پر ایسے قواعد بیان کئے گئے ہیں، جن سے تراجم بخاری کے حل میں مدد ملے، مجموعہ رسائل اربعہ نیز مسلسلات مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ کے آخر میں طبع ہوا ہے۔

۱۶۔ التفہیمات الالٰہیۃ (عربی و فارسی) اس میں شاہ صاحبؒ کے وارداتِ قلبی اور وجدانی مضامین ہیں، جو زیادہ تر عربی اور کمتر فارسی میں ہیں، اس کی حیثیت ایک ایسی بیاض کی سی ہے جس میں آدمی اپنے تأثرات و مشاہدات قلم بند کر لیتا ہے، اور وہ خاص حلقۂ احباب و تلامذہ کے مطالعہ میں آنے کے لئے موزوں ہوتی ہے، بعض اوقات صاحبِ بیاض ان کی عام اشاعت کو پسند نہیں کرتا، اس کو مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا، اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ خطاب کیا ہے، جو کتاب کا مؤثر ترین اور مفید ترین حصہ ہے، کتاب دو جلدوں میں ہے۔

(ج)

۱۷۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (فارسی) ذاتی حالات کا مختصر بیان

اور یادداشت، تذکرہ کے سلسلہ میں تعارف گزر چکا ہے" انفاس العارفین" کا جزء ہے اور علیحدہ بھی طبع ہوا ہے۔

(ح)

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغۃ (عربی) کتاب کا تعارف اس کے اہم مضامین کا بیان اور اس کے طبعات کا تذکرہ باب ہفتم میں گزر چکا ہے۔

۱۹۔ حسن العقیدہ (عربی) اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، رسالہ کا تعارف اور اس کی طباعت واشاعت کا تذکرہ باب پنجم میں گزر چکا ہے، رسالہ" العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے بھی معروف ہے، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی مرحوم نے اس کی شرح "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے کی، جو مکتبۂ ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں نصاب میں شامل ہے۔

(خ)

۲۰۔ الخیر الکثیر (عربی) یہ حقیقتاً فلسفۂ دینی کی کتاب ہے، اس میں معرفت ذات، اسماء الٰہی کی حقیقت، حقیقت وحی، کلام الٰہی وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، وحدۃ الوجود پر بھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے، عرش، زمان ومکان، افلاک وعناصر، معدن، نبات، وحیوان، اعیان ثابتہ، عالم مثال وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، کتاب کا باب الخزانۃ الخامسۃ اہم ہے جس میں نبی کی بعثت، نبوت کے پانچ مزاج، اور انبیاء کے اصناف وغیرہ کا بیان ہے۔

کتاب فلسفہ، طبعیات، تصوف، حکمۃ الاشراق سب کا مجموعہ ہے۔

خزانۂ ثالثہ میں بعثت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سے بحث ہے۔

خزانہ ثامنہ میں شریعت کے نشوونما اور اس کے ارتقاء سے بحث ہے۔

خزانہ تاسعہ میں معاد کے احوال و مراتب سے بحث ہے۔

خزانہ عاشرہ میں متفرق فوائد ہیں۔ مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوئی۔

(د)

۲۱۔ الدُّرُّ الثمین فی مبشّرات النبیّ الأمین (عربی) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبشرات کا ایک مجموعہ جو شاہ صاحبؒ کی ذات یا بزرگوں سے متعلق ہیں، رسالہ مسلسلات اور النوادر کے ساتھ ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۰ئہ) میں طبع ہوا ہے، کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے بھی شائع ہوا۔

۲۲۔ دیوان اشعار (عربی) جسے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جمع کیا، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے مرتب کیا، مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(ر)

۲۳۔ رسالہ۔ حضرت خواجہ خورد شیخ عبداللہ بن عبدالباقی کے جواب میں اپنے کشف کے مطابق۔

۲۴۔ رسالہ دانشمندی (فارسی) اصولِ تعلیم و اساتذہ کے لئے قیمتی ہدایات پر مشتمل ایک پُر مغز اور مفید رسالہ ہے، اردو ترجمہ "الرحیم" حیدرآباد سندھ سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں پروفیسر محمد سرور نے شائع کیا، نیز عربی ترجمہ "البعث الاسلامی" شمارہ ۴ جلد ۲۷ محرم ۱۴۰۳ھ میں محمد اکرم ندوی کے قلم سے "اصول الدراسۃ والتعلیم" کے عنوان سے شائع ہوا۔

(ز)

۲۵۔ زهراوین - سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران کی تفسیر۔

(س)

۲۶۔ سطعات (فارسی) دربیان طلسم الٰہی کہ رابطہ است دربیان مجرد محض وعالم شہادت وبعض حواس وآثار آں۔

کتاب کو فلسفۂ الٰہیہ میں سمجھنا چاہئے جس میں فلسفیانہ اور متصوفانہ اصطلاح اور فلسفۂ وحدۃ الوجود کی تعبیرات استعمال کی گئی ہیں، اور جس میں حقیقتاً "ربط الحادث بالقدیم" کے معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب ان اخصّ الخواص کے مطالعہ کے قابل ہے، جو فلسفۂ قدیم کے پورے رمز شناس اور وحدۃ الوجود کی تائیدی وتردیدی بحثوں کے کوچہ سے آشنا ہوں، عام اشاعت اور دعوت کی چیز نہیں ہے، کتاب میں طبّی اصطلاحات، اور حکمت طبعیہ کے مضامین کی بھی شمولیت ہے، کتاب میں ان اصولوں کے ماتحت بعض آیات کی لطیف تفسیر بھی ہے، کہیں کہیں اپنی تحقیق سے فلاسفہ اور متکلمین دونوں سے اختلاف ظاہر کیا ہے، تعلیم الٰہی کے اقسام کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور اس کے اشکال اور صورتوں کو بیان کیا ہے "شخص اکبر" کی اصطلاح جا بجا استعمال کی ہے، ہدایت الٰہی و بعثت انبیاء سے بحث کی ہے، اور یہ کہ وہ کن کن مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے، تجلّیات الٰہیہ، ان کے اقسام و مظاہر سے بھی بحث کی ہے کُل رسالہ چوبیس ۲۴ صفحے میں آیا ہے، مطبع احمدی سے سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں شائع ہوا، ۱۹۳۹ء میں مولوی فضل احمد صاحب نے بیت الحکمہ کراچی سے اور ۱۹۶۴ء میں مولانا غلام مصطفٰے قاسمی نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی سے بھی شائع کیا۔

۲۷۔ سرور المحزون (فارسی) ابن سید الناس کی سیرت پر مشہور کتاب "نور العیون فی سیر الامین المامون" کا خلاصہ ہے، اپنے نامور معاصر اور سلسلۂ مجددیہ کے شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی فرمائش سے تصنیف کیا، اردو میں اس کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔

(ش)

۲۸۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (عربی) صحیح بخاری کے تراجم اور عنوانات واحادیث کے مطابق لطائف واسرار پر ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا، اس کے شروع میں تراجم ابواب البخاری بھی ہے۔

۲۹۔ شفاء القلوب (فارسی) حقائق ومعارف میں ایک رسالہ ہے۔

۳۰۔ شوارق المعرفۃ (فارسی) شاہ صاحبؒ کے چچا شیخ ابوالرضا کے حالات پر مشتمل ہے، انفاس العارفین کا جزء ہے۔

(ع)

۳۱۔ العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ (فارسی) یہ مختصر رسالہ شیخ محمد پھلتیؒ کے حالات میں ہے، جو شاہ صاحبؒ کے جد مادری تھے، "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل میں بھی شامل ہے۔

۳۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عربی) باب ششم میں رسالہ کا تعارف گزر چکا ہے۔

العقیدۃ الحسنۃ دیکھئے حسن العقیدۃ۔

(ف)

۳۳۔ فتح الرحمن (فارسی) قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، بابِ پنجم میں اس کا تعارف و تذکرہ گزر چکا ہے، مطبع فاروقی دہلی سے ۱۲۹۴ھ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فارسی فوائد اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ اردو اور فوائد موضح القرآن کے ساتھ شائع ہوا، جو کلکتہ کے مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے۔

۳۴۔ فتح الخبیر (عربی) قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح، یہ رسالہ "الفوز الکبیر" کے تتمہ کے طور پر شامل ہے۔

۳۵۔ فتح الودود لمعرفۃ الجنود (عربی) مطبوعہ مصنف کی نظر سے نہیں گذرا، مولانا رحیم بخش نے "حیاتِ ولی" میں اس کو اخلاق و تصوف سے متعلق لکھا ہے، لیکن نام سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔

۳۶۔ الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین (عربی) مطبوعہ، یہ رسالہ مسلسلات کے نام سے معروف ہے، فن حدیث سے متعلق ہے۔

۳۷۔ الفوز الکبیر (فارسی) رسالہ کا تذکرہ و تعارف بابِ پنجم میں گزر چکا ہے۔

۳۸۔ فیوض الحرمین (عربی) کتاب زیادہ تر قیام حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقائق باطنی، مسائل کلامی اور مسائل تصوف سے تعلق رکھتی ہے، یہ کتاب بھی خواص کے مطالعہ کی ہے، ان لوگوں کے دسترس سے بالاتر ہے جو فلسفہ اور تصوّف میں پورا درک نہیں رکھتے۔

(ق)

۳۹۔ قُرّۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی) حضرات شیخین کی فضیلت کے اثبات میں متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔

۴۰۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی) عربی کا رسالہ ہے، جس میں بعیت کا ثبوت، بیعت کی سنّیت، بعض ابتدائی زمانوں میں اس کے عدم رواج اور پابندی نہ ہونے کے اسباب، حکمت بیعت، شرائط مرشد، شرائط مرید، صوفیا کی بیعت کے اقسام، تکرار بیعت کے حکم سے بحث کی گئی ہے، طریقۂ تربیت اور تعلیم مرید کو بیان کیا گیا ہے، عالم حقّانی کے صفات اور تذکیر و وعظ گوئی کے آداب کا ذکر ہے، پھر سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے اشغال و مراقبات اور طریقۂ مجدّدیہ کے اشغال کا تکملہ بھی ہے، اور اصطلاحات کی تشریح بھی، شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال و مجرّبات کو بھی درج کر دیا ہے، جو مختلف حالات اور ضرورتوں میں معمول بہا اور آزمودہ ہیں، مختصراً کتاب ان طالبین کے دستور العمل اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان سلاسلِ ثلاثہ میں کسی سے منسلک ہوں، اور ان کو سنّت حقّہ کا اہتمام اور دعوت و اصلاح کا بھی ذوق ہو۔

کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں کہیں کہیں وہ محدّثانہ و مجتہدانہ رنگ نظر نہیں آئے گا، جو شاہ صاحب کی اہم و مشہور کتابوں کی خصوصیت ہے، بلکہ اس کے بعض مندرجات توحید کے بارہ میں شاہ صاحب کے معروف عالمانہ اور مصلحانہ مسلک سے میل نہیں کھاتے، مثلاً اصحابِ کہف کے ناموں کے بارہ میں لکھا ہے،

"أسماء أصحاب الکھف امان من الغرق والحرق والنھب والشرق"[1]

پھر ان کے نام لکھے ہیں، حالانکہ یہ نام بھی کسی صحیح حدیث یا قطعی الثبوت ذریعہ سے ثابت نہیں ہیں۔

---

[1] نسخہ مطبوعہ مصر، مطبع الجلبیہ مصر ۱۲۹۰ھ ص ۳۹

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب سفر حرمین (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ) کے پیشتر کی تصنیف ہے اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ کتاب میں جہاں اپنے مشائخ تصوّف، ان کی اجازت اور خرقوں کا ذکر کیا ہے، وہاں اپنے محبوب و مربّی استاذ شیخ ابو طاہر مدنی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ "الجزء اللّطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں اس کی صراحت موجود ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"ولبست الخرقۃ الصوفیۃ عن الشیخ ابی طاھر المدنی رحمہ اللہ ولعلھا حاویۃٌ لخرق الصوفیۃ کلھا"۔[1]

حدیث کی اسانید اور ان کے شیوخ میں بھی والد ماجد (حضرت شاہ عبدالرحیم) اور حاجی محمد افضل کا ذکر کیا ہے، شیخ ابو طاہر اور شیوخ حجاز میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے حالانکہ اس موقعہ پر یہ ضروری اور ہر طرح قرین قیاس تھا۔[2]

---

[1] الجزء اللطیف ص۵ مطبوعہ سلفیہ لاہور۔

[2] ڈاکٹر مظہر بقا نے اپنی کتاب "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" (مطبوعہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پاکستان) میں لکھا ہے، "یہ کتاب سفر حرمین کے بعد کی ہے"۔ (ص۶۸)

لیکن یہ ایک مفروضہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا کہ "یہ کتاب سفر حرمین کے بعد کی ہے" قرائن اور داخلی شہادتیں جیسا کہ اوپر گذرا اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کتاب شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات ۱۱۳۱ھ اور سفر حج ۱۱۴۳ھ کے درمیان کی ہے، جب شاہ صاحبؒ کے منتسبین اور طالبینِ سلوک کا ان کے فرزندِ جلیل (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کی طرف رجوع ہوا۔

"القول الجمیل" کے کتب خانہ ندوۃ العلماء میں دو قدیم مخطوط نسخے ہیں، ایک نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی (م ۱۲۳۶ھ) کے قلم کا ہے، جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، اور وہ مستند اور قدیم العہد نسخہ ہے جو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے کتب خانہ کا ہے، جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہے، دوسرا نسخہ نواب سید صدیق حسن خاںؒ کے کتب خانہ کا ہے۔

پھر بھی اس کتاب میں شاہ صاحب کا اصلاحی رنگ نمایاں ہو کر رہا ہے صوفیہ کی عبادت کے بعض طریقوں مثلاً صلوۃ معکوس کا اس بنا پر ذکر نہیں کیا ہے کہ اس کا سنّت اور اقوالِ فقہا سے ثبوت نہیں ہے، اسی طرح مصحف کو آگے پیچھے، دائیں بائیں رکھ کر ضرب لگانے سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بے ادبی پر محمول کیا ہے، بعض احادیث پر جو ان سلاسل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سلوک کی تلقین کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، محدّثانہ کلام کیا ہے، شاہ صاحب کا مسلک اور اصلی ذوق اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :۔

"یہ وصیت ہے کہ صحبت نہ اختیار کرے صوفیان جاہل کی، اور نہ جاہلان عبادت شعار کی، اور نہ فقیہوں کی جو زاہدِ خشک ہیں، اور نہ محدّثین ظاہری کی جو فقہ سے عداوت رکھتے ہیں، اور نہ اصحابِ معقول اور کلام کی جو منقول کو ذلیل سمجھ کر استدلال عقلی میں افراط کرتے ہیں، بلکہ طالبِ حق کو چاہئے کہ عالم صوفی ہو، دنیا کا تارک، ہر دم اللہ کے دھیان میں، حالات بلند میں ڈوبا ہوا، سنت مصطفویہ میں راغب، حدیث اور آثار صحابہؓ کرام کا متجسّس، حدیث و آثار کی شرح اور بیان کا طلب کرنے والا، ان فقیہان محققین کے کلام سے جو حدیث کی طرف مائل ہیں نظر سے، اور ان اصحاب عقائد کے کلام سے جن کے عقائد ماخوذ ہیں سنت سے، جو ناظر ہیں دلیل عقلی میں بطریق تبرّع اور عدم لزوم کے، اور ان اصحٰب سلوک کے کلام سے جو جامع ہیں علم و تصوّف کے، تشدّد کرنے والے نہیں اپنے نفوس پر، اور نہ تدقیق سے کام لینے والے سنت نبویّہ پر اضافہ کر کے۔"[1]

[1] شفاء العلیل صـ ۱۱۶-۱۱۷

اس کتاب میں شاہ صاحب کا تطبیقی ذوق (جوان کو وراثت میں ملا تھا اور ان کا فطری رجحان تھا) نمایاں ہو کر رہا ہے، انھوں نے مذاہب فقہا میں سے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کو ناپسند کیا ہے، ان کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ ان کو بالاجمال قبولیت کی نظر سے دیکھے اور پیروی اس کی کرے جو صریح اور مشہور سنت کے موافق ہو۔[1]

ہندوستان کے مخطوطہ نسخوں کے علاوہ یہ رسالہ مولانا محمد صادق مدراسی کے مختصر مقدمہ اور تشریحات کے ساتھ ۱۲۹۰ھ میں الحاج منصور محمد کے مطبع (الجمالیہ مصر) میں عبدالعال احمد کا کتابت کیا ہوا لیتھو میں چھپا ہے اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے، کتاب کا ترجمہ مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۷۱ھ) نے ۱۲۶۰ھ میں اردو میں کیا وہ لکھتے ہیں کہ "جو حواشی مصنف قدس سرہٗ اور ان کے خلف الرشید علامۂ عصر مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے اس کتاب پر صحیح پائے مزید توضیح و تفسیر فوائد کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی ذیلی فوائد میں مندرج کر دیا" یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں مطبع درخشانی میں اور دوسری بار ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا۔

(ك)

۴۱۔ کشف الغین عن شرح الرباعیتین (فارسی) حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دو رباعیوں کی خواجہ کے قلم سے شرح ہے، اس شرح کی شرح شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی۔

---

[1] شفاء العلیل ص ۱۱۷

(ل)

۴۲۔ لمعات (فارسی) مطبوعہ، علم تصوف سے متعلق ہے۔

(م)

۴۳۔ المقالۃ الوضیّۃ فی النصیحۃ والوصیۃ (فارسی) "وصیت نامہ" کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکا ہے، مطبع مطیع الرحمٰن سے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی شرح کے ساتھ بھی ۱۲۶۸ھ میں دہلی سے شائع ہوا، قاضی صاحب کی تشریحات ان کے مشہور رسالہ ارشاد الطالبین سے ماخوذ ہیں۔

۴۴۔ المقدمۃ السنیۃ فی الانتصار للفرقۃ السُّنّیۃ (عربی) مجدد صاحبؒ کے رسالہ "ردِ روافض" کا ترجمہ مع اضافہ فوائد[1] ہے، ٹونک اور بھوپال کے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، حال میں مولانا ابوالحسن زید صاحب مجددی کے اہتمام میں دہلی سے بھی شائع ہوا ہے۔

۴۵۔ المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ (فارسی) مطبوعہ فتح الرحمٰن کے شروع میں بھی شامل ہے۔

۴۶۔ المسوّی من احادیث المؤطّا (عربی) مؤطا کی عربی شرح دہلی سے دو بار اور مکہ معظمہ سے ایک بار شائع ہوئی۔

۴۷۔ مُصفّٰی (فارسی) مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح ہے جو بڑے فوائد و تحقیقات پر مشتمل ہے، اور شاہ صاحبؒ کی اہم کتابوں میں ہے، جلد اول مطبع فاروقی دہلی اور جلد ثانی مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی۔

۴۸۔ المکتوب المدنی (عربی مطبوعہ) ایک اہم مکتوب وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے تقابل میں جو شیخ اسماعیل بن عبد اللہ رومی کے نام لکھا گیا،

---

[1] شاہ صاحبؒ نے یہ ترجمہ اپنے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کی خواہش اور فرمائش پر ۱۱۴۳ھ میں قیام حجاز کے دوران کیا۔

یہ "التفهيمات الإلٰهية" میں موجود ہے، نیز علیحدہ بھی بعض رسائل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

۴۹۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاری و فضیلت ابن تیمیہؒ (فارسی) مولوی عبدالرؤف صاحب مہتمم کتب خانہ نذیریہ نے شائع کیا، یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، کلمات طیبات کا ایک مکتوب جو امام بخاری کے مناقب میں لکھا تھا، اور ایک مکتوب جو حافظ ابن تیمیہؒ کے دفاع میں لکھا گیا ہے، لے کر جمع کر دیا گیا ہے۔

(ن)

۵۰۔ النبذة الابريزية في اللطيفة العزيزية (فارسی) اس میں شاہ عبدالرحیمؒ کے نانیہالی جد اعلیٰ شیخ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان کے اسلاف و اخلاف کے حالات ہیں، "انفاس العارفینؒ" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل مطبوعہ مطبع احمدی میں بھی شامل ہے۔

۵۱۔ النوادر من أحاديث سيد الأوائل والأواخر (عربی) مطبوعہ مسلسلات کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

(ھ)

۵۲۔ همعات (فارسی) ضخامت ۶۰ صفحے، متوسط سائز، مطبوعہ تحفۂ محمدیہ، دربیان نسبت الی اللہ، تمہید میں کہا گیا ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے دین محمدیؐ کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہ تمام ادیان پر غالب ہوا، تو تہذیب نفوس عرب و عجم اور ان کے درمیان جو مظالم تھے ان کا ازالہ بوجہ اتم وجود میں آیا، اور چونکہ دین محمدیؐ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن، ظاہر کا تعلق صور و مظاہر، تعیین اوقات، اور

اوضاع ومقادیر سے ہے، اور اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، اور تحریف کا سدّباب کیا گیا، باطن کا تعلق طاعات کے انوار و آثار کے حصول سے ہے، اس کا تعلق دو چیزوں سے ہے، ظاہر کے حامل وارثین پیغمبر ہیں، جنھوں نے ظاہر شرع کی حفاظت کی، ان میں فقہاء و محدثین، مجاہدین و قاری داخل ہیں، اور باطن کے حامل (جس کا نام احسان ہے) وہ انوار طاعات، حلاوت کے احساس اور اخلاق فاضلہ سے متخلّق اور احوال سنیہ کے حامل ہیں، (جو صوفیۂ کرام ہیں) ان پر ہر زمانہ میں ان اشغال کا القاء ہوا، جو اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کے مناسب تھے، اور ان کے کلام وصحبت میں اللہ تعالےٰ نے ایک جذب و تاثیر عطا فرمائی اور ان کو کرامات اور نور باطن سے نوازا اور ہر سلسلہ میں مخصوص اشغال و اوراد کا تعین ہوا، اور لوگ ان کی پیروی کر کے فائز المرام ہوئے، ہر زمانہ میں ایک خانوادہ کے وابستگان اپنے خانوادہ کو دوسرے خانوادوں پر ترجیح دیتے ہیں، یہ ایک طرح سے صحیح ہے، بعض پہلوؤں سے امتیاز ہوتا ہے، لیکن حصر صحیح نہیں

پھر شاہ صاحبؒ نے ان خانوادوں اور ان خانوادوں سے نکلنے والی شاخوں اور ان کے بانیوں کا تذکرہ فرمایا، اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان تغیّرات کلیہ کا ذکر کیا ہے جو طریق تصوف میں پیش آئے، اور عہد رسالت کے بعد زمانہ کے تغیّر سے حصولِ احسان کے جو طریقے اور معالجات تجویز کئے گئے ان کا ذکر کیا، اس بارے میں شاہ صاحبؒ نے جس دقیقہ رسی اور تحلیل و تجزیہ سے کام لیا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے، شیخ اکبر اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کے ظہور میں آنے کا بھی ذکر کیا ہے، آپ نے بتایا ہے کہ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ مسلکِ تصوف کے سب سے بڑے مقنّن اور مرتّب ہیں،
پھر ان کے نزدیک اس کے جو شرائط اور بنیادی ارکان ہیں، ان کا ذکر کیا ہے، پھر اپنے اپنے
زمانہ کے جن مجدّدین و مجتہدین نے اپنے زمانہ کی استعداد و مزاج کے مطابق اس کا جو نصاب
و دستور العمل مرتب کیا، اس کی تفصیل کی ہے، پھر شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانہ کے سالک
کے لئے جو نصاب ہونا چاہیئے وہ بیان کیا ہے، اور جن چیزوں کی طرف اس کی توجہ ہونی چاہیئے
اس کو بیان کیا ہے، پھر اس طریق کے موانع اور مضر اسباب کا ذکر کیا ہے، اور ان کا طریقِ
علاج بتایا ہے، اس راہ میں جو منزلیں پیش آتی ہیں، اُن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، پھر
نسبتوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں صحابہؓ و تابعین اور جمہور صالحین کی نسبت کا ذکر
کیا ہے، اور اس کو احسان سے موسوم کیا ہے، پھر اس کی تعریف کی ہے، پھر مختلف انسانوں کی
استعدادات کا ذکر کیا ہے، اور لطائف کو بھی بیان کیا ہے، پوری کتاب دقیق مضامین، لطیف نکات
اور ذاتی تجربات سے اس طرح مملوء ہے جیسے کوئی حاذق اور طویل تجربہ رکھنے والا طبیب
انسانی مزاجوں، اجسام اور صحت و بیماری کے اسباب اور ان کے معالجات پر روشنی
ڈالتا ہے۔

۵۳۔ ہوامع شرح حزب البحر (فارسی) مطبوعہ۔

INDEX

اشاریہ

"تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

ب پ

ت ٹ ث

ج چ

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

آب حیات ۳۵۱
وفیات الأعیان ۲۵۶
ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ۲۶۱
اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین ۱۹۰
آثار الصنادید ۱۲۸
الأحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ ۲۵۵، ۲۵۷
احیاء علوم الدین ۳۲۳، ۳۲۴
اخبار الأخیار ۶۵
الأربعین ۳۹۸
ارجوزۂ اصمعی ۳۵۴
الارشاد الی مہمات علم الاسناد ۱۰۰، ۱۰۵، ۳۴۸
ارشاد الطالبین ۴۱۲
ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ۱۲۵، ۵۵-۲۴۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۹۶، ۳۲۱، ۳۴۱، ۳۶۱، ۳۹۹
اسرار المحبۃ (رسالہ) ۳۸۳
الاسفار الأربعہ ۳۶
اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۳۶۱
اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار (رسالہ) ۱۷۰، ۱۷۶، ۲۱۶
اشراق ہیاکل النور ۳۶
اصول بزدوی ۱۰۰
اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ۴۰۹
اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم ۳۹۹
الأعلام (زرکلی) ۲۳، ۱۱۰
الأفق المبین ۳۶
أنطاف القدس ۱۲۵، ۳۹۹
الامداد فی مآثر الأجداد ۶۶، ۷۳، ۳۹۹، ۴۰۰
الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ۳۹۳، ۳۹۹
انسان العین فی مشائخ الحرمین (رسالہ) ۶۶، ۹۷، ۱۲-۱۰۹، ۱۹۹، ۴۰۰
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۳۱۳
انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ۲۷، ۲۸
الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۰۳، ۴۰۰
انفاس العارفین ۶۶، ۶۷، ۷۷، ۷۸، ۸۰-۸۴، ۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۲۵، ۲۰۱، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۶
الأوائل السنبلیہ فی أوائل کتب الحدیث ۳۳

(ج) (چ)

(ح) (خ)

(ش)

(ص)

مقامات